

# جرم کے بادشاہ کی انتہائی دلچسپ داستان

## وہ اپنے جرم کا ہر ثبوت مسطرتیتا تھا

مبلی قلم

ترجمہ: محمود احمد مودی

### ALCAPONE

# الکپون



”گاڈ فادر“ اور اس طرح کے دوسرے کی مشہور عالم بادل لکھے گئے جن میں افسانہ طرازی کی کم اور حقائق زیادہ تھے۔ ان باتوں اور ان پر بننے والی فلموں نے دنیا میں دھوم مچادی۔ کہتے ہیں، حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ الکپون کی زندگی کی گئی کہانی اس کا ثبوت ہے۔ اس میں کی قسم کی رنگ آمیزی اور داستان طرازی کے بغیر بھی دلچسپی کا اس قدر سامان موجود ہے کہ ہر چار سال بعد اس کی سوانح عمری کا نیا ایڈیشن شائع ہو جاتا ہے۔ اس کی داستان حیات پر کسی ایک مصنف یا حقیقت نگار نے ہی شیخ آزمائی نہیں کی، بلکہ مصنفین اور مولفین نے طویل عرصے کی محنت اور عرق ریزی سے کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ ان صفحات پر شروع کی جانے والی یہ گئی کہانی ان سب کا نچوڑ ہے۔ اس غیر معمولی شخص کی زندگی پر کی کہیں بھی بن چکی ہیں اور کئی فلموں کی کہانیاں اسی کی ذات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں لیکن بڑا حد تک اس کی فلم میں الکپون جیسے شخص کی زندگی کو سمونا نظر نہ آتا ہے۔



باہر آتے اور ادھر ادھر آوارہ گردی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ قبیح خانوں اور شراب خانوں کے علاوہ یہاں جسم گونے، یعنی جسم پر ٹیوٹا بنانے کی دکانیں تھیں۔ پرانی چیزیں فروخت کرنے اور رہن رکھنے کی دکانیں تھیں۔ عادی طور پر گھوڑے کھڑے کرنے کے لئے اسٹبل تھے۔ چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل ایسی عمارتیں تھیں، جن میں روزانہ، ہفتہ وار اور ماہانہ بنیادوں پر کمرے کرائے پر دیئے جاتے تھے۔ جیب جتنی اجازت دے، اتنی مدت کے لئے کمرہ کیجئے اور جوں چاہے کیجئے۔ ان کمروں کو گرم رکھنے کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ شرفاء ان کمروں میں کمی ہی پائے جاتے تھے۔

اطالوی اس علاقے میں بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے لیکن اتفاق سے جس طرف کیون فلیمنی رہتی تھی، ادھر اطالوی نہ ہونے کے برابر تھے۔ الکپون کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد ہی گبریل کو اپنی دکان کے اوپر ہی ایک اپارٹمنٹ مل گیا اور وہ اپنی بیوی، بچوں کو لے کر وہاں منتقل ہو گیا۔ پارک ایونیو کے علاقے میں جا کر گبریل اپنے ہم وطنوں سے اور بھی دور ہو گیا۔

کرائے کا بوجھ کم کرنے کے لئے اس نے اپارٹمنٹ میں دو دو بمبلی کرائے دار بھی رکھ لئے تھے۔ ان میں سے ایک تو اس کا ہم پیش اور نائب تھا جو اس کی دکان میں ”کارنگر“ کے طور پر کام کرتا تھا۔ دوسرا اطالوی ہی تھا۔ وہ نانیائلی سے آیا تھا۔ پیسے کے اعتبار سے وہ سزا سزا تھا اور کسی گروپ میں شامل تھا۔ وہ بچپن سے ہی جابجا تھا۔

اس علاقے میں ہر ملک اور قوم کے باشندے آباد تھے۔ جرمن، چینی، ہسپانوی، سویڈ، بھی پائے جاتے تھے۔ الکپون نے اپنی زندگی کے ابتدائی چھ سات برس، یعنی بچپن اسی علاقے میں گزارا۔ گویا ہوش سنبھالنے ہی اس نے اپنے ارد گرد کو دیکھا۔ ہاں یہ نفسیات کہتے ہیں کہ جو لوگ ایسے علاقوں میں پرورش پاتے ہیں جہاں انہیں اپنے ارد گرد غیر ملکی چہرے نظر آتے ہیں، وہ اپنے آپ کو اس ملک میں انہیں محسوس کرتے ہیں۔ زندگی بھر انہیں یہی احساس رہتا ہے کہ وہ غیر ملکیوں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ اس سرزمین سے ان کا رشتہ گہرا نہیں ہو پاتا۔ الکپون کو جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنانے میں شاید اس احساس نے بھی کوئی کردار ادا کیا ہو جس کی جڑیں اس کے بچپن کے دور میں بیوس تھیں۔

1881ء سے 1911ء کے درمیان جو اطالوی، امریکا آ کر آباد ہوئے ان میں سے بیشتر کیون فلیمنی ہی کی طرح افلاس زدہ علاقوں سے آئے تھے۔ وہ علاقے صرف معاشی طور پر ہی تباہ حالی کا شکار نہیں تھے بلکہ وہاں اور بھی طرح طرح کی شورشیں برپا تھیں۔ کسی قسم کا سیاسی استحکام نہیں تھا۔ امن و امان کی حالت تباہ تھی۔ حکومت نظری نہیں آتی تھی۔ خصوصاً جنوبی اٹلی اور سسلی کا تو بہت ہی برا حال تھا۔

وہاں کے لوگوں نے اکثر چھاپے، گرفتاریاں اور بدامنی ہی دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے اکثر اپنے ہاں غیر ملکیوں کو بلیا کر کرتے دیکھا تھا اور وہ انہیں ہی اپنے اکثر مسائل اور مصائب کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ان میں یونانی، عرب، رومن، ہسپانوی، فرانسیسی اور نارمنڈی وغیرہ کے باشندے شامل تھے۔ اطالویوں نے ان کے ہاتھوں ہمیشہ تکلیفیں ہی اٹھائی تھیں۔ چنانچہ غیر ملکیوں سے نفرت گویا ان کے کچلے ہوئے اور بد نصیب لوگوں کے خون میں شامل ہوئی تھی۔

انہیں اپنی تاریخ سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور انہیں اپنے ثقافتی اٹالے کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں تھا۔ اپنے ملک کے مشہور عالم مصور اور مجسمہ ساز، انجیل اسٹیلو اور مونا لیزا جیسی شہرہ آفاق تصویر کے خالق لیوناردو دینچی کے بارے میں بھی ان تارکین وطن نے اپنے ملک میں کچھ نہیں سنا تھا، جو کچھ بھی سنا وہ امریکا آ کر سنا۔

وہ لوگس کا مجسمہ دیکھتے تھے تو وہ بھی انہیں کوئی غیر ملکی قاصد لگتا تھا۔ ان کے نزدیک تاریخ کس نظم اور انصافوں سے لبریز ایک کہانی تھی۔ بروکین میں رہنے والا ایک تارک وطن اپنے بچپن کو سولہ اور پہلانے کے لئے یوں کہانی سنانا شروع کرتا تھا۔ ”کوئی زمانہ جب سسلی میں بہت ساری زرعی زمین، حسن باغات اور جاگیریں تھیں۔ لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ طرح طرح کے پھلوں، پھولوں اور اناج کی فصلیں اُگاتے تھے۔ پھر ایک غیر ملکی قاصد جنگجو آیا جو اپنے آپ کو پندین کہتا تھا۔ اور پھر سب کچھ تباہ ہو گیا۔“

یہاں آ کر تارکین وطن کے لئے گویا کہانی ختم ہو جاتی تھی بلکہ کہانی کیا، ان کے نزدیک گویا کل تاریخ بھی تھی۔ اس سے پہلے، یعنی 1700ء اور 1800ء کے درمیان اٹلی کا نقشہ کچھ ایسا تھا جیسے لوگوں کے کسی بکرے کو ذبح کر کے اس کے صے بخرے کر لئے ہوں۔ ناچنے ہسپانویوں کے ایک قبیلے کے پاس تھیں تو دھڑکا کچھ حصہ دوسرے قبیلے کے پاس۔ کدھے آسٹریا کے قبضے میں تھے اور دیرمائی صے پر پوپ کا قبضہ تھا۔

اطالویوں کی اپنی حکومت ملک کے بہت کم صے پر تھی۔ اٹلی کو اگر کچھ عرصے کیلئے متحد کیا۔ تو وہ بھی غیر ملکی قاصدوں نے ہی آ کر کیا اور خود ہی بڑے بڑے عہدے سنبھال لئے۔ یہ مٹھکے خیز اور خداترلو کی جنگ کے بعد ختم ہوا تو آسٹریا والوں نے اٹلی کو بدستور سیاسی غلطکاری حالت میں چھوڑ دیا۔ مختصر ایں کہا جا سکتا ہے کہ اٹلی پر خود اطالویوں کو راج کرنے کا موقع کم ہی ملا۔ بہت بعد میں جا کر روم میں قائم ہونے والی حکومت بھی انہیں اپنی نہیں لگتی تھی کیونکہ اس نے ملک کے دوسرے حصوں میں بسنے والے لوگوں کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ بدستور غربت، بھارت اور بدامنی کے جنم میں زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی شنوائی کہیں بھی نہیں تھی اور انہیں بھی غیر سمجھتے تھے۔

شاید اس پس منظر کی وجہ سے بیشتر اطالویوں اور خاص طور پر سسلی کے باشندوں کی یہ فطرت سی بن گئی تھی کہ وہ بھی کو غیر سامحوں کرتے تھے، کیلئے بھی اپنے دل میں انایت محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بھی اپنا محسوس نہیں کرتے تھے۔ کسی پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔

یہ احساس شاید کسن الکپون کو بھی اپنے والدین سے ورے میں ملا تھا۔ ویسے بھی اس نے تو آنکھ ہی ایسے ماحول میں کھولی تھی جہاں اسے چاروں طرف ”غیر“ ہی غیر نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھ وہ وطن، زبان یا مذہبی عقیدے کی بنیاد پر کوئی چیز نہیں دیتا تھا۔ کسی سے محبت نہیں کرتا تھا۔ لیکن

جلد از جلد جو کام مل جاتا تھا، وہی شروع کر دیتے تھے۔ بے ہنری معمولی ہنر جاننے والے اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے زندگی اس وقت بھی کھلی تھی۔ ہجرت اسے اور کھلی بنا دیتی تھی۔

اطالوی تارکین وطن کو کام خود اپنی کوششوں سے بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے لئے بھی انہیں ٹھیکیدار کی خدمات حاصل کرنا پڑتی تھیں۔ یہ ٹھیکیدار انہیں ”کم سے کم اجرت اور زیادہ سے زیادہ مشقت“ کے اصول کے تحت مختلف جگہوں پر رکھتا تھا جہاں کام چل رہا ہوتا تھا اور مزدوروں کی ضرورت ہوتی تھی۔

یہ ٹھیکیدار خود بھی نگراں، سپروائزر یا فونمین کے طور پر ایسی ہی کسی جگہ پر کام کر رہا ہوتا تھا۔ وہ جسے بھی کام دلاتا تھا، اس سے پتہ میں ایک دن کی ضروری نذرانے یا ٹیکسٹ کے طور پر مستقل وصول کرتا تھا۔ ہر کارکن سٹیج کی شام کو اپنی اس روز کی مزدوری، جو عموماً ایک ڈالروں تھی، اسکی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر کی صبح سے ایک عدد مرغی لے کر فونمین کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا، جب اسے اپنے پتے کے لئے کام شروع کرنے کا موقع ملتا تھا۔ مرغی نہ لے کر آنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ وہ کارکن یا مزدور اپنے آپ کو اس پتے کے لئے فارغ سمجھے۔ انہیں کم پر لا کر ادھر بھجوانے والے مزدوروں کی اجرت دوسروں کے مقابلے میں بہتر تھی۔ انہیں دس گھنٹے کام کرنے کے ذریعہ ڈالر ملتے تھے۔

رقم نہ ہونے کی وجہ سے گبریل اپنی ذاتی دکان کھولنے سے قاصر تھا اور کسی دوسرے کی دکان پر کام کر کے اس کے لئے اپنی بڑھتی ہوئی فلیمنی کا پیٹ پالنا بہت ہی مشکل تھا کیونکہ اس زمانے میں ہال کاٹنے یا شیو بنانے کا معاوضہ صرف ایک نکل ملتا تھا جو اس زمانے کا سب سے چھوٹا، یعنی سب سے کم مالیت کا شے تھا۔

آمدنی نہایت کم ہونے کی وجہ سے تارکین وطن رہنے کے لئے بھی کوئی ڈھنگ کی جگہ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ چار ڈالر ماہانہ پر کسی عمارت میں چھوٹے چھوٹے دو کمرے مل جاتے تھے جن میں ٹیس اور بجلی نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی انہیں گرم رکھنے کا کوئی انتظام ہوتا تھا۔ مٹی کے تن کے جس چوہے پر کھانا پکایا جاتا تھا، وہی اس کمرے کو گرم رکھنے کا ایک ذریعہ ہوتا تھا۔ دوسرے کمرے کو گرم رکھنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس طبقے کے لوگ کھانا پکانے یا کمرے گرم رکھنے کیلئے کوئلہ جلانے کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے تھے حالانکہ کوئلے کی سو پوڑی پوری ان دنوں صرف 35 سینٹ میں ملتی تھی۔ اس کے باوجود کوئلہ استعمال کرنا گویا ایک طرح کی عیاشی تھی۔ ان دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ایک شخص نے بہت عرصہ پہلے بتایا تھا ”سردیوں میں ہمارے کمرے، باہر کھلی ہوا کے مقابلے میں ذرا ہی گرم ہوتے تھے۔ جس کمرے کو گرم رکھنے کیلئے پائل کی کوئی بندوبست نہیں ہوتا تھا، اس سے فریج کا کام لیا جا سکتا تھا۔ اس میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں جو کئی دن تک محفوظ رہ سکتی تھیں۔“

ان دنوں بارہ فٹ لمبے اور دس فٹ چوڑے ایک ایک کمرے میں بیس بیس افراد پر مشتمل ٹھیلے بھی رہتی تھیں۔ ایسے کمروں میں عام طور پر کسی قسم کا فرنیچر نظر نہیں آتا تھا۔ بہت ہوا تو دو بیڈ یا چار پائیاں ہوتی تھیں، ان کے سوا فرنیچر نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔

گبریل کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اتنے زیادہ برے حالات کا شکار نہیں ہوا۔ ایک تو اس کی فلیمنی مختصر تھی۔ دوسرے اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک مزدوری حیثیت سے دیکھ نہیں کھاتے پڑے۔ اس کے پاس اپنے اصل بھرتے کے علاوہ بھی ایک بھرتیا اہلیت موجود تھی۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ صرف اٹلی میں ہی نہیں، امریکا میں بھی ان پڑھ لوگ۔ جس جہام کے پاس پال کھوانے یا شیو بنانے جاتے تھے، اس سے یہ توقع بھی رکھتے تھے کہ وہ انہیں، ان کے نام آنے والے خط بھی پڑھ کر سنا دے گا۔

اپنی اس ”قابلیت“ کی بنیاد پر گبریل کو ایک گمروری اسٹور میں ذرا بہتر ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت کے دوران اس نے کفایت شعاری۔ بلکہ کجی سے کام لیتے ہوئے اتنی رقم جمع کر لی کہ باربر کے طور پر کام کرنے کے لئے اپنی دکان کھول سکے۔ اس مقصد کے لئے اس نے پارک ایونیو کے مقام پر ایک غریبانی عمارت میں چھوٹی سی دکان لے لی۔

گبریل نے جہام کے طور پر کام شروع کر دیا۔ گز رہر ہونے لگی۔ اس کے ہاں دوسرے اور پھر تیسرے بچے کی آمد ہوئی۔ وہ دونوں میاں بیوی اپنے بچوں کے نام تو اطالوی ہی رکھ رہے تھے لیکن وہ تھوڑی بہت تہرلی کے بعد خود بہر خود امریکی ہوتے جا رہے تھے۔ مثلاً ان کا پہلا بیٹا جو 1891ء میں گبریل کی شادی کے بعد اٹلی میں ہی پیدا ہوا تھا، اس کا نام ونزو تھا لیکن امریکا آنے کے بعد وہ بھی کھلائے لگا تھا۔

1893ء میں وہ لوگ امریکا آئے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ان کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کا نام رافیلو رکھا تھا مگر وہ رالف کھلاتا تھا۔ پھر 1895ء میں ان کے ہاں تیسرا بیٹا پیدا ہوا۔ انہوں نے اس کا نام سلواڈور رکھا مگر وہ فرینک کے نام سے جانا گیا۔

پھر 17 جنوری 1899ء کو، مٹگل کے روز جبکہ موسم زیادہ سرد نہیں تھا، فرینا نے اپنے چوتھے بچے کو جنم دیا۔ اس کا نام انہوں نے الفانسو رکھا۔ کیونکہ ان کا خاندانی نام تھا۔ یوں اس کا پورا نام الفانسو کیون ہو گیا مگر بعد میں الفانسو مختصر ہو کر صرف ”ل“ رہ گیا اور اسے صرف اسی نام سے پکارا جانے لگا۔ اگر بھی اسے پورے نام سے مخاطب کرنے کی ضرورت پیش آتی تو کہا جاتا۔

7 فروری کو فرینا اسے چشمہ دلوانے چے لے گئی۔ صوفیہ نامی ایک خاتون، رسم کے مطابق بچے کی سر پرست بن کر ان کے مرہرہ گئی۔ اس موقع پر سر پرست بن کر ساتھ جانے والی عورت کو گاڈ مادر اور مرد کو گاڈ فادر کہا جاتا ہے۔ اس بچے پر زندگی بھر کیلئے اس عورت اور مرد کا احترام لازم ہو جاتا ہے۔

فرینا ایک ٹیک، سیدی سادی اور گریڈ عورت تھی۔ چرچ کے سردار خاٹے میں اپنے بچے کو پادری سے چشمہ دلوانے کی مذہبی رسم کی ادائیگی کے بعد اس نے کچھ پر عبادت کی پھر بڑی رقت قلب اور عاجزی سے دعا مانگی کہ گاڈ اس کے بچے کو ایک ٹیک اور کا میاب انسان بنائے۔

جب الکپون پیدا ہوا، ان دنوں اس کے والدین نیوی اسٹریٹ کی ایک عمارت میں رہ رہے تھے۔ یہ گلی ”نیویارک نیول شپ یارڈ“ سے تقریباً پانچ فرلاک کے فاصلے پر تھی جسے قدرے تبدیلی کے ساتھ ”بروکلین نیول یارڈ“ کہا جاتا تھا۔

صرف نیول یارڈ ہی نہیں بلکہ اسکے پاس کی تمام گلیاں وغیرہ نیوی کی کے علاقے میں مشہور ہوتی تھیں اور یہ کوئی اچھا علاقہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ سستے شراب خانے، اور ان سے بھی سستے، جسم فروشی کے اڈے یہاں موجود تھے۔ راتوں کو اکثر نیوی کے ملاں شراب خانوں سے لڑکھڑاتے

گبریل کیون نے جب اٹلی سے امریکا کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا تو اسکے ملک کے حالات بھی خراب تھے اور خود اسکے اپنے حالات نے بھی اسے پریشان کیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے، برے حالات ہی انسان کو ہجرت پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر حالات اچھے ہوں تو کون اپنا گھر یا اور اپنا وطن چھوڑے؟

گبریل کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ ابھی وہ نوجوان ہی تھا، اٹھائیس سال کا تھا۔ اس کی بیوی فرینا صرف 23 سال کی تھی۔ ان کا ایک سال کا ایک بیٹا تھا اور ان کے ہاں دوسرے بچے کی آمد متوقع تھی۔ ان کا گاڈ اٹلی کے شہر ٹیولز سے سولہ میل کے فاصلے پر تھا جسے وہ خبر یاد کیجئے لگے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے اپنے ملک کے حالات تو خراب ہیں ہی۔ لیکن جہاں وہ جا رہے ہیں وہاں بھی ایک ہی بدامعاشی بھران آنے والا ہے۔ ظاہر ہے، آنے والے کل کا تو کسی کو پتہ نہیں ہوتا لیکن ان کے خیال میں ان کے اپنے ملک سے زیادہ خراب حالات تو کہیں کے ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

وہ 1893ء کا زمانہ تھا اور امریکا میں وہ معاشی بھران آنے والا تھا جس نے کئی سال تک ملک کو جھڑپوں کی حالت میں رکھا۔ گبریل اور اس کی بیوی فرینا نے اپنا گاڈ چھوڑا اور جرجی جہاں میں بیٹھ کر نیویارک آ گئے۔ گبریل نے ٹھنڈی سی بیک کر رہنے کے لئے بروکلین کے علاقے کا انتخاب کیا۔ اس نے ملبری بیٹنڈ کارخ کرنے کی کوشش نہیں کی جو بین کاز بیری کے علاقہ تھا۔ وہاں اطالوی تارکین وطن بڑی تعداد میں آباد تھے۔ اس لئے غیر ملکی طور پر اسے اٹالین کالونی ہی کا نام دے دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے، جن علاقوں میں دوسرے ممالک سے آ کر وہ تارکین وطن آباد ہوتے ہیں جن کے مالی حالات ابتر ہوتے ہیں اور جو معاشرے کے ذریعہ بہتر طبقوں سے تعلق نہیں رکھتے، ان علاقوں کا حال باقی شہر کے مقابلے میں برا ہی ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے گبریل نے گویا ٹھنڈی ہی کی تھی کہ اس علاقے کا رخ نہیں کیا تھا جہاں اس کے ہم وطن اکثریت میں تھے۔

تاہم معاشی بھران تو پورے ملک میں ہی آ رہا تھا۔ بروکلین کا علاقہ بھی اس سے بچ تو نہیں سکتا تھا۔ کام کرنے والے لوگوں میں سے جلد ہی کم از کم ایک چوتھائی تو بے کار اور بے روزگار ہو گئے۔ اچھے بھلے ہنرمندوں کو ملازمین ملنا محال ہو گیا تھا۔ بے ہزاروں پڑھ لوگوں کا تو ذکر ہی کیا! جبکہ اٹلی سے ہجرت کر کے آنے والوں میں سے تو اکثریت بے ہزاروں پڑھ لوگوں کی تھی۔ انہیں اچھی ملازمین ملنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

ویسے تو دنیا بھر میں صنعتی قریح کا آغاز ہو رہا تھا لیکن وہ بچارے جن علاقوں سے آئے تھے وہاں انہوں نے کارخانوں اور فیکٹریوں کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ان میں سے تقریباً 97 فیصد بدلتان اور معمولی درجے کے کاشتکار تھے۔

یہ سوال خاصا دلچسپ محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ لوگ بدلتان اور کاشت کار تھے، کھیتی باڑی جانتے تھے تو ایسے علاقوں کا رخ کیوں نہیں کرتے تھے جہاں زرعی زمینیں موجود تھیں اور کھیتی باڑی ہوتی تھی؟ وہاں انہیں کام ملنے کا زیادہ امکان تھا۔

اس سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ زیادہ تر انسان جو زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، وہ اس سے بیزار ہوتے ہیں۔ گاڈ دیہات میں رہنے والے بڑے شہروں کی طرف رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہاں رہنے والا ہر انسان بڑے عرصے کی زندگی بسر کر رہا ہے، اسے ہر طرح کی آسائشیں اور تفریبات حاصل ہیں جبکہ بڑے شہروں میں رہنے والے افراد کی اکثریت اپنی زندگی سے بیزار ہوتی ہے۔ شہروں کے جمیلوں، روزمرہ زندگی کی ماراماری اور مسائل کی وجہ سے وہ اپنے روز و شب کو کچھ زیادہ پر کشش محسوس نہیں کرتے۔ یہ صورت حال آج کے دور میں پیدا نہیں ہوئی جب بڑے شہروں کی آبادیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور مسائل کا کافی پڑ گئے ہیں۔ بلکہ یہ صورت حال بہت پرانے وقتوں سے چلی آ رہی ہے کیونکہ اپنے وقت کے حساب سے بڑے شہر ہمیشہ ہی پرہجوم اور وہاں کی زندگی ہنگامہ خیز بھی جاتی رہی ہے۔ وہاں کے لوگ عام طور پر گاڈ دیہات اور خاص طور پر پچاڑی مقامات کی طرف رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہاں زندگی کئی برسوں اور ہنگاموں سے پاک ہے۔

دوسری طرف گاڈ دیہات والے جب شہری زندگی پر رشک کرتے ہیں اور ہجرت کا فیصلہ کرتے ہیں تو وہ یہ فیصلہ بھی کر لیتے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنا طرز زندگی ترک کرنا ہے، اب انہیں ”شہری“ بننا ہے۔ اگر کھیتی باڑی اور کاشت کاری ہی کرنی ہو تو پھر شہر جانے کا کیا فائدہ؟ اسی پس منظر اور اسی لگائی کی کیفیت کے ساتھ گبریل بھی شہر آیا تھا۔

اسکے پاس شہر کا رخ کرنے کا ایک اور جواز بھی تھا۔ اسے ایک ایسا بھڑا آ تھا جو گاڈ کے ساتھ ساتھ شہر میں بھی کام دے گا۔ دراصل وہ پیسے کے اعتبار سے حجام تھا۔ اس کے خیال میں یہ پیشہ گاڈ سے زیادہ شہر میں فائدہ مند تھا۔ اس زمانے میں لوگ حجام یا ناٹکی کے پاس صرف بال کٹوانے یا شیو بنوانے ہی نہیں جاتے تھے بلکہ جو کس گھوانے اور چھوٹی موٹی جراحی کرانے بھی جاتے تھے۔

جو کس گھوانے اور خون چسوانے کو اس زمانے میں..... اور بعض علاقوں میں ابھی تک، بہت سے امراض کا علاج سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں جو کس گھوانے یا فاسد خون چوس لیتی ہیں تو اسکے ساتھ ہی کئی امراض بھی جسم سے نکل جاتے ہیں۔ حجام نہ صرف جو کس لگاتے تھے بلکہ چیر پھاڑ اور مرہم پٹی کے ایسے کام بھی کرتے تھے جنہیں آج کل ”مانسز جری“ کہا جاتا ہے اور ان کے لئے بھی ایسے خاصے سرجنری خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ گبریل جس زمانے میں اٹلی سے امریکا آیا، اس وقت تو دانت لگانے کا کام بھی حجام کرتے تھے اور اس کے لئے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جانے کا کوئی تصور نہیں تھا کیونکہ الگ اور خاص طور پر دانتوں کے ڈاکٹر تھے ہی نہیں۔

تاہم گبریل لاچ نما بھری جہاز سے اترتے ہی اپنا کام شروع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کوئی دکان کھولنے یا کوئی کاروبار کھانڈ بنانے کے لئے اس کے پاس تو رقم نہیں تھی۔ ان دنوں اٹلی سے امریکا کی طرف ہجرت کر کے آنے والوں کیلئے امریکی حکومت کی طرف سے صرف یہ پابندی عائد تھی کہ ان کے پاس کم از کم ستر ڈالروں موجود ہونے چاہئیں۔ ایک فلیمنی ستر ڈالروں امریکا میں دس بارہ روز گزار سکتی تھی۔

اسے کم بیسوں کی وجہ سے بھی بعض لوگ کھیتی باڑی کا ارادہ رکھنے کے باوجود کوئی علاقوں تک کا سفر کرنے اور وہاں کا ماحول نہ دیکھنے کی ہمت ہی نہیں کر پاتے تھے۔ وہ سلاطین پر اترتے ہی کام ڈھونڈنا شروع کر دیتے تھے کیونکہ زیادہ تر لوگوں کی جیب میں دس بارہ دن ہی گزارا کرنے کے لائق رقم ہوتی تھی۔ وہ ادھر ادھر بھٹکنے کا خطرہ مول ہی نہیں لیتے تھے اور



## جرائم کے بادشاہ کو انتہائی دلچسپے استاذ

### وہ اپنے جبرم کا ہر ثبوت سے مستاد تھا



بنیادوں پر کسی بے نفرت بھی نہیں کرتا تھا۔ اسکے اپنے مقادرات، نظریات اور اپنے اصول تھے لیکن ایک قدرے عجیب بات یہ تھی کہ مجموعی طور پر وہ ایک سنگدل، سفاک اور بے حس انسان نظر آنے کے باوجود محض انسانی بنیادوں پر کسی کیلئے بہت مہربان اور مشتاق بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ان عوامل نے اس کی "کامیابیوں" میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔

☆ ☆ ☆

25 مئی 1906ء کو کیریل نے مقامی حکام کو امریکا کی شہریت کیلئے درخواست دی جس میں اس نے اس وقت کے قانونی تقاضوں کے مطابق اٹلی کی حکومت اور وہاں کے بادشاہ سے اعلان لاءتعلق کیا۔ تھا لکپون اور اس کے دوسرے بھائی جو امریکا میں پیدا ہوئے تھے، انہیں خود بخود ہی امریکی شہریت مل چکی تھی۔

ٹریا کے ہاں دو بیٹے اور پیدا ہوئے تھے۔ 1901ء میں ارمینو پیدا ہوا تھا جسے امریکا میں جون عرف میسی کے نام سے پکارا گیا۔ اس کے بعد پیدا ہونے والے بیٹے کا نام والدین نے البرٹو رکھا تھا لیکن اسے ہمیشہ البرٹ کے نام سے پکارا جاتا رہا۔

1907ء تک اس کنبے کے افراد کی تعداد آٹھ ہو چکی تھی۔ ہونی تو نو چاہئے تھی لیکن کیریل کا ایک بیٹا بھی اس دوران گھر سے بھاگ گیا تھا۔ برسوں تک اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ والدین اور بھائیوں سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہوا لیکن پھر ایک روز وہ بالکل غبی انداز میں لوٹ آیا۔ اس وقت تک وہ نہ صرف جوان ہو چکا تھا بلکہ تیرا کام میں تعلیم حاصل کر کے وکیل بن چکا تھا۔

پارک ایوینو میں مختلف ملکوں اور قوموں کے لوگوں کی بھجوری سی بچی ہوئی تھی۔ بہر حال بال کٹوانے، شیو بخوانے یا داڑھی کی کاٹ چھانٹ کرانے کی ضرورت تو سچی کو پڑتی ہے۔ چنانچہ اس علاقے میں کیریل کا کام اچھا چل نکلا تھا۔ تاہم ٹریا جو ابھی تک انگریزی بہتر طور پر نہیں سیکھ پائی تھی، کسی ایسے علاقے میں رہنے کی خواہش رکھتی تھی جہاں زیادہ تر اطالوی ہی آباد ہوں۔

1907ء میں ان کے مالی حالات بہتر ہوئے تو وہ بروکلین کے علاقے میں ایک بہتر گھر میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آکر ٹریا کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی کہ وہ اطالویوں کے درمیان رہے۔ یہ علاقہ اطالویوں کی اکثریت کی وجہ سے "اطالی" کہلاتا تھا۔ قریب ہی آئرش لوگوں کی آبادی تھی جو "ریڈیک" کہلاتی تھی۔

وہ لوگ یہاں منتقل ہوئے تو کسٹن لکپون کو اسکول بھی بدلنا پڑا۔ پہلے وہ "جون بے" اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ یہاں آکر اسے "ولیم ہلز" اسکول میں داخلہ لینا پڑا۔ چھپنے کرڈینک وہ اوسط درجے کا طالب علم رہا اور عموماً بی گریڈ میں پاس ہوتا رہا لیکن اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک ذہین لڑکا تھا کیونکہ وہ پڑھائی کو اتنا دقت بھی نہیں دیتا تھا کہ بی گریڈ میں پاس ہو سکتا۔ اس کی زیادہ توجہ ہمیشہ غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف رہتی تھی۔ کھیل کود کا اسے کافی شوق تھا۔

آخر کار اس کی بے شوقی اذیت پڑھائی پر اثر انداز ہونے لگا۔ ایک ٹرم ایسی بھی آئی جس میں اس کی صرف تیس حاضریاں تھیں جبکہ قواعد کے مطابق اس کی نوے حاضریاں ہونی چاہئے تھیں۔ اس ٹرم کا امتحان دینے پر وہ ریاضی اور گرامر میں فیل ہو گیا۔ اسے اس ٹرم کا امتحان دوبارہ دینا تھا لیکن اس کی نوبت نہیں آ سکی۔

ہوا یوں کہ ایک روز اس کے منچر نے اس کی بے قاعدگیوں پر اسے خوب لڑا۔ لکپون کی عمر اس وقت صرف چودہ سال تھی لیکن قد کاٹھ اس نے خوب نکال لیا تھا۔ اس کسنی میں ہی اس پر شدید غصے کے دورے پڑتے تھے اور کبھی کبھی وہ آپ سے باہر ہو جاتا تھا۔ اس عمر میں ہی اس کا قد پانچ فٹ سات انچ ہو چکا تھا اور وہ خوب ٹھنڈا کھائی دیتا تھا۔

منچر جب لکپون پر زیادہ ہی گرجنے پر بسنے لگا تو لکپون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ منچر نے کوئی ایسا لفظ بولا کہ ضبط کا دامن لکپون کے ہاتھ سے بالکل ہی چھوٹ گیا۔ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور دوسرے ہی لمحے ایسا زوردار گھونسا منچر کے جڑے پر پڑا کہ وہ الٹ کر پیچھے جا گرا۔ توہین، ذلت کا احساس اور تکلیف تو اپنی جگہ تھی لیکن اس کی اس حرکت پر منچر سخت حیرت زدہ بھی رہ گیا۔ ابھی ایسا زمانہ نہیں آیا تھا کہ شاگرد، استادوں پر ہاتھ اٹھانے لگتے۔ اور وہ بھی اتنا کم عمر شاگرد!

اس سے پہلے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ منچر جب سنہلے میں کامیاب ہوا تو اس نے جا کر پرنسپل کو اس واقعے سے آگاہ کیا۔ لکپون کو پرنسپل نے اپنے کمرے میں طلب کیا اور اس کے ہاتھوں پر چند بید رسید کئے گئے۔

بس۔۔۔ وہ اسکول میں لکپون کا آخری دن تھا! اس کے بعد وہ کبھی اسکول گیا ہی نہیں۔

کیریل کیون کے بیٹوں میں اسکول جانے کی روایت پر دان چڑھ ہی نہیں سکتی تھی۔ لکپون کا بڑا بھائی فرینک تو کھینے کرڈینک بھی نہیں بچنے پایا تھا۔ اس نے اس سے پہلے ہی اسکول چھوڑ دیا تھا۔ کیریل کا صرف آخری بیٹا جو 1908ء میں پیدا ہوا تھا اور جسے منچر کے نام سے پکارا جاتا تھا، ہائی اسکول تک پہنچنے اور وہاں کی تعلیم مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔

والدین نے لکپون کو دوبارہ اسکول بھیجے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر انہوں نے صبر کر لیا۔ لکپون اپنے والد کے ساتھ علاقے کے پول ہال میں اسنوکر اور بلیئر وغیرہ کھیلنے کے لئے جانے لگا۔

کیریل کا کام اب اور اچھا چل رہا تھا۔ اس نے دو تین ملازم رکھ لئے تھے۔ وہ اب کبھی کبھار شام کو تفریح کا مقمل ہو سکتا تھا۔ پاس پڑوس کے کچھ ہم پیر لوگ اس کے دوست بھی بن گئے تھے۔ اس علاقے میں زیادہ تر جام اطالوی ہی تھے۔ اطالویوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اچھے جام سمجھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بالوں کو مگھی سے تراشنے کا وصف ان میں قدرت کی طرف سے موجود تھا۔

لکپون اپنے باپ کے ساتھ اسنوکر وغیرہ خوب اچھی طرح کھیل لیتا

تھا۔ وہ چار دیواری کے اندر کھیلے جانے والے اس قسم کے کھیلوں میں ہی ماہر

نہیں تھا، بیس بال بھی بہت عمدہ کھیل لیتا تھا۔ اس کا قد کاٹھ بھی اس قسم کے کھیلوں کیلئے موزوں تھا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں اس کا قد چھ فٹ کے قریب ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ نہیں تھا کہ وہ بیس بال کا پیشہ ور کھلاڑی بن جاتا لیکن اس معاملے میں بھی اس کی مشقت مزاحیہ رکاوٹ بن گئی تھی۔ جلد اشتعال میں آ جانا اور دوسروں سے لڑ بیٹھنا اس کی عادت تھی۔ بہر حال اپنی ابتدائی عملی زندگی میں اس نے کچھ ایسے کام بھی کئے جن میں اچھا قد کاٹھ اور مضبوط جسم کام آتا تھا۔ وہ "بال روم ڈانسر" اور "بار روم ڈانسر" بھی رہا۔

بال روم اس دور کی رقص گاؤں تھیں جہاں رقص کے شائقین جمع ہوتے تھے۔ عموماً ان میں داخلے کے لئے ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ یہ ٹکٹ کلبوں کی ابتدائی شکل تھی۔ جن لوگوں کے ساتھ رقص کرنے کے لئے ساتھی یا پارٹنر نہیں ہوتا تھا، انہیں بال روم کی طرف سے ہم رقص فراہم کیا جاتا تھا جو مرد بھی ہو سکتا تھا اور عورت بھی۔ اکیلی آنے والی عورت کو مرد ہم رقص فراہم کیا جاتا تھا اور مرد کو خاتون ہم رقص۔

ظاہر ہے اس مقصد کیلئے دونوں ہی کا اچھی شخصیت کا مالک ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ عورت حتی الامکان خوبصورت اور اسارت ہوئی تھی جبکہ مرد صحت مند، وجہہ اور دراز قد۔۔۔۔۔ لکپون اس پیلانے پر پورا اترتا تھا اس لئے وہ کچھ عرصہ بال روم ڈانسر کے طور پر کام کرتا رہا۔ یہ کام اپنی جگہ پر لطف بھی تھا اور معاوضہ الگ ملتا تھا۔

"بار روم ڈانسر" والی ملازمت البتہ ذرا ناخوشگوار اور مشکل تھی لیکن لکپون کی شخصیت اور مزاج اس کے لئے بھی بے حد موزوں ہوتا تھا۔ باؤنڈریز داخل وہ شخص ہوتا تھا جو شراب خانے میں نشے میں دھت ہو کر اتنی سیدھی حرکتیں یا ہنگامہ کرنے والوں کا ہا پر پھینک دیتا تھا۔ پارکا مالک صرف اسی مقصد کے لئے اسے ملازم رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اس کیلئے اس شخص کا بارعب، بخڑا، مضبوط اور با حوصلہ ہونا ضروری تھا۔ لکپون میں یہ تمام صفات موجود تھیں۔ اس زمانے میں پارکنگ کے عالمی نمپین جم جیفری کا قد صرف پانچ فٹ آٹھ انچ اور وزن محض 175 پونڈ تھا۔

اس قسم کی ملازمتوں کے علاوہ لکپون نے کچھ شرفیافت ملازمتیں بھی کیں۔ وہ ایک کینڈی اسٹور میں کاؤنٹر پر بیٹھ کر بیٹھ کر رہا اور بچوں کو چاکلیٹ، ٹافیاں اور اس طرح کی دوسری چیزیں دیتا رہا۔ لوگ ایلی، جہاں لوگ بیماری ہی بال کو اٹھیں وہاں پھنسا کر ایک مخصوص راستے پر بھیجتے ہیں اور کلوڑی کی لمبوتری پتلی نما چیزوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں گرانے کا مقابلہ کرتے ہیں، لکپون نے وہاں بھی کام کیا۔ وہ اس مشغلے کے لئے آنے والوں کو بال اٹھا اٹھا کر پکڑا تا اور ان کا اسکور تیار کرتا رہا۔

وہ کچھ عرصہ ایک اسٹریٹ لائیکری میں بھی ملازم رہا جہاں اسے 23 ڈالرنی ہفتہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس نے ایک پریس کے بانڈنگ کے شے میں بھی کام کیا۔ یہ ملازمت اسے اسکے بڑے بھائی رالف نے دلانی تھی جو ایک اخبار کے پرنٹنگ پریس میں کام کرتا تھا۔

سب ملازمتیں اپنی جگہ تھیں لیکن لکپون کو جوانی کے زندگی کا اصل تجربہ بھی کوچوں میں حاصل ہو رہا تھا جہاں وہ کافی وقت گزارتا تھا اور بھانت بھانت کے لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا۔

ویسے تو بروکلین کے علاقے میں رہنے والے زیادہ تر تارکین وطن اپنا کافی وقت گلی کوچوں میں ہی گزارتے تھے لیکن اطالوی کچھ زیادہ ہی گزارتے تھے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ان کے گھر چھوٹے ہوتے تھے اور کنبے بڑے۔۔۔۔۔ ان کی زیادہ تر سرگرمیاں گلی کوچوں میں ہی جاری رہتی تھیں اور ان کا دل بھی وہیں زیادہ لگتا تھا۔ ان کا بس چلنا تو شاید وہ کھانا کھانے اور سونے کے لئے بھی گھر نہ جاتے۔ اکثر وہ اپنی مرغوب روٹی "پزا" بھی باہر ہی کھیں کھا لیتے تھے۔ جو بھی "مشغل میلہ" ممکن ہوتا تھا، وہ دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ مل کر گلی کوچوں میں ہی کر لیتے تھے۔

لکپون نے جن گلی کوچوں میں ہوش سنبھالا۔ ان پر عمر لڑکوں کے گروہوں کا راج تھا۔ تاہم موجودہ دور کی طرح یہ گروہ خطرناک لڑکوں کے نہیں تھے۔ وہ لوگوں کو تھوڑا بہت پریشان ضرور کرتے تھے لیکن زیادہ گزند نہیں پہنچاتے تھے۔

ان میں سے بعض کی بدعاشی محض اتنی تھی کہ اسٹے ہو کر سید تان کر، وادگیروں کے انداز میں گلیوں کا گشت کر لیا، راستے میں کسی پھل والے کا ضلیا یا خواجہ الٹ دیا، کسی دکان سے بیڑ کا ڈبا یا ڈبل روٹی اچک لی یا کسی بوڑھے کو دھکا دے دیا۔

کوئی گروہ ذرا زیادہ تعداد میں دکانوں سے مٹھائیاں، چاکلیٹ یا دوسری چیزیں اٹھا کر لے جاتا تھا۔ کچھ لڑکے پتھر مار کر کسی دکان کا شیشہ توڑ دیتے تھے۔ اسٹریٹ لائٹس کے بلب توڑنا بھی بعض لڑکوں کا مشغلہ تھا۔ کچھ لڑکے لوگوں کے گھروں کے آگے لگی ہوئی باڑھ یا پودوں کے پاس سے خشک شبنیاں اور پتے جمع کر کے کنبیں آگ لگا دیتے تھے، آنے جانے والوں کو ٹھک کرتے تھے اور خوب شور مچاتے تھے۔ لیکن ایک پولیس والا بھی آ جاتا تھا تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے تھے۔ یہ لڑکے گرجا گھروں کا بھی احترام نہیں کرتے تھے۔ ان کی کھڑکیوں پر بھی پتھر پھینکتے تھے اور جب اندر لوگ عبادت میں مصروف ہوتے تھے تو یہ باہر شور مچاتے تھے۔

جن لڑکوں کو گروہ بنانے ذرا زیادہ عرصہ گزر چکا ہوتا تھا وہ اپنا کلب ہاؤس بھی قائم کر لیتے تھے۔ یہ کلب ہاؤس عموماً کسی متروک اور کنٹررنا عمارت کا کوئی کمرہ ہوتا تھا جسے یہ لوگ اپنا ڈھبنا لیتے تھے۔ اگر ایسا کوئی مفت کاٹھ کا نہ میسر نہیں آتا تھا اور وادگیر سے بھی کام نہیں چلتا تھا تو معمولی کرائے پر کوئی چھوٹا مونا کمرہ لے لیتے تھے۔ سگریٹ نوشی اور گپ بازی کا شغل بھی ہو جاتا تھا۔ ان لڑکوں میں ان دنوں سگریٹ کا ایک براڈ سب سے زیادہ مقبول تھا۔ اس کا نام "امریکن بیوٹی" تھا۔

ایک جینی میں یہ چار سگریٹ مل جاتے تھے اور گیارہ بارہ سال کے لڑکے اس کے کش لگا کر اپنے آپ کو بہت بڑا بدعاش محسوس کرتے تھے۔ لڑکے صرف مختلف مشاغل کے لئے ہی گروہ میں شامل نہیں ہوتے بلکہ گروہ کا ممبر بن کر انہیں ایک قسم کے تحفظ کا بھی احساس ہوتا تھا۔

اکیلے دیکھنے لڑکے کو مار پیٹ اور لڑائی جھگڑے سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا۔ آئرش لڑکوں پر تو کچھ زیادہ ہی نزلہ گرتا تھا۔ وجہ شاید وہی نفسیاتی تھی۔ اطالویوں کو وہ کچھ زیادہ ہی "غیر" لگتے تھے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ دس بارہ سال یا اس سے کچھ زیادہ عمر کے ایک لڑکے کو واسطہ بنتے میں دو تین مرتبہ تو ضرور لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ سے واسطہ پڑتا تھا۔ یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ کڑو لڑکے کو کھاتو لڑکے گھر کر مارتے۔ بعض اوقات تو جاندار لڑکا زیادہ نشاندہ بناتا تھا۔ اگر کسی بھڑے لڑکے کا کسی گروہ سے تعلق نہیں ہوتا تھا تو اس کی ذات دوسروں کے لئے گویا ایک قسم کا "چیلنج" ہوتی تھی۔ اسے سبق سکھانا زیادہ ضروری ہو جاتا تھا۔

"ایک کے مقابلے میں ایک" والی لڑائیاں بھی ہوتی تھیں اور گروہوں کے درمیان بھی تصادم ہو جاتا تھا۔ گروہوں میں تصادم عام طور پر ایک دوسرے کی حدود میں مداخلت کی وجہ سے ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی گروہ دوسرے گروہ پر اپنی طاقت کی دھاک بٹھانے کے لئے بھی اس پر چڑھ دوڑتا تھا۔

آئرش لڑکے بھی لڑائی بھڑائی میں تیز تھے۔ بعض اوقات تو وہ صرف شغل کی خاطر دوسروں سے آٹکراتے تھے۔ یہودی لڑکوں کے گروہ عموماً صرف اپنے دفاع کیلئے لڑتے تھے لیکن وہ اپنے علاقے میں دوسروں کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ کوئی غیر یہودی لڑکا اگر ضرورتاً یا یونہی بے مقصد بھی ان کے علاقے سے گزرتا تھا تو وہ اس سے بھی الجھ جاتے تھے

اور اسے وہاں سے بھگا دیتے تھے۔ اس دور کی یادیں تازہ کرنے والوں اور یادداشتیں رقم کرنے والوں کی تحریروں سے ان سب باتوں کی تصدیق ہوتی ہے اور اس دور کے ریکارڈ کھنگالنے سے ان تمام حالات کی تصویر سامنے آتی ہے۔

لکپون کا شمار بھی اپنی عمر کے حساب سے بھڑے لڑکوں میں ہوتا تھا۔ تحفظ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے وہ بھی نو عمری میں ہی ایک گروہ میں شامل ہو گیا جس کا نام "ساؤتھ بروکلین" "پرز" تھا۔ کافی بعد میں جا کر ایک بھگڑے میں اس کے چہرے پر ڈم کا ایک لمبا نشان آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ "اسٹارٹس" کی عرفیت سے بھی مشہور ہوا۔ یعنی ایسا آدمی جس کے چہرے پر ڈم کا نشان موجود ہو۔ اگر وہ اپنے پرانے محلے میں رہ رہا ہوتا تو شاید اس کے چہرے پر بہت پہلے ڈم کا نشان آ چکا ہوتا کیونکہ وہاں کا ماحول زیادہ خطرناک تھا۔

وہ جس گروہ میں شامل ہوا اس میں گیارہ سال تک کی عمر کے لڑکے بھی موجود تھے۔ یہ لوگ زیادہ مین مین کے زیریں مشرقی علاقے میں منڈلاتے تھے جہاں لکپون کا بھائی رالف بھی سرگرم عمل تھا اور چوری کی ایک گاڑی بیچنے کے پکر میں پولیس کی نظر بھی آ چکا تھا۔

لکپون نے ایک انفرادیت یہ بھی قائم کی کہ کچھ دنوں بعد وہ ایک اور گروہ میں بھی شامل ہو گیا جو "چالیس چوز" کہلاتا تھا۔ یہ نام "علی بابا چالیس چوز" والی کہانی سے لیا گیا تھا۔ لکپون شاید اس علاقے کا واحد لڑکا تھا جو بیک وقت دو گروہوں کا ممبر تھا۔ اس کی دوسرے گروہ کی ممبر شپ زیادہ اہمیت کی حامل تھی کیونکہ "چالیس چوز" درحقیقت ذرا بڑی عمر کے لڑکوں اور نو جوانوں کے گروہ کی ایک شاخ یا ذیلی گروہ تھا۔ اس کا ممبر بننے کے بعد آگے چل کر پندرہ سولہ سال کی عمر میں سینئر لڑکوں کے گروہ کا ممبر بننا بالکل آسان تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے آپ ایک ایسے اسکول کے پرائمری سیکشن میں پڑھ رہے ہیں جس میں سینکڑی سیکشن بھی موجود ہے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد آپ آسانی سے اسی اسکول کے سینکڑی سیکشن میں چلے جائیں گے۔

اس زمانے میں نیو یارک اور شکاگو وغیرہ میں بڑی تعداد میں کسن اور ذرا بڑی عمر کے نو جوانوں کے گروہ موجود تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان شہروں میں اس سے بھی تقریباً سو سال پہلے یعنی 1800ء کے آغاز سے ہی گروہ بازی کا رواج شروع ہو گیا تھا۔ گلی کوچوں میں چھوٹوں اور بڑوں کے، طرح طرح کے گروہ پائے جانے لگے تھے جن میں سے بیشتر کی سرگرمیاں کافی حد تک مجرمانہ تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رجحان بڑھتا گیا اور گروہوں کی سرگرمیاں بھی زیادہ سے زیادہ خطرناک ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ کتنی ہی قسم کی مافیا میں وجود میں آ گئیں جو اتنی مضبوط ہو گئیں کہ حکومتوں کے لئے بھی اپنے تمام تر وسائل کے باوجود ان سے نمٹنا مشکل ہو گیا۔

لکپون کے لڑکپن کے دور میں بھی اس کے چاروں طرف کتنے ہی گروہ موجود تھے۔ جب وہ دو گروہوں کا ممبر بن گیا تو کچھ گناہ سا ہو گیا۔ اس کے بعد کے خاصے طویل دور میں اس کی موجودگی اور سرگرمیوں کا کوئی خاص سراغ نہیں ملتا۔ البتہ جب اس نے جرائم کی دنیا میں کافی کامیابیاں حاصل کر لیں اور وہ کافی "مشہور" ہو گیا تو اس کے لڑکپن کے دور کے کئی شناسا اس کا وہ زمانہ یاد کر کے بڑی حیرت سے کہتے تھے۔ "ارے۔۔۔ یہ وہ لکپون ہے! یہ تو کوئی ایسا غیر معمولی لڑکا نہیں ہوا کرتا تھا۔ عام سلاوا کا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ اتنی بڑی چیز بن جائے گا۔۔۔۔۔!"

اس دور کے دو گروہوں کے سربراہوں کا مختصر تذکرہ ضروری ہے کیونکہ لکپون کی آئندہ زندگی میں ان کا کردار خاصی اہمیت کا حامل رہا۔ ان میں سے ایک کا نام جان نور ہو تھا۔ جان نور یو جسانی طور پر کوئی طاقتور یا کچھ شیم آدمی نہیں تھا البتہ اس کے پاس ایک تیز و طرار اور شاطر دماغ ضرور موجود تھا اور اس دماغ کے سہارے ہی اس نے اپنا گروہ منظم کیا اور جرائم کی دنیا میں پاؤں جمائے۔

جان نور یو 1882ء میں اٹلی کے شہر نیپلز سے ساتھ میل دور ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہ دو سال کا تھا جب اس کی ماں ماریا سے گود میں اٹھائے ہجرت کر کے نیو یارک پہنچی۔ اس کا شوہر اس سے پہلے ہی ایک حادثے میں مارا جا چکا تھا۔

نیو یارک آنے کے بعد ماریا دو سال تک اپنے بھائی کے پاس رہی اور ایک فیکٹری میں سلائی کا کام کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پانچتی رہی۔ پھر اس نے کچھ نوامی ایک آدمی سے شادی کر لی۔

جان نور یو بچپن ہی سے بے پناہ شاطر اور چرب زبان تھا۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے کوئی بھی کہانی فوری طور پر گھڑ کر سنا سکتا تھا جو اس کے حق میں مفید ثابت ہوتی۔ وہ جب چاہتا یا مقلوم بن کر مسلمان یا کسی عدالت کے جج کی ہمدردیاں حاصل کر سکتا تھا اور جب چاہتا، کسی معاملے میں قصور وار ہونے کے باوجود اپنی چرب زبانی سے خود کو بے قصور ثابت کر سکتا تھا۔

تقریباً چھ سال کا ہونے کے بعد اس نے صرف تیرہ ماہ تعلیم حاصل کی۔ اس کا سوجلا باپ ایک ایسی دکان چلاتا تھا جو باہر سے گروہی اسٹور، یعنی سوڈے سلف کی دکان نظر آتی تھی لیکن اندر وہ گا بھوں کو شراب پلاتا تھا جو غیر قانونی طریقے سے تیار کی گئی ہوتی تھی اور جس پر کوئی ٹیکس ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ پیسے والوں کو یہ شراب بہت سستی مل جاتی تھی۔

جان نور یو اپنے باپ کے گروہی اسٹور کی آڑ میں چلنے والے اس خفیہ شراب خانے میں سات سال کی عمر میں ویٹر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس سے اعزازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی "ترتیب" کس عمر سے شروع ہو گئی تھی۔ اس شراب خانے پر چھاپے پڑا تو سات سالہ جان نور یو نے خود اپنے باپ کے خلاف گواہی دی اور وقت آ میر لےجے میں عدالت کو بتایا کہ وہ اپنے سوتیلے باپ کا کھلم کھانا پڑے پر مجبور تھا۔

(جاری ہے)

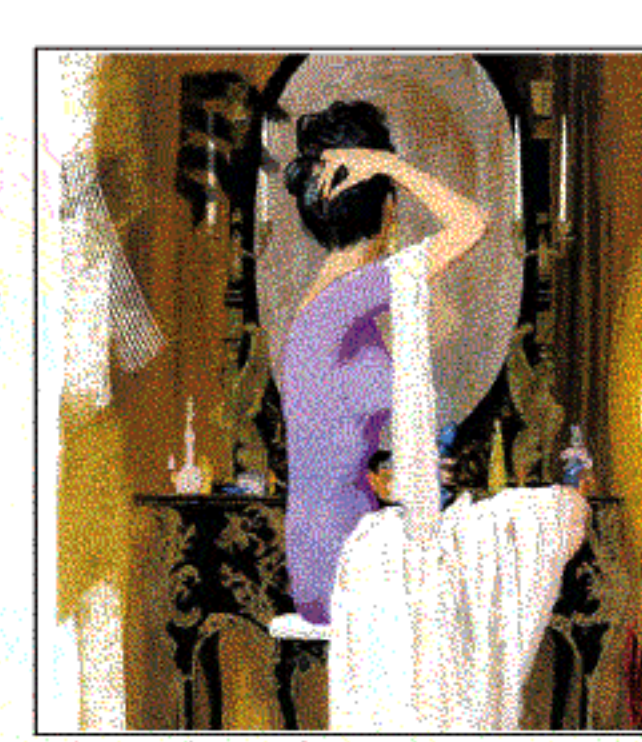






”بڑا“ اور ”ماتوز“ آدمی بننے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اس کی ”ترقی“

پسندیدہ استاد کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ کم از کم اس زمانے میں تیل ہی الکلیج ان کا آئیڈل تھا۔



کا سفر جاری تھا۔ ساحلی علاقہ بہت طویل و عریض اور گنجان آباد تھا۔ ہاں تیزی سے تیل کے قدم جم رہے تھے اور الکلیج ان چونکہ ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا، اسلئے تیل کی نظر میں اس کی اہمیت بڑھ رہی تھی۔ اخبارات، جرائم پیشہ اطالویوں کے تمام گروہوں کو ”پلیک پنڈ گینگ“ کہتے تھے۔ ”سیاہ ہاتھ“ کی یہ اصطلاح اتنی مشہور ہو چکی تھی کہ یہ الفاظ سننے ہی ہر شخص سمجھ جاتا تھا کہ اس سے مراد جرائم پیشہ اطالوی ہیں۔ جرائم کی دنیا میں آئرلینڈ سے آئے ہوئے تارکین وطن بھی بہت آگے تھے۔ امریکا میں ان کی آمد کا سلسلہ اطالوی تارکین وطن سے بھی پہلے سے جاری تھا۔ نیویارک میں بھی اس کی آئرش گینگ موجود تھی۔ اطالویوں کے سب سے بڑے حریف یہی تھے۔ ان کے گروہوں کے لئے اخبارات ”وائٹ پنڈ گینگ“ کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ آئرش اور انٹین گروہ جہاں جہاں بھی موجود تھے، ایک دوسرے کو علاقے سے نکالنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے ان کوششوں کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے اور مسلح تصادم ہوتے تھے۔ لوگ ڈنڈی ہوتے تھے۔ مرتے تھے لیکن اس سے گویا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جو بد معاش مرتے تھے، نئے بد معاش ان کی جگہ لے لیتے تھے۔ پرانے بد معاشوں کے مرنے سے نئے بد معاشوں کی کھپت ہو جاتی تھی۔ کچھ ”بیروڈگاروں“ کو روزگار مل جاتا تھا اور کم کم ان کے لئے بعض کارندوں کو زیادہ کمائے کے مواقع میسر آ جاتے تھے۔

الکلیج ان حالات میں بڑے اچھے طریقے سے اپنی ”اہلیت“ اور قابلیت ثابت کر رہا تھا۔ تیل سارے کام اپنے کارندوں سے لیتا تھا۔ وہ کسی کام میں اپنے ہاتھ ”گندے“ نہیں کرتا تھا اور ایک معزز باس کی طرح شان سے رہتا تھا۔ الکلیج ان کو اس کے نائب کی سی حیثیت حاصل ہوتی جاری تھی۔ اس نے ”ہارورڈ ان“ کو کافی ترقی دی تھی۔ اس زمانے میں کوئی آئی لینڈ کو ایک مقبول تفریحی مقام کی حیثیت حاصل ہوتی جاری تھی جہاں لوگ چھٹیاں گزارنے جاتے تھے۔ وہاں ہر طرح کی تفریح گاہیں موجود تھیں اور مزید سرگرمیاں تھیں۔ تاہم ان دنوں ذرائع آمد و رفت زیادہ نہیں تھے اور جو تھے، وہ بھی زیادہ ترقی یافتہ اور تیز رفتار نہیں تھے اس لئے کوئی آئی لینڈ کی ترقی کی رفتار بھی تیز نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ ”ہارورڈ ان“ جیسی تفریح گاہوں پر ہی قناعت کر لیتے تھے۔

الکلیج ان میں یہ خوبی تھی کہ وہ صرف باس کی طرح شان سے ہی نہیں رہتا تھا بلکہ ایک پارٹینڈر کی حیثیت سے بار میں پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات سے بھی نمٹ لیتا تھا۔ وہ ایک دراز قدم مضبوط اور بے خوف آدمی تھا۔ وہ اپنے سامنے کسی کی بد معاشی چلنے نہیں دیتا تھا۔ وہ تیل کے اس حد تک قریب ہو گیا تھا کہ اگر ”ہارورڈ ان“ میں ناخوشگوار حالات کی وجہ سے رات گئے باغی الصبح اپنے گھر نہیں جا پاتا تھا تو سڑک کے کونے پر ہی واقع، تیل کے گھر بھی جا کر سو سکتا تھا۔ تیل کی بیوی اور بچی اسے اچھی طرح جانتے مگنی تھیں۔

الکلیج ان کا کام آسان نہیں تھا۔ جس قسم کا کاروبار وہ چلا رہا تھا، اسے پرسکون اور ہموار انداز میں رواں رکھنے کیلئے صرف بد معاشی اور طاقت ہی کی نہیں، ذہانت اور عمدہ حکمت عملی کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ گزربو کرنے والوں کے ساتھ الکلیج ان ”اپنی ہاتھ“ کے ساتھ نمٹتا تھا اور یہ سچ سچ کا اپنی ہاتھ ہوتا تھا۔ محض اس طرح کا سیاسی بیان والا اپنی ہاتھ نہیں ہوتا تھا جس کا ذکر بعض پرمعاذہ ملکوں کی حکومتوں کے عہدیدار آئے دن اپنے بیانات میں کرتے رہتے ہیں۔

تاہم الکلیج ان کا کام محض یہ نہیں تھا کہ گزربو کرنے والوں اور ماحول کو خراب کرنے والوں کی ہڈی پکلی ایک کر کے، ان کا دماغ ٹھکانے پر لے آئے۔ اسے یہ خیال بھی رکھنا ہوتا تھا کہ کام بڑے ”سیلئے“ سے انجام پائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گاہک ان کے نائٹ کلب نما شراب خانے میں آتے ہی گھبرائے لگیں کہ وہاں تو دلگدگ فساد ہوتا ہے۔

وہ جب کسی کی پٹائی کرتا تھا یا کسی کو گھبراہٹ نائٹ کلب سے باہر پھینکتا تھا تو اسے مار کھانے والوں اور تماشا دیکھنے والوں، دونوں ہی کے ڈھونڈ میں بیٹا شرابا کر کرتا ہوتا تھا کہ غلطی کر رہا تھا، ماحول کو خراب کر رہا تھا، سزا صرف اسی کوئی ہے، امن پسند گاہکوں اور صرف تفریح کے لئے آنے والوں کو کوئی خطرہ نہیں، بلکہ انہیں مکمل تحفظ حاصل ہے، اگر کوئی ان کا مزہا کر کرنا کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا دماغ فوراً درست کر دیا جائے گا۔

یہ ایک نازک ذمہ داری تھی اور الکلیج ان اسے عمدگی سے ادا کر رہا تھا۔ اسی لئے تیل کی نظر میں اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ الکلیج ان کی زیر نگرانی کاروبار روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ ان دنوں ساتھ ساتھ بروکین اور آس پاس کے تمام گنجان آباد علاقوں میں اس طرح کی تفریح گاہوں کی بھرمار تھی۔ کم سے کم آمدنی والے بھی کوئی ندوکی ”شغل سیلئے“ تو کر ہی سکتے تھے۔ ہر طبقہ، ہر حیثیت اور ہر ذوق کے آدمی کے لئے کچھ نہ کچھ موجود تھا۔

شراب خانے تھے، قہر خانے تھے، قمار خانے تھے، چھوٹے مولے یا اونچے اور مہنگے، ہر طرح کے نائٹ کلب تھے۔ جو آدمی نائٹ کلب میں جانے کا تحمل نہیں ہو سکتا تو وہ کسی شراب خانے میں بیٹھ کر محض شراب کی ادا مگنی کر کے، اس کے ساتھ کسی متناسب الاعضاء اور خوش شکل رقاصہ کا ڈانس مفت میں دیکھ سکتا تھا۔ وہاں مدعوئے میں ”نامی ایک خاتون کا نائٹ کلب بھی تھا جس میں پرس زازار قس کرتی تھی جو سچ ایک ذوال زدہ ملک کی شہزادی تھی۔ اس کے قس کی بڑی دھوم تھی۔

”ہارورڈ ان“ کے ماحول کو پرسکون رکھنے کے لئے اگر حالات کے استعمال کی ضرورت پڑتی تھی تو عموماً اس کے لئے اکیلا الکلیج ان ہی کافی رہتا تھا۔ اگر وہ کسی کی مدد کی ضرورت محسوس کرتا تو گروہوں کی کمی نہیں تھی۔

مار دھاڑے خود بھی تیل کی گریز نہیں کرتا تھا۔ یہ درست تھا کہ وہ ڈاکے مارنے، لوٹ مار کرنے یا اس طرح کی دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینے بذات خود نہیں جاتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ کوئی شخص اور شعلیت آدی تھا۔ وہ عمدہ لباس ضرور پہنتا تھا اور شان سے رہتا تھا لیکن اندر سے بہر حال ایک خاص بد معاش تھا اور غصے کا بھی بہت تیز تھا۔ ایک بار اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو اتار مارا تھا کہ وہ اسپتال پہنچ گیا تھا۔

لئے اس کے پاس دوڑے آتے تھے، انہیں وہ مایوس نہیں کرتا تھا۔ بعض اوقات تو ان کا فریاد لے کر ان بھی ضروری نہیں ہوتا تھا۔ تیل خود ہی ان کی مدد کو پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار کھانے پینے کی چیزوں کی ایک چھوٹی سی دکان چلانے والے کو کوئی لوٹ کر لے گیا۔ غریب سادہ و گاندہ روز کی کمائی سے گھر بھی چلاتا تھا اور اسی رقم میں سے اگلے دن کی دکانداری کے لئے سامان بھی خریدتا تھا۔ ڈیکیتی کی وجہ سے اس کے اور اس کی فیملی کے لئے گویا قانون کی نوبت آگئی۔ ایک چلتا ہوا سلسلہ لوٹ گیا۔

تیل کو پتہ چلا تو اس شخص کی دکان میں گیا اور خاموشی سے کاؤنٹر پر اتنی رقم رکھ کر آگیا کہ وہ دو دو چار دن آسانی سے کاروبار جاری رکھ سکے۔ اسی طرح ایک اور شخص جو غلطی پر چھپایا تھا، اس کا ٹھکانا اسی چکر لے گیا۔ وہ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ کتنی مچھلیاں وہ بیچنے کے لئے لکھا تھا، ان کا وزن خاصا ہوتا تھا۔ انہیں خود اٹھا کر پھیری لگانا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔

تیل نے اسے تین سو ڈالر دیے اور کہا۔ ”اب ایک گھوڑا گاڑی خرید لو اور اس میں رکھ کر مچھلیاں بیچ کر تو بوڑھے ہو گئے ہو، مچھلیوں کا ٹھکانا دیکھتے پھرنا بھی تمہارے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے۔“

ایک قریبی ریسٹورنٹ میں گاہکوں کے ہیٹ اور اوور کوٹ سنبھالنے والا ایک غریب مگر خوش مزاج ملازم تیل کا شاگرد تھا۔ اس کی خوش مزاجی کی وجہ سے سبھی اس کو پسند کرتے تھے۔ وہ اپنی غربت کے باوجود کبھی اپنے حالات کا رونا روتا نظر نہیں آتا تھا اور ہمیشہ سب کو ہسانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

اس غریب کو بھی ایک بار راستے میں دو تین ایسے چوراہوں نے لوٹ لیا جن کا تعلق کسی گروہ سے نہیں تھا۔ اسے اسی روز خواہ مخواہ تھی۔ معمولی سی رقم تھی مگر وہ بے چارہ پورا مہینہ اسی میں گزارتا تھا۔ وہ فوراً فریاد لے کر تیل کے پاس پہنچا۔

تیل نے چند منٹ میں ہی ان رپڑوں کو تلاش کر لیا اور خود اپنے ہاتھوں سے ان کی ایسی دھنائی لگائی کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ تیل نے اس غریب ملازم کو نہ صرف اس کی رقم واپس دلوائی بلکہ اپنے پاس سے بھی کچھ رقم دی۔

کچھ اسی طرح کی متضاد خصوصیات الکلیج ان میں بھی تھیں۔ وہ بھی بیک وقت رحمدل بھی تھا اور سفاک بھی۔ کبھی ایک صبح کاروباری آدمی کی طرح ٹھنڈے دل و دماغ سے ہر بات کے بارے میں سوچ کر فیصلہ کرتا تھا اور کبھی اس کی آنکھوں میں اچانک خون اترتا تھا۔ پھر وہ آہستہ سے باہر ہو جاتا تھا اور قائد کے نقصان کی پروا کے بغیر بھی کوئی قدم اٹھا لیتا تھا۔ شاید اپنی مشرقی خوبیں اور خامیوں کی وجہ سے تیل اور الکلیج ان دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ تیل کو زیادہ غرض تو اس بات سے تھی کہ الکلیج ان کا کاروبار کومدھ طریقے سے چلا رہا تھا۔

مگر جوانی بہر حال جوانی ہوتی ہے۔ الکلیج ان کی عمر اٹھارہ سال تھی اور وہ ایک بھر بوجوان تھا۔ ایک بار جوانی کے جذبات اس کی ساری کاروباری مصلحتوں پر غالب آ گئے اور مزید سی ہم ہوا کہ جوانی کے جذبات میں اس کا رواداری غصہ بھی شامل ہو گیا۔

علاقے میں ایک نوجوان تھا جس کا نام تو ذرا لمبا تھا لیکن اختصار سے اسے گاچ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ کم عمری میں وہ مچھلیاں پکڑنے کا کام کرتا تھا۔ کچھ عرصہ اس نے ایک جام کی دکان پر بھی اس کے شاگرد کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر کسی طرح اس کی رسائی ”جینوزوں“ فیملی تک ہو گئی جو اس دور کی مافیا فیملی تھی اور بہت طویل عرصے تک جرائم کی دنیا پر راج کرنے والی فیملیوں میں سے ایک رہی۔ امریکا میں اب بھی اس کی باقیات موجود ہیں اور جرائم کی دنیا سے ان کا تعلق بھی ہے البتہ وہ پہلی سی باتیں نہیں رہیں۔

گاچ اس فیملی کا کارندہ بن گیا تھا اور اب اپنی جگہ ایک اچھا خاصا بد معاش تھا۔ 1917ء کے موسم گرما کی ایک شام وہ قدرے لڑکھڑاتے قدموں سے ”ہارورڈ ان“ میں داخل ہوا۔ اس کی گرل فرینڈ مارا پاس کے ساتھ تھی اور اس کے بازو پر تقریباً لگی ہوئی تھی۔ مارا کے علاوہ گاچ کی بہن بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ ان دونوں کے پیچھے پیچھے گویا دال خواستہ چلی آ رہی تھی۔ اس کا نام لینا تھا۔ اسے دیکھ کر اٹھارہ سالہ الکلیج ان کا دل کچھ غیر معمولی انداز میں دھڑکنے لگا۔

اس کا معمول تھا کہ وہ نائٹ کلب کے اندر چکر لگا کر رہتا تھا۔ گاہکوں کے درمیان گھومتا رہتا تھا اور جائزہ لیتا رہتا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا ہے۔ بے تکلف ہونا چاہتا تھا مگر لینا اس کی ذات میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ وہ دکھائی سے بات کر رہی تھی۔ ایک آدمہ مرتبہ تو اس نے اچھی خاصی ناگوار بھی ظاہر کی اور ڈانٹنے کے سے انداز میں بات کا جواب دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ بھائی کے ساتھ تھی اور بھائی اسی میز پر موجود تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے الکلیج ان کی شخصیت اور انداز اچھا نہ لگا ہو۔

اس کا بھائی گاچ وہاں آنے سے پہلے ہی تھیں تھے اور وہاں پہنچنے کے بعد مزید پی چکا تھا، اس لئے اس کے حواس زیادہ اچھی طرح کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ پہلے یہی سمجھا کہ شاید اس کی بہن الکلیج ان کو جانتی ہے۔ وہ خود الکلیج ان کو نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس کی حیثیت سے واقف تھا۔

اس نے جب کئی بار اپنی بہن کو ناگوار ہی اور پتلی سے الکلیج ان سے بات کرتے دیکھا تو اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کچھ چھٹی اور اسے احساس ہوا کہ بات وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہا ہے۔ کوئی انجینی زبردستی اس کی بہن سے بے تکلف ہونے اور اس کے سر پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

پھر بھی اس نے احتیاطاً بہن سے پوچھ لیا۔ ”کیا تم اس نوجوان کو جانتی ہو؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔۔“ لینا نے جواب دیا۔ ”میں نے آج سے پہلے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔۔۔۔۔۔ بہت ہی ڈھیت معلوم ہوتا ہے۔ میں اس سے سیدھے منہ بات نہیں کر رہی، پھر بھی سر پر سوار ہوا جا رہا ہے۔ شاید اس کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آ رہی کہ میں اس سے کلام کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے وہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اس کے یوں بار بار مجھ سے بات کرنے سے مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔ تم اسے سمجھانے اور اس حرکت سے باز

رکھنے کی کوشش کرو۔ اس سے کہو، اسے ہماری میز پر آنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن دیکھو۔۔۔۔۔۔ ڈرائی سے بات کرنا۔۔۔۔۔۔ سختی سے پیش آنے اور بات بڑھانے کی ضرورت نہیں۔“

الکلیج ان نے ایک بار پھر ان کی میز کا رخ کیا۔ گاچ کا ارادہ یہی تھا کہ وہ اسے آرام سے ایک طرف لے جائے گا اور نہ ہی سے کہے گا۔ ”دیکھو مسٹر۔۔۔۔۔۔ وہ میری چھوٹی بہن ہے اور وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہ رہی۔ اس لئے میرانی کرو اور اس کا پیچھا چھوڑ دو۔۔۔۔۔۔“

لیکن اس کے یہ کہنے کی نوبت نہیں آ سکی۔ الکلیج ان نے اس بار اصرار کا پتہ لگایا تو اس کی زبان بالکل ہی بے لگام ہو چکی تھی۔ اس نے آتے ہی لینا کی تعریف میں ایک جملہ بول دیا۔ کم از کم اپنی دانست میں تو اس نے تعریف ہی کی تھی لیکن بات اتنی بے ہودہ تھی کہ اس پر کوئی طوائف بھی خوش نہیں ہو سکتی تھی۔ اوپر سے الکلیج ان کی آواز اتنی اونچی تھی کہ اس پاس کی میزوں والوں نے بھی سن لیا ہوگا۔ یہ بات گاچ کے لئے اور بھی زیادہ ناقابل برداشت تھی۔

اس کا نشہ برن ہو گیا۔ وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصے سے تھما اٹھا تھا۔

”میں اس طرح کی بکواس سننے کا عادی نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔“ گاچ چلایا۔

”فورا میری بہن سے معافی مانگو۔ سنا تم نے۔۔۔۔۔۔؟“

اب الکلیج ان کو ذرا ہلکا لگا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ لڑکی گاچ کی بہن ہوگی۔ وہ دونوں ہی لڑکیوں کو اس کی دوست سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ خون کے رشتوں میں عزت کا معاملہ آن پڑتا ہے۔ وہ فوراً کچھ سنبھل گیا۔

دونوں ہاتھ اٹھا تے ہوئے اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”اوہ۔۔۔۔۔۔ معاف کرنا۔۔۔۔۔۔ مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم اسے سنجیدگی سے مت لو۔“

”لعنت ہو تم پر۔۔۔۔۔۔ اور تمہارے مذاق پر۔۔۔۔۔۔“ گاچ کا غصہ برقرار رہا کیونکہ الکلیج ان کے معافی مانگنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ لال سمجھو کا ہو رہا تھا۔

اب الکلیج ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ گاچ چلایا۔ ”تمہیں میری بہن سے معافی مانگنی پڑے گی۔“ ساتھ ہی اس نے الکلیج ان کو مٹوئی سی گالی دی۔

الکلیج ان کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا اور وہ قدم بجا کر گاچ کی طرف بڑھا۔ گاچ کوئی قدر آدمی نہیں تھا اور نہ ہی وہ جسیم تھا۔ وہ صرف ساڑھے پانچ فٹ کا تھا۔ اس کا جسم گوکہ ورزش تھا لیکن الکلیج ان جیسے نیم شیم آدمی کے سامنے وہ خاصا حقیر لگ رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اگر اس نے الکلیج ان پر وار کرنے میں پہل کر بھی دی جب بھی ہاتھ پاؤں کی لڑائی میں وہ الکلیج ان سے مار کھائے گا۔

چنانچہ جوں ہی الکلیج ان اس کے قریب پہنچا، اس نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر کھٹکے دار چاقو نکالا اور پکلی کی سی تیزی سے الکلیج ان کے چہرے پر وار کیا۔ اس رد عمل کی الکلیج ان کو توقع نہیں تھی کیونکہ وہ بھی گاچ کو نہیں جانتا تھا۔ وہ اسے کوئی عام سا آدمی اور ”شریف شہری“ سمجھ رہا تھا۔

گاچ کے چاقو نے الکلیج ان کے کان کی لو سے لے کر ہونٹوں کے کونے تک اس کا رخسار چیر ڈالا۔ اس قطعی غیر متوقع وار نے شاید الکلیج ان کا ذہن ایک لمحے کیلئے ناکارہ کر دیا۔ اس کے علاوہ شاید اسے لاشعوری طور پر بھی توقع نہ رہی ہو کہ گاچ ایک اور پراکتفا نہیں کرے گا بلکہ فوراً ہی دوسرا اور پھر تیسرا وار بھی کرے گا۔

وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ گاچ کے دوسرے وار نے اس کے چہرے پر ایک اور چیرا لگا دیا جو پہلے زخم سے ٹل گیا۔ اس کے تیسرے وار نے چھوٹا زخم ڈالا مگر الکلیج ان کا پورا چہرہ بہر حال خون میں لٹیر گیا تھا اور بڑا سا ایک خون آلود گولا معلوم ہو رہا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس پر آنکھیں کہاں ہیں، ہونٹ کہاں اور ناک کہاں۔۔۔۔۔۔

یہ بات قدرے عجیب سی تھی کہ گاچ نے اس کے صرف چہرے پر ہی وار کئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انسان جب کسی سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے تو سب سے زیادہ اس کی عقل ہی بری لگتی ہے۔ شاید اسی لئے گاچ نے الکلیج ان کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔

الکلیج ان لڑکھڑا کر چیخے ہٹا تو کسی کرسی میں الجھ کر گر پڑا۔ خون اس کی آنکھوں میں بھی بھر گیا۔ اسے صحیح طور پر نظر آنا بھی بند ہو گیا۔ وہ اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گاچ نے اس دوران ماہر انداز اور مشاقہ پھرتی سے چاقو بند کر کے جیب میں رکھا۔ اپنی جیبو باور بہن کا بازو پکڑا اور تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔

جب تک نائٹ کلب کے دوسرے ملازموں نے آ کر الکلیج ان کو اٹھایا تب تک گاچ دونوں لڑکیوں سمیت غائب ہو چکا تھا۔ الکلیج ان کی حالت دیکھ کر دوسرے گاہکوں نے دہشت زدہ ہو کر نہایت جلدت میں وہاں سے رخصت ہونا شروع کر دیا۔

الکلیج ان کو جلدی سے کوئی آئی لینڈ ہاسٹل لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اسے فوراً سنبھالا۔ الکلیج ان کے چہرے پر تین ٹانگے آئے غیبت یہ تھا کہ اس کی آنکھ ضائع ہونے سے سچ گئی تھی۔ ایک زخم اس کی بائیں آنکھ کے بالکل قریب سے شروع ہوا تھا۔

الکلیج ان کے زخم سمجھ ہونے اور ٹانگے کھٹکنے میں چند دن لگے۔ نشان ابھی تازہ تھے اور نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی وجہ سے چہرہ کچھ بے باک لگنے لگا تھا۔ الکلیج ان نے ان نشانات کے ہلکے پڑنے کا انتظار نہیں کیا اور گاچ کی تلاش شروع کر دی۔

گاچ کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ ایک نیم شیم نوجوان جس کے چہرے پر زخموں کے تازہ نشان ہیں، اس کے بارے میں پوچھتا پھر رہا ہے اور سرگرمی سے اسے تلاش کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ نوجوان اپنے آپ کو فریک تیل کا آدمی بتاتا ہے۔ یہی اس زمانے کا ایک طریقہ تھا۔ کوئی بد معاش اپنے بارے میں واضح طور پر یہ نہیں کہتا تھا کہ اس کا تعلق فلاں گینگ ہے۔ وہ صرف یہ کہتا تھا کہ وہ فلاں کا آدمی ہے۔ اس سے اس کی حیثیت واضح ہو جاتی تھی۔

گاچ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ لاطینی میں ایک خطرناک گروہ کے آدمی پر حملہ کر کے اس کا چہرہ بگاڑ بیٹھا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس مسئلے کا حل تلاش کے بغیر بچنے سے شہر میں نہیں رہ سکے گا۔ وہ فریاد لے کر دوڑا دوڑا جوزف میریہ کے پاس گیا جو پورے نیویارک کی مافیا کا باس تھا۔ مختصر اسے ”جو۔۔۔۔۔۔ دی باس“ کہا جاتا تھا۔

”جو۔۔۔۔۔۔ دی باس“ نے فوراً پوچھتے بلائی۔ یہ پوچھتے ”ہارورڈ ان“ میں ہی بیٹھی۔ جرائم کی دنیا کے چند بڑے اس پوچھتے میں شریک تھے۔ دونوں فریق یعنی گاچ اور الکلیج ان ان کے سامنے پیش ہوئے۔ سارا قصہ سنا گیا۔ گویا مقدمے کی سماعت ہوئی۔

طے یہ پایا کہ غلطی بہر حال الکلیج ان کی تھی۔ چنانچہ اسے انتقام لینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا البتہ اس غلطی پر گاچ کا رد عمل ضرورت سے زیادہ شدید تھا، اسلئے اسے الکلیج ان سے معذرت کرنی چاہئے تھی۔

گاچ نے جب ”بے قاعی ہوش و حواس“ آئے سامنے بیٹھ کر الکلیج ان کے چہرے پر اپنے لگائے ہوئے زخموں کے نشان دیکھے تو اسے خود بھی احساس ہو گیا کہ اس کا رد عمل واقعی ضرورت سے زیادہ شدید تھا، چنانچہ اس نے معذرت کرنے میں ذرا بھی تاہل نہیں کیا۔

الکلیج ان نے اس فیصلے کو قبول کر لیا۔ بعد کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے خود شلی سے اس فیصلے کو قبول کیا تھا کیونکہ آنے والے دنوں میں کئی بار اس کا اور گاچ کا آمنہ سامنا ہوا لیکن الکلیج ان نے اس پر کسی بھی قسم کا حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ اس کیلئے کوئی برا لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔

اس کا جب بھی گاچ سے سامنا ہوا، اس نے بس گہری نظروں سے، پرنیال انداز میں اس کا جائزہ لینے پر اکتفا کیا!

(جاری ہے)



الکپون نے زندگی بھر گالج کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ بعد میں جب الکپون شکاگو چلا گیا اور وہاں "ترقی" کر

دل ہاتھ سے چلا گیا۔

اس کا نام تو میری تھا لیکن مختصراً سے صرف 'سے' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ ایک مزدور کی بیٹی تھی جو زیادہ تر تعمیراتی کام کرتا تھا۔ اس کا نام مائیکل کلفن تھا۔

کلفن تھا۔

سے، الکپون سے

دو سال بڑی تھی

لیکن الکپون کو اس

کی بھی پروا نہیں

تھی البتہ لوگوں

کے سامنے ذرا

شرمندگی کا امکان

ہو سکتا تھا، چنانچہ

شادی کے سر

یقینیت پر سے نے

اپنی عمر ایک سال

گھٹا کر اور الکپون

نے ایک سال

بڑھا کر نکھوائی۔

یوں دونوں برابر

ہو گئے۔

ان دنوں

اطالویوں اور

آئرش لوگوں کے

درمیان شادیاں کم

ہی ہوا کرتی

تھیں۔ البتہ یہ

ضرور تھا کہ

اطالوی مرد

نوجوانی اور کم عمری میں ہی شادی کر لیا کرتے تھے جبکہ آئرش مرد اس

معاملے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے اور عمر پختہ ہونے کا

انتظار کرتے تھے۔ شاید اسی لئے جب کسی آئرش لڑکی کو اطالوی نوجوان

میسر آتا تھا تو وہ زیادہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی۔ شاید وہ سوچتی

تھی کہ کوئی آئرش مرد تو نہ جانے کب اس سے شادی پر آمادہ ہو۔

الکپون آئرش اور اطالوی کے معاملے میں کسی قسم کے فرق، امتیاز اور

تعصب کا قائل نہیں تھا۔ لڑکی کے والدین شاید اس شادی کی اجازت

دینے کے معاملے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوتے لیکن اس کی بڑی وجہ

الکپون کا ذریعہ معاش اور وہ لوگ ہوتے جن کے درمیان الکپون دن دن

رات رہتا تھا۔

تاہم یہ سب باتیں دھری رہ گئیں۔ سب کو اس شادی پر آمادہ ہونا ہی

پڑا کیونکہ درحقیقت شادی سے پہلے ہی الکپون کے بچے کی ماں بن

گئی تھی۔ الکپون نے اس بچے کی ولدیت سے انکار نہیں کیا اور اسے

اپنایا۔ بچے کی پیدائش کے آٹھ دن بعد ان کی شادی ہوئی اور اٹھارہ دن

بعد بچے کے تختے کی رسم ہوئی جس میں الکپون نے بچے کی ولدیت کے

خانے میں اپنا نام لکھوایا۔ بچے کا نام الہرت فرانسس الکپون رکھا گیا تاہم

وہ زندگی بھر کسی کے نام سے جانا پہچانا گیا۔

ایک روز ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے الکپون کی زندگی کا رخ

بدل دیا۔ شادی کے بعد اس کے مزاج میں ذرا نرمی تو آئی تھی لیکن کبھی

بھی اس کا بے پناہ غصہ عود کر آتا تھا۔ اس کی مشتعل مزاجی عمل طور پر ختم

نہیں ہوئی تھی اور شاید وہ بھی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اس کی فطرت میں شامل

تھی۔

ایک روز وہ وصولی کی ہم پر نکلا ہوا تھا۔ واپسی پر وہ راستے میں ایک

ڈربک لینے کے ارادے سے بندرگاہ کے علاقے میں رُک گیا اور ایک

بار میں چلا گیا۔ وہاں آرتھر نامی ایک آئرش نوجوان بھی چلا آیا۔ اس کا

تعلق ہی ہان کے گروہ سے تھا۔ آئرش گروہوں کو مجموعی طور پر "وائٹ

پینڈ" کہا جاتا تھا جبکہ اطالویوں کے گروہ "بلیک پینڈ" کہلاتے تھے۔

وائٹ پینڈ گروہوں میں ہی ہان کا گروہ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔

اس وقت تک آرتھر اور الکپون دنوں ہی اتنے مشہور نہیں ہوئے تھے

کہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے۔ آرتھر کو خیر بعد میں بھی کبھی مشہور نہیں

ہوا۔ اس کی بہت سی خرابیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ جہاں کسی

ایسے آدمی کو دیکھ لیتا تھا جس کے بارے میں اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ

اطالوی ہے، اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیتا تھا۔

اس کی شامت آئی تھی کہ اس روز اس نے برا بھلا کہنے کیلئے الکپون کو

ناڑ لیا۔ الکپون نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اس پر کوئی ہتھیار بھی

استعمال نہیں کیا۔ اس نے بس خاموشی سے آرتھر کو گردن سے پکڑ کر اس

کے اسٹول سے اٹھایا اور مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اپنے خیال

میں تو اس نے آرتھر کو جان سے ہی مار دیا تھا۔

بعد میں جب آرتھر کو اسپتال پہنچایا گیا تو کچھ ڈاکٹر بھی اسے

مردہ ہی سمجھتے رہے۔ پھر اس میں زندگی کی رقع محسوس ہوئی تو اسکی جان

بچانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اسے کئی ہفتے اسپتال میں گزارنے

پڑے۔

پولیس کی طرف سے الکپون کو کسی مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ

ایسے معاملات میں لوگ جانتے بوجھتے بھی انجان بن جاتے تھے۔ اول

تو لوگ جانے وقوعہ سے ہی غائب ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی موجود بھی رہتا

تھا تو ظاہر ہے وہ کسی بھی قسم کی گواہی کے چکر میں ہرگز نہیں پڑتا تھا۔ کسی

سے بھی پوچھا گیا تو اس نے یہی کہا کہ اسے تو کچھ معلوم نہیں، اس نے تو

کچھ دیکھا ہی نہیں۔

یوں پولیس کی طرف سے تو الکپون جیسے لوگوں کی جان بچ جاتی تھی

لیکن کوئی بھی گروہ اپنے مخالف یا حریف گروہ کے ساتھ کچھ کرتا تھا تو

اسے اس کا نتیجہ تو بھگتنا پڑتا تھا۔ اپنے حساب وہ خوب برابر کرتے

تھے۔ الکپون نے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد اسے ہی ہان کے گروہ کے

عقاب کا سامنا تھا۔

ی ہان سے زیادہ اس کا نائب ولیم خطرناک تھا۔ آئرش لوگوں کے

گروہ، جو وائٹ پینڈ کے نام سے جانے جاتے تھے، ان میں سب بھی

ولیم کی دہشت تھی اور دوسرا کوئی عام آدمی، جس میں ڈرا سی بھی محفل

ہوئی، وہ چند لمحے اس کے قریب رہنے کے بعد اس سے خوف کھانے لگتا

تھا۔ اس میں ایسی کوئی بات تھی جو دوسروں کو خوفزدہ کر دیتی تھی۔

حالانکہ دیکھنے میں اس کی شخصیت میں خوفزدہ کروینے والی کوئی بات

نہیں تھی۔ وہ خوفناک شکل صورت کا کوئی ٹیم ٹیم آدمی نہیں تھا۔ اس کا قد

صرف ساڑھے پانچ فٹ اور وزن ڈیڑھ سو پونڈ تھا۔ وہ کافی حد تک

نازک سا آدمی لگتا تھا لیکن وہ پہلی عالمگیر جنگ میں خدمات انجام دے

چکا تھا اور اسے بہادری کا ایک نمونہ بھی ملتا تھا جو سروس کراس کہلاتا تھا۔

فوج میں اس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے موت

کے منہ میں کود پڑتا تھا اور اپنی اسی خصوصیت کے تحت اس نے ایک

بڑے حملے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس کی موجودگی میں اس کے دوست اور ہم نوا بھی دبے قدموں چلتے

تھے۔ اسکے غصے سے سب خوف کھاتے تھے۔ اس کے بارے میں کہا

جاتا تھا کہ ایک بار اس نے صرف اس لئے ایک آدمی کو گولی مار دی تھی کہ

وہ بلی کی دم کھینچ رہا تھا۔ انسان کا خون بہانے میں تو وہ ایک لمحے کی تاخیر

نہیں کرتا تھا لیکن کمزور اور چھوٹے جانوروں کو وہ تکلیف میں نہیں دیکھ

# الکپون

جرم کے بادشاہ کو انتہائی دلچسپے داستان

وہ اپنے جرم کا ہر ثبوت سے مستادیتا تھا

کے "بہت بڑا" آدمی بن گیا تو جب بھی اس کا نیویارک چکر لگتا تھا، وہ

یہاں گالج کی خدمات باڈی گارڈ کے طور پر حاصل کرتا اور اسے سوڈا

یوم کے حساب سے معاوضہ ادا کرتا۔

بعد میں تو اسے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ غلطی اس کی اپنی تھی۔ ایک

بھائی کے سامنے اس کی سب کے بارے میں بیہودہ بات کرنا بہر حال

ایک غلطی تھی۔ اس نے گالج کے سامنے اپنی اس غلطی کا اعتراف بھی

کر لیا۔

اس کے چہرے پر ذمہ کے نشان وقت کے ساتھ ساتھ کافی ہلکے پڑ

گئے تھے لیکن بہر حال نظر آتے تھے۔ ان کی وجہ سے اسکی عرفیت

"اسکار فیس" ہو گئی تھی۔ یعنی ایسا آدمی جس کے چہرے پر ذمہ کا نشان

ہو۔ پیٹھ پیچھے اسے لوگ اس نام سے بھی پکارتے تھے۔ ذمہوں کے ان

نشانات کے بارے میں بعد میں اس نے کہا کہ لکھنؤ کی تھی کہ وہ اسے پہلی

جنگ عظیم کے دوران آئے تھے، وہ اس بنا لین میں شامل تھا جو "گمشدہ

بنالین" کے نام سے مشہور ہوئی تھی کیونکہ اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ

اس کا کیا بنا اور وہ کہاں گئی لیکن بعد میں اس کے کچھ فوجی زندہ واپس

آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جب لوگ الکپون کے ساتھ پیش آنے والے اصل واقعے کو بھول

بھال چکے تھے یا وہ ان لوگوں کے درمیان ہوتا تھا جنہیں اس واقعے کے

بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا، تو وہ اطمینان سے یہ قصہ سنایا کرتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ وہ بھی فوج میں گیا ہی نہیں تھا۔ وہ جبری بھرتی کی زد میں

بھی نہیں آیا تھا۔

بہر حال گالج کے ہاتھوں اس کے ڈھی ہونے کی وجہ سے تیل کی نظر

میں اس کا مقام اور قدر و منزلت کم نہیں ہوئی تھی۔ اسکے مزاج کی تیزی

نے بھی اسے تیل کی نظر میں ناپسندیدہ نہیں بنایا۔ تیل اسے اپنا ایک

ہونہار شاعر گرد سمجھتا تھا۔ اسی زمانے میں الکپون کے ہاتھوں دو قتل بھی

ہو گئے۔ تب بھی تیل کی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ اس کے خیال میں

شاید یہ سب باتیں خامیاں نہیں، خوبیاں تھیں۔ خاص طور پر اسلئے بھی کہ

قتل کی دونوں وارداتوں کے سلسلوں میں الکپون پکڑا نہیں گیا تھا۔ یہ

اس کے "فنکارانہ" ہونے کی دلیل تھی اور تیل کے خیال میں وہ لوگ جس

قسم کے کاروبار کر رہے تھے، ان میں ایسے ہی "فنکاروں" کی ضرورت

تھی۔

قتل کی ان دونوں وارداتوں میں سے صرف ایک کے بارے میں

شواہد دستیاب ہیں۔ دوسرے کی تفصیلات اندھیرے ہی میں رہ گئیں۔

جس قتل کے بارے میں، اپنی سناٹی باتوں کے ذریعے کچھ ریکارڈ سامنے

آتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الکپون سوچ سمجھ کر نہایت خنڈے

دل سے بھی کسی کو قتل کرنے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ صرف وقتی اشتعال کے

تحت آگ بگولا ہو کر ہی کسی کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا تھا۔

ہو یا یہ کہ علاقے کا ایک آدمی جو غے میں پندرہ سو ڈالر جیت گیا۔ اس

زمانے میں پندرہ سو ڈالر بہت بڑی رقم تھی۔ حتیٰ کہ الکپون کے لئے بھی

یہ کوئی چھوٹی رقم نہیں تھی۔ اوپر سے اتنی بڑی رقم جیت کر وہ گویا

"ہارورڈ" کو بھی نقصان پہنچا کر جا رہا تھا جہاں اوپر کی منزل پر جوا

لھایا جاتا تھا۔

الکپون اس شخص کے پیچھے پیچھے باہر چلا گیا اور جب وہ ایک تاریک

سکلی سے گزرنے لگا تو الکپون نے آگے بڑھ کر اس کی پسیلیوں پر گن رکھ

دی اور رقم اس سے لے لی۔

اس شخص نے رقم تو دیدی لیکن ساتھ ہی بول اٹھا۔ "یہ تم اچھا نہیں کر

رہے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس کی آواز غم و غصے سے

لبریز تھی۔

تب الکپون نے ایک لفظ کہے بغیر ٹھہر کر بادیا۔

بعد میں اس نے تیل کے سامنے گویا صفائی پیش کرتے ہوئے پرزور

انداز میں کہا۔ "اس احمق کو ایسی بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔ اگر وہ مجھے

پکچھاتا تھا تو اسے چپ رہنا چاہئے تھا۔ بعد میں وہ میرے خلاف گواہی

دے سکتا تھا اور پولیس کے سامنے مجھے شکایت کر سکتا تھا..... لیکن

میرے سامنے بکواس کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ میں یہ جاننے کے

بعد بھلا اسے کیسے زندہ چھوڑ سکتا تھا کہ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے؟

میں اسے چھوڑ کر گویا خود اپنی گرفتاری کا سامان کر لیتا۔ وہ احمق تھا۔ میں

تو احمق نہیں تھا۔ وہ خود اپنی غلطی کی وجہ سے مارا گیا۔ میرا اس میں کوئی

قصور نہیں۔ میرے لئے اس کو گولی مارنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا

تھا۔"

یہ اس کا دلیل دینے کا انداز تھا۔

تیل نے اس سے اتفاق کیا۔ اس کے لئے تو شاید یہ خوشی کی بات تھی

کہ الکپون قتل کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ ان کے کاروبار میں قتل کرنے

کے قابل ہونا گویا "اضافی کوالیفیکیشن" تھی۔ الکپون سے اس سلسلے میں

پوچھ گچھ کرنے کی غرض سے پولیس ضرور آئی مگر اس سے آگے کچھ نہیں

ہوا۔ ظاہر ہے، کسی نے کچھ دیکھا نہیں تھا، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ موقع

کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ الکپون صاف بچ گیا۔ اس بات کی تیل کو اور بھی

زیادہ خوشی ہوئی۔

☆.....☆.....☆

1918ء میں ایک ڈانس ہال میں الکپون کی ملاقات ایک آئرش

لڑکی سے ہوئی اور وہ اسکی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وہ بھی بے پناہ

خوبصورت۔ چہرہ پر جسم گردش نشیب و فراز، بیوی چہرہ، گلاب کی سی

رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، سنہرے بال..... اُسے دیکھتے ہی الکپون کا

گینگ لیڈر یا گروہوں کے سردار اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ باڈی گارڈز

لے کر ضرور چلتے تھے لیکن ولیم 1920ء میں ہی ہان کے قتل کے بعد

جب اپنے گینگ کا لیڈر بن گیا تب بھی وہ اکیلا ہی ہر جگہ آ جاتا تھا۔ وہ

اپنے پاس ریوالور ضرور رکھتا تھا۔ یہ تو ایک طرح سے اس کی عادت بن

چکی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ محض ٹیڑھی نظر سے دیکھنے پر بھی کسی کو

پلک جھپکتے میں گولی مار سکتا تھا۔ وہ واقعی ایک خطرناک آدمی تھا اور عدم

ثبوت کی بناء پر چونکہ اسے کبھی کوئی سزا نہیں مل سکی تھی، اسلئے وہ زیادہ

بے خوف ہو گیا تھا۔ بے خوفی کے اس احساس نے اسے زیادہ خطرناک

بنا دیا تھا۔

آخر، جس کا الکپون نے مار مار کر کچھ نکال دیا تھا، اپنے گروہ میں

کوئی اہم آدمی تو نہیں تھا، پھر بھی ولیم کے لئے یہ بات ناقابل برداشت

تھی کہ کوئی اطالوی ان کے کسی آدمی کو مار مار کر اسپتال پہنچا دے جہاں

وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں جھلا ہو۔ اطالویوں کو وہ ویسے ہی گھسیا اور

حقیر سمجھتے تھے۔

اس واقعے پر ولیم کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ

الکپون کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ٹیم

ٹیم ساوہ نو جوان کون تھا جو آرتھر کی ہڈی پہلی ایک کر کے رخصت ہو گیا

تھا۔ تاہم ولیم کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تیل کا آدمی تھا۔ صرف یہ معلوم

کرنا کافی تھا کہ وہ تیل کا کون سا آدمی تھا؟

جلدی ہی تیل کو پتہ چل گیا کہ ولیم نے اپنے آدمیوں کو اس آدمی کی

شناخت کی خصوصی ہم پر لگا دیا ہے۔ تیل کو معلوم تھا کہ چہرے پر ذمہوں

کے نشانات کی وجہ سے الکپون کو پہچاننا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اسکی

نشاندہی میں زیادہ دن نہیں گئے تھے اور پھر اس کا پتہ بہت مشکل تھا۔

اسکے بعد شاید خونریزی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔ موت گویا

الکپون کے تعاقب میں تھی۔ اب الکپون اکیلا بھی نہیں تھا۔ وہ شادی

شدہ اور ایک بچے کا باپ تھا۔

تیل نے اس مسئلے پر خنڈے دل سے غور کیا۔ وہ الکپون کو بہت پسند

کرتا تھا اور اسے خواہ مخواہ موت کے منہ میں جانے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخر

اسے جان نوریو کا خیال آیا جو شکاگو چکا تھا اور وہاں اپنا "کاروبار" جما

چکا تھا۔ الکپون اس کی نظر میں بھی اچھا اور بھروسے کا آدمی تھا۔ ایسے

نوجوان کے لئے نوریو آسانی سے شکاگو میں بھی اپنے ہاں جگہ نکال سکتا

تھا۔ الکپون جیسے نوجوان کے لئے تو تیل اور نوریو جیسے لوگوں کے پاس

ہمیشہ ہی جگہ موجود رہتی تھی۔

چنانچہ تیل نے الکپون کو شکاگو بھیجے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ

وہ ایک دوسرا شکاگو میں رہے گا تو معاملہ خنڈا پڑ جائے گا۔ ولیم اس کی

علاش ترک کر دیا اور اس بات کو بھول بھال جانے لگا۔ اس کا غصہ خنڈا

پڑ جائے گا۔ جب الکپون کو واپس بلوایا جائے گا۔



امریکا کے کسی اور شہر میں جوئے کا اتنا رواج نہیں تھا جتنا شکاگو میں تھا۔ یہی صورت حال جسم فروشی کے دھندے کی تھی۔ قانونی طور پر تو یہ دھندہ بھی

معاشرے میں بھی شریف اور اچھے لوگ کمر ختم نہیں ہو جاتے۔ دیانتداری بالکل ہی تابعدار نہیں ہو جاتی۔ معاشرے میں کچھ نہ کچھ لوگ ہر دور میں، ہر حال میں اصلاح کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسے لوگ



نہ ہوں تو شاید شکاگو جیسے شہر بالکل ہی جاہ و برہاد ہو جائیں، صفحہ ہستی سے مٹ جائیں۔

ایسے ہی لوگوں نے میسز کی خدمت میں وہ فہرست پیش کی تھی لیکن میسز کاٹی دونوں تک ان جوئے خانوں کو بند کرنے کے سلسلے میں کچھ بھی نہ کر پایا۔ جب اس سلسلے میں اس پر شرفاء کا دباؤ بڑھا تو اس نے ذرا شرماتے ہوئے ایک اجلاس میں اعتراف کیا۔ ”ان میں سے کئی جو خانے میری ہی اجازت سے کھلے ہیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ لوگوں کی کتنی بڑی اکثریت اس قسم کی تفریح گاہوں کی حامی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے پاس ارد گرد کے چھوٹے شہروں اور گاؤں دیہات سے کاروباری مہمان آتے ہیں جو شہر کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ ان مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے اسی طرح کی تفریح گاہوں میں لے جاتے ہیں۔ اگر اس قسم کے اڈے بند ہو گئے تو ان کے پاس اپنی تفریح اور مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔ شہر کی معاشی ترقی پر بہت برا اثر پڑے گا اور پھر خود ان ٹھکانوں سے نہ جانے کتنے لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔ ہمیں ہر پہلو کے بارے میں سوچنا ہوتا ہے۔“

پھر میسز نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد معذرت خواہانہ انداز میں مزید کہا۔ ”حضرات! ہمیں حقیقت پسند کر سونا ہوگا۔ شہر، کاروباری اور تفریحی مراکز ہی کے سر پر ترقی کرتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں اور وسعت اختیار کرتے ہیں، عبادت گاہوں کے سر پر نہیں۔“

شرفاء اور معززین بچکارے اس میسز کو اپنا حامی اور ہم نوا سمجھتے تھے مگر اب اس کے بھی خیالات بدل گئے تھے۔ معلوم نہیں پہلے ہی سے اس کے اصل خیالات ایسے تھے یا میسز کی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد تبدیل ہوئے تھے۔ شاید اس دوران اسے بھی کوئی چاٹ لگ گئی ہو جس نے اس کے نظریات میں انقلاب برپا کر دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے سیلاب کے سامنے خود کو بے بس محسوس کیا ہو اور حالات سے سمجھوتا کر لینا ہی بہتر سمجھا ہو۔

اصلاح پسند اس بات پر حیران ہوتے رہتے تھے کہ انہیں سیاست میں کامیابی کیوں حاصل نہیں ہوتی اور وہ اہم عہدوں پر اپنے آؤی لانے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتے۔ جبکہ یہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر آدمی معاشرے میں اصلاح چاہتا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ اصلاح پسندوں کو ووٹ بہت کم لوگ دیتے تھے۔ گھوم پھر کر برے اور کپٹ لوگ ہی آگے آ جاتے تھے۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب، مثنی سار تاریخی عمل تھا۔ الگپن کے شکاگو میں قدم رکھنے سے پہلے شہر ہی عمل سے گزر رہا تھا۔ وہ جب آیا تو فضا اس کیلئے خوب سازگار تھی۔

ساجیات کے ایک مؤرخ نے ان حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”لوگوں کے سامنے جب ووٹ دینے کا مرحلہ آتا ہے تو ان کے سامنے دو حقیقت معاشرے کی اصلاح سے زیادہ اہم سوال آن کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنے لئے یا اپنے بھائی اور بیٹے کے لئے تو لڑی درکار ہوتی ہے۔ کسی کو اپنی بیمار ماں کو علاج کے لئے اسپتال میں داخل کرانا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے بچے کو پڑھانا چاہتا ہے۔ لوگ بار بار دھوکا کھانے کے باوجود اسی قسم کے مسائل کے حل کیلئے ووٹ دیتے رہتے ہیں اور مسائل ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔“

دوسری طرف الگپن نے ایک مرتبہ کسی سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”کوئی بھی انسان سو فیصد دیانتدار یا سو فیصد قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا باپ، بھائی یا بہن مصیبت میں ہو تو آپ کیا کرتے ہیں؟ اگر آپ کو اسے مصیبت سے نکالنے کے لئے تھوڑی سی بے اصولی، تھوڑی سی بے ایمانی یا تھوڑی سی خلاف قانون حرکت کرنی پڑے تو آپ ضرور کریں گے۔ اگر آپ اسے مصیبت سے نکالنے کی تدبیر نہیں کریں گے تو دنیا آپ کو خود غرض، بے حس اور نہ جانے کیا کچھ کہے گی۔ لوگ کہیں گے، آپ کا خون سفید ہو گیا ہے۔ آپ خود اپنی نظر میں بھی گر جائیں گے۔ چنانچہ کسی شخص کو یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ سو فیصد ایماندار یا سو فیصد پابند قانون ہے۔ جب مسئلہ اپنے مفاد یا خون کے رشتوں کا آتا ہے تو سب باتیں دھری رہ جاتی ہیں۔ انسان کا طرز عمل بالکل مختلف ہوتا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح ایماندار، راست باز اور با اصول وغیرہ ہی سمجھ رہا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے دنیا کے سو فیصد انسان ایسے نہ ہوں لیکن نانوے اعشاریہ نانوے فیصد ایسے ہی ہوتے ہیں اور دنیا کا نظام بہر حال اکثریت کے سر پر چل رہا ہے۔“

ایک اور موقع پر الگپن نے کہا۔ ”میں حالات کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں اس کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ میں آگے بڑھ کر اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھالنا ہوں۔ پیچھے نہیں ہٹتا۔“

الگپن کو اس قائل بنانے میں ایک شخص کا کردار خاصا اہم تھا۔ اس کا نام جم کوکس تھا۔ وہ دس سال کی عمر میں امریکا آیا تھا اور شکاگو کے ایک غریبانہ سے علاقے میں رہنے لگا تھا جسے ”فرسٹ وارڈ“ کہا جاتا تھا۔ لڑکپن میں جم نے جوتے پالش کئے، اخبار بیچے اور ریلوے لائن بچھانے والے مزدوروں کے لئے پانی کی پالٹیاں لے کر جاتا رہا۔

قدرتی طور پر بھی اس کی اٹھان اچھی تھی اور پھر سخت مشقت نے اسے ایک مضبوط لوجوان بنا دیا۔ اس کا جسم دروڑھی، کندھے چوڑے اور قد لمبا تھا۔ اس لئے اسے ”بگ جم“ کہہ کر بھی پکارا جاتا تھا۔ وہ ایک وجہہ آدمی تھا۔ موٹی موٹی مونچھوں کی وجہ سے بارہب بھی دکھائی دیتا تھا۔ تاہم خوش مزاج تھا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔

اس میں آگے بڑھنے اور دولت کمائے کی بڑی تگہ تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ایک ”ماہرین“ قسم کا کپڑا بن چکا تھا۔ صرف یہی نہیں، اس نے چھ ایسی عورتیں بھی تلاش کر لی تھیں جو اسے پسند کرتی تھیں لیکن وہ ان سے جسم فروشی کا دھندہ نہ کرانے لگا تھا۔ کچھ عرصہ اس نے اطالویوں کے بلیک بینڈ کھلانے والے گروہوں کے لئے بہت جمع کرنے کا کام بھی کیا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ اس پر اصلاح اور خاکساری کا دورہ پڑا یا اسے قانون کا خوف محسوس ہونے لگا۔ بہر حال وہ گلیوں میں جھاڑو دینے والے مجدداروں یا خاکوہوں میں شامل ہو گیا۔ ان میں زیادہ تر اطالوی تھے اور سفید رو دی پکین کر کام کرتے تھے۔

بگ جم کی رہنمائی میں وہ کھیل کود اور صحت مندانہ مشاغل میں بھی حصہ لینے لگے۔ جم نے جلد ہی ان کا ایک کلب اور ایک یونین بھی بنا ڈالی۔ یہ 1897ء کا ذکر ہے۔ بگ جم کی عمر اس وقت 26 سال تھی۔ خاکوہوں کی ایک بڑی تعداد اس کے پیچھے تھی اور اس کے کہنے پر چلتی تھی۔ یہ گویا اس کے ”کچے ووٹ“ تھے۔ اس نے یہ ووٹ کف لین اور کینا کے لئے مخصوص کر دیئے تھے جو انکیشن جیت کر علاقے کے ایڈمنسٹریٹرن بن گئے۔

انہوں نے اس سیاسی خدمت کے عوض بگ جم کو پولیس کاپٹین اور ایک پولیس انکیشن کا انچارج بنا دیا۔ یوں اگر دیکھا جائے تو بگ جم کی زندگی میں بہت جلدی جلدی بڑے دلچسپ اتار چڑھاؤ آئے۔ کبھی اس

نہ ہوں تو شاید شکاگو جیسے شہر بالکل ہی جاہ و برہاد ہو جائیں، صفحہ ہستی سے مٹ جائیں۔

ایسے ہی لوگوں نے میسز کی خدمت میں وہ فہرست پیش کی تھی لیکن میسز کاٹی دونوں تک ان جوئے خانوں کو بند کرنے کے سلسلے میں کچھ بھی نہ کر پایا۔ جب اس سلسلے میں اس پر شرفاء کا دباؤ بڑھا تو اس نے ذرا شرماتے ہوئے ایک اجلاس میں اعتراف کیا۔ ”ان میں سے کئی جو خانے میری ہی اجازت سے کھلے ہیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ لوگوں کی کتنی بڑی اکثریت اس قسم کی تفریح گاہوں کی حامی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے پاس ارد گرد کے چھوٹے شہروں اور گاؤں دیہات سے کاروباری مہمان آتے ہیں جو شہر کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ ان مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے اسی طرح کی تفریح گاہوں میں لے جاتے ہیں۔ اگر اس قسم کے اڈے بند ہو گئے تو ان کے پاس اپنی تفریح اور مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔ شہر کی معاشی ترقی پر بہت برا اثر پڑے گا اور پھر خود ان ٹھکانوں سے نہ جانے کتنے لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔ ہمیں ہر پہلو کے بارے میں سوچنا ہوتا ہے۔“

پھر میسز نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد معذرت خواہانہ انداز میں مزید کہا۔ ”حضرات! ہمیں حقیقت پسند کر سونا ہوگا۔ شہر، کاروباری اور تفریحی مراکز ہی کے سر پر ترقی کرتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں اور وسعت اختیار کرتے ہیں، عبادت گاہوں کے سر پر نہیں۔“

شرفاء اور معززین بچکارے اس میسز کو اپنا حامی اور ہم نوا سمجھتے تھے مگر اب اس کے بھی خیالات بدل گئے تھے۔ معلوم نہیں پہلے ہی سے اس کے اصل خیالات ایسے تھے یا میسز کی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد تبدیل ہوئے تھے۔ شاید اس دوران اسے بھی کوئی چاٹ لگ گئی ہو جس نے اس کے نظریات میں انقلاب برپا کر دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے سیلاب کے سامنے خود کو بے بس محسوس کیا ہو اور حالات سے سمجھوتا کر لینا ہی بہتر سمجھا ہو۔

اصلاح پسند اس بات پر حیران ہوتے رہتے تھے کہ انہیں سیاست میں کامیابی کیوں حاصل نہیں ہوتی اور وہ اہم عہدوں پر اپنے آؤی لانے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتے۔ جبکہ یہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر آدمی معاشرے میں اصلاح چاہتا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ اصلاح پسندوں کو ووٹ بہت کم لوگ دیتے تھے۔ گھوم پھر کر برے اور کپٹ لوگ ہی آگے آ جاتے تھے۔ یہ تاریخ کا ایک عجیب، مثنی سار تاریخی عمل تھا۔ الگپن کے شکاگو میں قدم رکھنے سے پہلے شہر ہی عمل سے گزر رہا تھا۔ وہ جب آیا تو فضا اس کیلئے خوب سازگار تھی۔

ساجیات کے ایک مؤرخ نے ان حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”لوگوں کے سامنے جب ووٹ دینے کا مرحلہ آتا ہے تو ان کے سامنے دو حقیقت معاشرے کی اصلاح سے زیادہ اہم سوال آن کھڑے ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنے لئے یا اپنے بھائی اور بیٹے کے لئے تو لڑی درکار ہوتی ہے۔ کسی کو اپنی بیمار ماں کو علاج کے لئے اسپتال میں داخل کرانا ہوتا ہے۔ کوئی اپنے بچے کو پڑھانا چاہتا ہے۔ لوگ بار بار دھوکا کھانے کے باوجود اسی قسم کے مسائل کے حل کیلئے ووٹ دیتے رہتے ہیں اور مسائل ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔“

دوسری طرف الگپن نے ایک مرتبہ کسی سے بات کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”کوئی بھی انسان سو فیصد دیانتدار یا سو فیصد قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا باپ، بھائی یا بہن مصیبت میں ہو تو آپ کیا کرتے ہیں؟ اگر آپ کو اسے مصیبت سے نکالنے کے لئے تھوڑی سی بے اصولی، تھوڑی سی بے ایمانی یا تھوڑی سی خلاف قانون حرکت کرنی پڑے تو آپ ضرور کریں گے۔ اگر آپ اسے مصیبت سے نکالنے کی تدبیر نہیں کریں گے تو دنیا آپ کو خود غرض، بے حس اور نہ جانے کیا کچھ کہے گی۔ لوگ کہیں گے، آپ کا خون سفید ہو گیا ہے۔ آپ خود اپنی نظر میں بھی گر جائیں گے۔ چنانچہ کسی شخص کو یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ سو فیصد ایماندار یا سو فیصد پابند قانون ہے۔ جب مسئلہ اپنے مفاد یا خون کے رشتوں کا آتا ہے تو سب باتیں دھری رہ جاتی ہیں۔ انسان کا طرز عمل بالکل مختلف ہوتا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کی طرح ایماندار، راست باز اور با اصول وغیرہ ہی سمجھ رہا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے دنیا کے سو فیصد انسان ایسے نہ ہوں لیکن نانوے اعشاریہ نانوے فیصد ایسے ہی ہوتے ہیں اور دنیا کا نظام بہر حال اکثریت کے سر پر چل رہا ہے۔“

ایک اور موقع پر الگپن نے کہا۔ ”میں حالات کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں اس کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ میں آگے بڑھ کر اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھالنا ہوں۔ پیچھے نہیں ہٹتا۔“

الگپن کو اس قائل بنانے میں ایک شخص کا کردار خاصا اہم تھا۔ اس کا نام جم کوکس تھا۔ وہ دس سال کی عمر میں امریکا آیا تھا اور شکاگو کے ایک غریبانہ سے علاقے میں رہنے لگا تھا جسے ”فرسٹ وارڈ“ کہا جاتا تھا۔ لڑکپن میں جم نے جوتے پالش کئے، اخبار بیچے اور ریلوے لائن بچھانے والے مزدوروں کے لئے پانی کی پالٹیاں لے کر جاتا رہا۔

قدرتی طور پر بھی اس کی اٹھان اچھی تھی اور پھر سخت مشقت نے اسے ایک مضبوط لوجوان بنا دیا۔ اس کا جسم دروڑھی، کندھے چوڑے اور قد لمبا تھا۔ اس لئے اسے ”بگ جم“ کہہ کر بھی پکارا جاتا تھا۔ وہ ایک وجہہ آدمی تھا۔ موٹی موٹی مونچھوں کی وجہ سے بارہب بھی دکھائی دیتا تھا۔ تاہم خوش مزاج تھا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔

اس میں آگے بڑھنے اور دولت کمائے کی بڑی تگہ تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ایک ”ماہرین“ قسم کا کپڑا بن چکا تھا۔ صرف یہی نہیں، اس نے چھ ایسی عورتیں بھی تلاش کر لی تھیں جو اسے پسند کرتی تھیں لیکن وہ ان سے جسم فروشی کا دھندہ نہ کرانے لگا تھا۔ کچھ عرصہ اس نے اطالویوں کے بلیک بینڈ کھلانے والے گروہوں کے لئے بہت جمع کرنے کا کام بھی کیا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ اس پر اصلاح اور خاکساری کا دورہ پڑا یا اسے قانون کا خوف محسوس ہونے لگا۔ بہر حال وہ گلیوں میں جھاڑو دینے والے مجدداروں یا خاکوہوں میں شامل ہو گیا۔ ان میں زیادہ تر اطالوی تھے اور سفید رو دی پکین کر کام کرتے تھے۔

بگ جم کی رہنمائی میں وہ کھیل کود اور صحت مندانہ مشاغل میں بھی حصہ لینے لگے۔ جم نے جلد ہی ان کا ایک کلب اور ایک یونین بھی بنا ڈالی۔ یہ 1897ء کا ذکر ہے۔ بگ جم کی عمر اس وقت 26 سال تھی۔ خاکوہوں کی ایک بڑی تعداد اس کے پیچھے تھی اور اس کے کہنے پر چلتی تھی۔ یہ گویا اس کے ”کچے ووٹ“ تھے۔ اس نے یہ ووٹ کف لین اور کینا کے لئے مخصوص کر دیئے تھے جو انکیشن جیت کر علاقے کے ایڈمنسٹریٹرن بن گئے۔

انہوں نے اس سیاسی خدمت کے عوض بگ جم کو پولیس کاپٹین اور ایک پولیس انکیشن کا انچارج بنا دیا۔ یوں اگر دیکھا جائے تو بگ جم کی زندگی میں بہت جلدی جلدی بڑے دلچسپ اتار چڑھاؤ آئے۔ کبھی اس

نہ ہوں تو شاید شکاگو جیسے شہر بالکل ہی جاہ و برہاد ہو جائیں، صفحہ ہستی سے مٹ جائیں۔

ایسے ہی لوگوں نے میسز کی خدمت میں وہ فہرست پیش کی تھی لیکن میسز کاٹی دونوں تک ان جوئے خانوں کو بند کرنے کے سلسلے میں کچھ بھی نہ کر پایا۔ جب اس سلسلے میں اس پر شرفاء کا دباؤ بڑھا تو اس نے ذرا شرماتے ہوئے ایک اجلاس میں اعتراف کیا۔ ”ان میں سے کئی جو خانے میری ہی اجازت سے کھلے ہیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ لوگوں کی کتنی بڑی اکثریت اس قسم کی تفریح گاہوں کی حامی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے پاس ارد گرد کے چھوٹے شہروں اور گاؤں دیہات سے کاروباری مہمان آتے ہیں جو شہر کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ ان مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے اسی طرح کی تفریح گاہوں میں لے جاتے ہیں۔ اگر اس قسم کے اڈے بند ہو گئے تو ان کے پاس اپنی تفریح اور مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔ شہر کی معاشی ترقی پر بہت برا اثر پڑے گا اور پھر خود ان ٹھکانوں سے نہ جانے کتنے لوگوں کا روزگار وابستہ ہے۔ ہمیں ہر پہلو کے بارے میں سوچنا ہوتا ہے۔“

پھر میسز نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد معذرت خواہانہ انداز میں مزید کہا۔ ”حضرات! ہمیں حقیقت پسند کر سونا ہوگا۔ شہر، کاروباری اور تفریحی مراکز ہی کے سر پر ترقی کرتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں اور وسعت اختیار کرتے ہیں، عبادت گاہوں کے سر پر نہیں۔“

نے جوتے پالش کئے، کبھی اخبار بیچے، کبھی مزدوروں کے لئے پانی کی پالٹیاں اٹھا کر چکر لگائے، کبھی جھینس کا کٹیں، کبھی عورتوں کا دلال رہا، کبھی خاکروب بن گیا اور آخر میں پولیس آفیسر!

ایک بار پھر اس کی ترقی کا دور شروع ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک ذاتی پول ہال کھول لیا۔ اس کے علاوہ ایڈمنسٹریٹرن کے لئے جسم فروشی کے اڈوں، جوا خانوں اور اس طرح کے دوسرے ٹھکانوں کے ”نذرانہ“ جمع کرنے کی خدمت بھی انجام دینے لگا۔ ہر جگہ کی مناسبت سے ان نذرانوں کے باقاعدہ نرخ مقرر تھے۔

جسم فروشی کے اڈے چلانے والی خواتین جو عام طور پر ”میڈم“ کہلاتی تھیں بڑی خوشدلی سے اسے ہفتہ وار یا ماہانہ نذرانہ دیتی تھیں کیونکہ وہ اسے ذاتی حیثیت میں بھی پسند کرتی تھیں۔ وہ جس اڈے پر بھی چلا جاتا تھا وہاں کچھ دیر کے لئے خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور وقت ہی ہو جاتی تھی۔

ایسے ہی ایک اڈے کی میڈم سے اس نے 1902ء میں شادی کر لی جس پر سب کو حیرت ہوئی۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے کیا دیکھ کر اس سے شادی کی تھی۔ بے کیف سے چہرے اور بے کشش سے خدو خال والی وہ عورت اس سے چھ سال بڑی تھی جبکہ کتنی ہی حسین اور نوجوان لڑکیاں بگ جم پر مرتی تھیں۔

بہر حال، جہاں تک مرنے کا سوال تھا، تو یہ عورت بھی بگ جم پر جان چھڑکتی تھی۔ شادی کے بعد بگ جم نے اس کے اڈے کے دروازے پر اس کے نام کی تختی لگوا دی۔ اب وہ بے خطر اپنا دھندہ چلا سکتی تھی۔ آخر وہ علاقے کے پولیس آفیسر کی بیوی تھی! اس کا نام وکنور یہ تھا۔

شاید بعد میں لوگوں کی سمجھ میں آ گیا ہو کہ وکنور یہ کی شکل میں بگ جم نے حقیقت ”ترقی“ کا ایک اور راستہ تلاش کیا تھا۔ جلد ہی میڈم وکنور یہ کے دو اڈے ہو گئے اور خود بگ جم نے بھی ایک اور پول ہال کھول لیا جو ایک طرح کا سیلون بھی تھا۔ دوسری طرف میڈم وکنور یہ کے تعاون سے وہ جسم فروشی کے دھندے کو گویا ”پرچون“ سے ہول سیل یا ٹھوک کی طرح پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ معاشی کو زیادہ سے زیادہ سستی کرنے کی فکر میں رہتا تھا تا کہ غریب لوگ بھی اپنے ارمان نکال سکیں۔ اس کے خیال میں یہ بھی غریبوں کی خدمت کا ایک طریقہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک دو ڈالر جیب میں ڈال کر آنے والا بھی مایوس اور محروم واپس نہ جائے۔

اس قسم کے اڈوں پر آنے والے تازہ گلاب بھی عموماً پانچ سات سال میں اپنی تازگی اور مہک کھو دیتے تھے۔ اس طرح کی عورتیں پانچ سات سال بعد گلیوں میں دھکے کھاتی تھیں۔ ”اسٹریٹ واکر“ کہلاتی تھیں اور اپنے لئے خود خریدار تلاش کرتی تھیں۔ یہ گویا ان کا ”ریناٹمنٹ“ کا زمانہ ہوتا تھا۔

بگ جم کوشش کرتا تھا کہ نئے گلاب تو آتے رہیں لیکن پرانے اور مر جھانے ہوئے گلابوں میں سے بھی جو ذرا بہتر حالت میں ہوں، انہیں گلی میں نہ پھینکا جائے بلکہ ان کے دام گرا کر انہیں بھی وہیں رہنے دیا جائے۔ گلیوں میں پھرتے ہوئے میڈم وکنور یہ کے ہر کارے ان گلابوں کی تعریف میں، متوجہ گاہکوں کے سامنے زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ یہ ہر کارے عرف عام میں تو دلال ہی کہلاتے تھے لیکن ازراہ عزت افزائی انہیں ”کیڈٹ“ کہا جاتا تھا۔

ان دنوں اس قسم کی ”دورنک“ کہانیاں چھاپنا اخبارات کا محبوب مشغلہ تھا کہ چند روزہ سال کی ایک لڑکی سیر کرنے کا ڈس سے شہر آئی، یہاں کسی نوجوان نے اسے اپنی نیچے دار باتوں میں الجھایا، شادی کے وعدے وعید کے اور پھر شرب میں کوئی نشہ آرو دو پلا دی جس کے بعد لڑکی کو کوئی ہوش نہ رہا، آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو جسم فروشی کے اڈے پر پایا۔

اسے وہاں قید کر دیا گیا، لباس سے محروم کر دیا گیا۔ اسے روز مارا پیٹا جاتا اور کھانے پینے کو کچھ نہ دیا جاتا۔ اس کی عزت لوٹ لی گئی اور اسے جسم فروشی پر مجبور کیا جاتا رہا مگر وہ صراحت کرتی۔ آخر ایک روز موقع پا کر وہ کسی کھڑکی کی جھری سے کوئی تھہر پھینکتے میں کامیاب ہو گئی جسے کسی ٹیک دل راہ گیر نے کسی اچھے پولیس آفیسر یا پھر اس کے گھر والوں تک پہنچا دیا جس کے بعد اس عذاب سے اس کی رہائی ممکن ہوئی۔

اخبارات میں آنے والے تھوڑے بہت روز بدل کے ساتھ اس قسم کی کہانیاں چھپا کرئیں۔ درودند لوگ دل پر ہاتھ رکھ کر انہیں پڑھتے اور دیر تک بخندنی آپن بھرا کرتے۔ 1913ء میں ریاست الی نوئے کی ایک سینیٹ کمیٹی نے ان اسباب و محرکات کے بارے میں تحقیق شروع کی جو لڑکیوں کو جسم فروشی کی طرف لے جاتے تھے۔ اس کمیٹی نے ایک پولیس آفیسر کا بھی انٹرویو کیا۔ اس پولیس آفیسر نے تیرہ سال تک شکاگو کے ایسے ہی علاقوں میں کام کیا تھا جہاں جسم فروشی کا دھندہ زوروں پر تھا۔

اس سے پوچھا گیا۔ ”تجربہ خیال میں کون سی چیز عورتوں کو جسم فروشی کی طرف لے جاتی ہے؟“

”غربت۔“ پولیس آفیسر کا مختصر جواب تھا۔

”کیا۔؟“ کمیٹی کے ایک رکن نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”کیا اس کی وجہ صرف غربت ہے؟“

”سر! بنیادی وجہ غربت ہی ہوتی ہے۔“ پولیس آفیسر نے اب بھی یقین سے جواب دیا۔ ”بعض اوقات دوسرے عوامل بھی شامل ہو جاتے ہیں لیکن اگر صحیح طور پر تجزیہ کیا جائے تو بنیادی وجہ ہی غربت ہوتی ہے۔ معاشی ضروریات۔ مجبوریات۔ اور ایسے عالم میں کوئی راستہ دکھائی نہ دینا۔ آخر کار ایک راستہ نظر آ جاتا ہے۔ یا کوئی دکھا دیتا ہے۔“

”اسکے علاوہ دوسرے عوامل کیا ہو سکتے ہیں؟“

”آسائش کی خواہش۔ اچھا لباس پہننے، اچھی اچھی جھپکوں پر گھونٹنے پھرنے اور دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کی تمنا۔ شادی کے چھوٹے وعدے۔ یا کسی اور طرح کا دھوکا کھا جانا۔ یہ چیزیں بھی وجہ بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں بھی زیادہ تر غربت اور محتاجی کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہیں۔ محروم لوگ زیادہ خواب دیکھتے ہیں۔ اور خواب بہت سے لوگوں کو بھٹکا دیتے ہیں۔ خاص طور پر نادانی کی عمر میں۔ لیکن سر۔۔۔ میں ایک بار پھر یہی گواہوں کا کہنا ہے۔ سب سے زیادہ خرابیوں کی جڑ ہے۔“

یہ ایک ایسے آدمی کا تجزیہ تھا جو پڑھا لکھا اور ذہن تھا، جس نے تیرہ سال تک صورتحال کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ مثالیں پیش کرنے کیلئے اسکے پاس سیکڑوں کہانیاں تھیں۔ سینیٹ کمیٹی نے کافی عرصے میں 805 صفحات پر مشتمل رپورٹ مرتب کی۔ اس رپورٹ کے آخر میں اس نے پولیس آفیسر کی رائے سے اتفاق کیا۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کا دھندہ بہت اچھا جا رہا تھا۔ اس کے تو دوسرے شہروں کے دلالوں سے بھی رابطے ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں اچھے اور نئے چہروں کا جالہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ چہرے اپنی ضرورت سے زیادہ ہوتے تھے تو دوسرے اڈوں کو فروخت بھی کر دیے جاتے تھے۔ ایک اچھے چہرے کے چار پانچ سو ڈالر آسانی سے مل جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ اچھی خاصی رقم تھی۔

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

اس سلسلے میں ان کا ایک مخصوص طریقہ واردات تھا۔ کسی روز ڈاک میں ان کے شکاگو کا ایک خطا موصول ہوتا تھا جس پر سیاسی سے ایک ہاتھ بنا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس پر ضرب کے نشان کی طرح دو ہڈیاں اور ایک کھوپڑی بھی بنی ہوئی تھی یا اس کی جگہ بھجرا دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی تصویروں کے نیچے مطالبہ درج ہوتا تھا۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

☆.....☆.....☆

بگ جم کے پاس کئی ستوں سے خوب پیسہ آ رہا تھا اور جب کسی کے پاس پیسہ آتا ہے تو جھوٹی اور لالچی لگا ہیں بھی اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ بگ جم کی طرف ان گروہوں کی لالچی نظریں مرکوز ہونے لگی تھیں جو بلیک بینڈ کہلاتے تھے۔ یہ گروہ ہر دردت مند سے حصہ وصول کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔



مطالبہ دے نرم اور شائستہ انداز میں کیا جاتا تھا لیکن دھمکی بہر حال واضح ہوتی تھی۔ خط کا مضمون کچھ اس قسم کا ہوتا تھا:

پولیس والا تھا۔ اس کی کوئی حس اسے بتا رہی تھی کہ وہ تینوں پیشہ ور قاتل تھے اور انہیں یقین کسی ایسی طاقت کی پشت پناہی حاصل تھی جو علاقے کے پولیس آفیسر کو بھی خاطر میں نہیں لارہی تھی۔

ترجمہ: محمود احمد مودی

قسط: 4

# الکپون

ALCAPONE



**جرائم کے بادشاہ کی انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز سچی کہانی**  
**ماضی کا ایک کردار جو کسی نہ کسی روپ میں جنم لیتا رہتا ہے**

محترم جناب سامعین!

امید ہے مزاج بہ خیر ہوں گے۔ شاید ہمارا یہ عریضہ آپ کی نازک طبیعت پر بارگزرے لیکن کیا جائے..... کہنے والی بات تو کہنی ہی پڑتی ہے۔ آپ کشادہ دلی اور فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے آج سے ٹھیک چاروں بعد یعنی اس ماہ کی تیس تاریخ کو، شام کے ٹھیک چار بجے دو ہزار ڈالر کی رقم مجھے کے ایک ڈبے میں ڈال کر اپنے گھر کے دروازے پر رکھ دیجئے گا۔ اگر آپ کو اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی عزیز ہے تو آپ کو اس درخواست پر عمل کرنا ہی ہوگا۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو یقین کیجئے کہ اس ہفتے کے اختتام تک آپ کا اور آپ کے اہل خانہ کا نام و نشان تک اس دنیا میں نہیں رہے گا۔

یہ صدا احترام مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔ اگر میری بات آپ کو ناگوار گزری ہے تب بھی بہر حال مجھے اپنے دوستوں اور خیر خواہوں میں شمار کیجئے گا۔ نیک خواہشات کے ساتھ، آپ کا دوست۔  
کبھی خط کی تکلف کے بغیر سیدھے انداز میں بھی لکھا ہوتا تھا۔ مثلاً:

مشریفی!

تمہارے پاس اچھی خاصی دولت ہے۔ اس میں سے تین ہزار ڈالر مجھے دے دو۔ رقم ایک لفافے میں رکھ کر اسٹریٹ نمبر ۱۱۱ کے کونے پر پہنچنا۔ اس کونے والے سرخ رنگ کے مکان کی چٹائی کھڑکی کا چھانٹو تا ہوا ہے۔ کل، یعنی پیر کی رات ٹھیک بارہ بجے اس ٹوٹے ہوئے پیچھے والی کھڑکی کے قریب جانا۔ وہاں کھڑکی کے نیچے سرک پر ایک اینٹ رکھی ہوگی۔ رقم کا لفافہ اس اینٹ کے نیچے رکھ دینا اور وہاں سے چلے جانا۔ اگر تم نے ان ہدایات پر عمل کیا تو تم زندہ رہو گے ورنہ مارے جاؤ گے۔ تم جاہو تو پولیس کو اطلاع دے سکتے ہو۔ اگر پولیس مجھے تلاش کرنے میں کامیاب ہوگی تو تمہاری رقم کی بچت تو ضرور ہو جائے گی لیکن جان نہیں بچے گی۔ کیونکہ میں جو بھی جیل سے باہر آؤں گا، سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ تمہیں قتل کروں گا۔ اگر تم نے شہر چھوڑ کر کہیں بھاگنے کا فیصلہ کیا، تب بھی یہ مت سمجھنا کہ تم ہمارے ہاتھ سے بچ جاؤ گے۔ ہم نے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔

ایسے کئی واقعات رونما ہو چکے تھے کسی نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یا اپنی بے وقوفی کے باعث ان خطوط کو نظر انداز کر دیا۔ اسے ہلاک کر دیا گیا۔ کسی کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ کسی کے کاروبار کی جگہ پر بم پھینک دیا گیا۔ اس سے یہ تاثر پھیل گیا کہ ان خطوط کو نظر انداز کرنا حرافت تھی اور کھانے کا سودا تھا۔

امریکا کے کئی شہروں میں مجموعی طور پر اپنی شناخت کے لئے بلیک بینڈ یا بلیک بینڈرز کے الفاظ استعمال کرنے والے جو گروہ کام کر رہے تھے، ان دنوں ان کی تعداد اندازاً چالیس سے ساٹھ کے درمیان تھی۔ انہوں نے گزشتہ تیس برسوں کے دوران کم از کم چار سو افراد کو نشانِ عبرت بنانے کے لئے سفاکانہ انداز میں قتل کر دیا تھا۔

آخر کار سرکاری اداروں کو موثر انداز میں ان کے خلاف حرکت میں آنا پڑا۔ محکمہ ڈاک کو بھی خصوصی احکام دیئے گئے کہ وہ یہ خطوط لکھنے والوں کا سراغ لگانے کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کریں۔ کریک ڈاؤن کی وجہ سے یہ سلسلہ راکم تو ہوا لیکن رکنا نہیں۔

جن لوگوں سے رقم کا مطالبہ کیا جاتا تھا، وہ عام طور پر دو لوگ ہوتے تھے جنہوں نے بڑی محنت سے دولت کمائی ہوئی تھی۔ وہ بد معاش یا لٹیروں نہیں، دیانتدار بزنس مین ہوتے تھے۔ ان سے جس حد تک بن پڑتا تھا، وہ ایسے مطالبات پورے کر دیتے تھے لیکن ظاہر ہے، بگ جم تو اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔

جب اسے اس قسم کا خط ملا تو غصے سے اس کی کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ اسے یقین نہ آیا کہ کوئی اسے بھی اس قسم کا خط لکھنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ خط لکھنے والے کے خلاف کارروائی کس طرح کرے؟ وہ تو گناہ تھا۔ اس کی شخصیت پر وہ راز میں تھی۔ اگر کوئی بگ جم کے سامنے اشارتاً بھی کہہ دیتا کہ خط اس نے لکھا ہے، تو وہ اسے وہیں شوت کر دیتا لیکن جب کسی کو ظلم یا نہ ہو کہ اس کا دشمن کون ہے، تو وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کیسے کر سکتا ہے؟

اس نے غصے میں ایک ایسے آدمی کو ایک تاریک گلی میں گولی مار دی جس کے بارے میں اسے علم تھا کہ وہ بہت خور ہے۔ گو کہ بگ جم خود بھی احساس تھا کہ یہ وہ آدمی نہیں جس نے اسے خط لکھا ہے۔ لیکن اسے اس خیال سے کچھ طمانیت کا احساس ہوا کہ اس کے ہاتھوں مرنے والا اور اسے خط لکھنے والا، دونوں تھے تو ایک ہی قبیلے کے آدمی۔

ایک اور بہت خور کے پیچھے اس نے اپنے ایک آدمی کو لوگ دیا کہ موقع ملنے ہی اسے اڑا دینا۔ بگ جم کے آدمی نے اس کی ہدایت پر ایک بار اس آدمی پر گولی چلائی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گیا مگر اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس کے بعد کچھ نہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ شہری چھوڑ گیا تھا۔

چند دن سکون رہا۔ بگ جم کو گمان گزرا کہ شاید اس کا مسئلہ حل ہو گیا ہے لیکن پھر اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک بار عجب پولیس آفیسر کی حیثیت سے اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے گھمنڈ میں رات گئے تک بھی بعض اوقات غیر مسلح حالت میں مسانہ گلیوں میں گھومتا رہتا تھا۔

ایک رات وہ ایک مسانہ اور نیم تاریک گلی سے گزر رہا تھا کہ لمبے ترنگے تین آدمیوں نے اچانک تارکی سے نکل کر اسے گھیر لیا۔ ان کے آدھے چہرے سے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ لو جوان ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے اور وہ بالکل بے خوف نظر آرہے تھے۔ انہیں گویا بگ جم کے پولیس آفیسر ہونے کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔

بگ جم کی تو مداب خاصی نمایاں ہو چکی تھی۔ ایک نو جوان نے پستول کی نال اس کی تو مد میں چھو کر کہا۔ ”ہم نے تمہیں بچس ہزار ڈالر کی ادائیگی کے لئے خط لکھا تھا لیکن تم نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اب تمہیں بچس ہزار ڈالر کی جگہ بچاس ہزار ڈالر دینا ہوں گے۔“

اس کے آدھے چہرے پر نقاب کی وجہ سے بگ جم اس کی شکل صحیح طور پر نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن صورت شکل کے بارے میں جو اندازہ ہو رہا تھا، اس سے اسے یہی لگ رہا تھا کہ نو جوان اس کیلئے بالکل انہنی ہے۔ اس کے ساتھ بھی اسے انہنی ہی معلوم ہو رہے تھے۔ بگ جم ایک جہاندیدہ

حقیقت تھی کہ اس طرح اچانک گھیرے جانے پر بگ جم اندر سے ہل کر رہ گیا تھا لیکن اس نے بظاہر جی الامکان بے پروائی سے کہا۔ ”تمہارے خیال میں کیا میں راتوں کو بچاس ہزار ڈالر جیب میں لئے پھر رہا ہوں؟ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنے کیلئے مجھے کافی مہلت درکار ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، رقم اس وقت تو تمہاری جیب میں نہیں ہوگی لیکن بندوبست کرنے کے لئے تمہیں زیادہ مہلت کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔“ نو جوان غریبا۔ ”ہمیں معلوم ہے تمہارے پاس خاصی دولت ہے۔ چاروں طرف سے مال سمیٹ رہے ہو۔“ اور ہم تمہیں پہلے ہی کافی مہلت دے چکے ہیں۔ اسی لئے ہمیں رقم دینی بھی کرنی پڑی ہے۔“

اسکے ساتھی بے چینی سے پستول ہاتھوں میں گھما رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بگ جم کو دوسری دنیا کی طرف روانہ کرنے کیلئے بیقرار تھے۔

بگ جم نرم اور صلح جو یا نہ لیجے میں بولا۔ ”دیکھو..... میں رقم ادا کروں گا لیکن اس کے لئے مجھے مہلت بہر حال درکار ہوگی۔ میرے پاس نقد رقم نہیں ہوتی۔ میں پیرہ کپڑے نہیں انویسٹ کئے رکھتا ہوں۔ ہمیں اسی طرح ایک دو ہینڈلز اور کرنی ہوں گی، تمام تفصیلات طے کرنی ہوں گی۔“

”ہاں..... تاکہ اس دوران پولیس اور تمہارے سولین گرسے ہمیں گھیر کر رکھیں۔“ نو جوان نے کسی بدروح کی طرح قہقہہ لگایا اور فلی میں سر ہلایا۔ ”کوئی ٹینگ نہیں ہوگی۔ ہاں..... مہلت..... تمہیں مل جائے گی۔ ادائیگی تمہیں کہاں اور کس طرح کرنی ہوگی، اسکے بارے میں ہدایات تمہیں خط کے ذریعے مل جائیں گی۔ تمہیں کتنی مہلت چاہئے؟“

”دو ہفتے۔“ بگ جم نے ایک لمبے سوچ کر کہا۔  
”ٹھیک ہے.....“ مذاکرات کرنے والے نو جوان نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔ ”آج سے ٹھیک پندرہویں دن اگر ہماری ہدایات کے مطابق رقم ہمیں نہ ملی تو ایسی ہی کسی گلی میں تمہاری لاش پڑی ہوگی۔ اس میں بہت سے سوراخ ہوں گے اور یہ جو تمہارا بڑا سا غبارہ ہے نا.....“

اس نے پستول کی نال اس کی تو مد میں مزید چھوٹے ہوئے کہا۔ ”اس میں سے ساری ہوا نکل چکی ہوگی۔“  
بگ جم کو اپنے کان سے محسوس ہوئے۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اسے ایسی تو تین اٹھیں صورتحال سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ بچاس ہزار ڈالر بہت بڑی رقم تھی۔ تاہم وہ چاہتا تھا کہ کوئی سکا تھا لیکن اس نے اسی لمحے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی رقم ادا نہیں کرے گا۔

اس وقت تو اس کی جان بخشی ہوگی۔

وہ سیدھا وکنوریہ کے پاس آیا۔ اس نے وکنوریہ کو یہ پورا واقعہ سنا دیا۔ وکنوریہ جیسے بے خوف اور بڑا اعتماد و عورت بھی ٹھہر مند ہوگی۔ بگ جم اس معاملے میں اپنی پولیس فورس کو استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی جس معاملے میں وہ خود کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس میں پولیس فورس بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پولیس فورس کے ہاتھ قانونی مجبوریوں میں بھی بندھے ہوتے تھے۔ اسکے علاوہ بگ جم چاہتا تھا کہ اس کے ماتحت پولیس والوں کو اس معاملے کی ہوا لگے۔ یہ جان کر ان کی نظر میں بھلا اس کی کیا عزت رہ جاتی کہ مجرم اس سے بھی بہتہ طلب کرنے لگے تھے اور وہ بھی اتنی بڑی رقم.....!

کچھ دیر سوچنے کے بعد وکنوریہ کو خیال آیا کہ نیویارک کے علاقے بروکلین میں اس کا کزن جان نور پور رہتا تھا اور وہاں اس کی اچھی خاصی دہشت تھی۔ وہ اس قسم کے معاملات سے شغف میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ نیویارک کے اخبارات میں کبھی بکھار اس کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کے مختصر وجود کے باعث اسے اخباری رپورٹرز نے ”مفلح جان“ کا لقب دے رکھا تھا۔ اسکے علاوہ اسے ”خطرناک جان“ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اس کے مختصر قد کاٹھ کے باوجود اس کی اتنی دہشت تھی۔

”میں جان نور پور کو یہاں بلا لیتی ہوں۔ وہ اس معاملے میں ضرور تمہاری مدد کرے گا۔“ وکنوریہ بولی۔ ”تم پولیس والے ہونے کے باوجود اپنے لئے وہ کچھ نہیں کر سکتے جو وہ تمہارے لئے کر دے گا۔“

اس نے جب بگ جم کو ذرا تفصیل سے جان نور پور کے بارے میں بتایا تو اس کی ہاتھیں ٹھل ٹھل اُڑیں اور وہ فوراً جان نور پور کو بلانے پر رضامند ہو گیا۔ وہ ۱۱۱ کا زمانہ تھا اور جان نور پور ابھی نیویارک ہی میں تھا۔

بگ جم کو امید نہیں تھی کہ جان نور پور اپنی کزن کے بلاوے پر شکار گوا جائے گا..... مگر وہ آن پہنچا۔ وہ پورے جوش و خروش سے بگ جم کی مدد کرنے کے لئے تیار تھا۔ بگ جم کو خط کے ذریعے ہدایات موصول ہوئیں کہ وہ رقم لے کر ریلوے کی ایک پلیا کے نیچے پہنچے۔ یہ پلیا ویرانے میں تھی۔

جان نور پور اور بگ جم کبھی بیٹھ کر پلیا کی طرف روانہ ہوئے۔ کبھی کے فرش پر دو گن مین بھی لیٹے ہوئے تھے جنہیں باہر سے کسی کا دیکھنا مشکل تھا۔ وہ دونوں بگ جم ہی کے آدمی تھے۔ جان نور پور کو کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔ اسے بس ان آدمیوں سے کام لینا تھا۔ اصل اہمیت اس کے حوصلے اور تجربے کی تھی۔ بگ جم بس یہ چاہتا تھا کہ بات نہ بگڑے اور اس کی اپنی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

کبھی چپے ہی پلیا کے قریب پہنچ کر رکی، تینوں نو جوان پلیا کے اوپر سے کود کر ان کے سامنے آ گئے۔ وہ شاید اسی لئے پلیا کے اوپر چھپے ہوئے تھے کہ آنے والوں کو دور سے دیکھ سکیں۔ کبھی اوپر سے کھلی گلی اور تینوں بد معاشوں کو شاید یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا تھا کہ انہی میں صرف دو ہی آدمی ہیں اور ان میں سے ایک بگ جم ہے۔

بگ جم نے کبھی مار کر جان نور پور کو اشارہ دے دیا کہ وہ تینوں ان کے مطلوبہ آدمی ہی ہیں۔ جان نور پور نے ایک لمحہ خالصتے کے بغیر بگ جم کے آدھوں کو کٹھنل دے دیا۔ ان کے نام ایڈریو اور پیٹرک تھے۔ وہ باہر نشانہ باز تھے۔ وہ تینوں نو جوان جو اپنی داشت میں اس وقت رقم وصول کرنے آ رہے تھے، پہلے سے بھی زیادہ بے خوف اور پراعتاد معلوم

ہوتے تھے۔ وہ بے پروائی سے ہاتھوں میں پستول جھلاتے کبھی کی طرف آرہے تھے۔ انہیں غالباً یقین تھا کہ بگ جم کے پاس ان کے حکم کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اسی اثاء میں فضا کا سکوت بے در پے دھماکوں سے درہم برہم ہو گیا۔ کبھی کی طرف سے کچھ تاریخی شعلے سے لپکے اور تینوں نو جوان، جھاڑیوں کے قریب زمین پر آڑے ترے جیسے ڈھیر ہو گئے۔

”اس طرح کے لوگوں کا علاج صرف گولی ہے۔“ مختصر انو وجود جان نور پور نے کبھی سے اترتے ہوئے نہایت پرسکون لیجے میں کسی جہاندیدہ بزرگ کی طرح بگ جم کو بکھایا۔ ”اور اس کام میں تاخیر بالکل نہیں کرنی چاہئے۔“

وہ زمین پر ڈھیر نو جوانوں تک پہنچے جن کے جسموں سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا اور زمین کو رنگین بنا رہا تھا۔ وہ آخری سانس لے رہے تھے۔ جان نور پور نے طمانیت سے سر ہلایا اور بگ جم کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں واپس آئے اور دوبارہ کبھی میں بیٹھ گئے۔ دونوں گن میں بھی کپڑے جھاڑ کر سینوں پر بیٹھ چکے تھے۔ وہ محرز زائد لباس میں تھے اور چہرے مہرے سے نہایت شریف آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ان کی کمر سے گوکہ گولیوں کی بیٹ بندھی ہوئی تھی اور پہلو میں پستول بھی جھول رہے تھے لیکن گمان نہیں گزرتا تھا کہ انہوں نے کبھی اس خطرناک چیز کو استعمال کیا ہوگا۔

”ہس..... اتنی سی بات تھی؟“ جان نور پور نے لاشوں کی طرف الوداعی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ بگ جم اس کے انداز پر مسکرا دیا۔ اسے مختصر قد و قامت کا یہ آدمی بہت اچھا لگا تھا جو گہری نظر سے دیکھنے پر عجم شیم اور پیشہ ور مجرموں سے زیادہ خطرناک معلوم ہوتا تھا۔

دوسرے روز بگ جم کو پیغام ملا کہ کاؤنٹی اسپتال میں ایک نو جوان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس نے بگ جم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اسے اس کے دو ساتھیوں کی لاشوں کے ساتھ اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ تب بگ جم کو معلوم ہوا کہ اسکے آدمیوں کے ہاتھوں تین آدمیوں میں سے دو موقع پر ہی مر گئے تھے لیکن ایک زندہ بچ گیا تھا۔ تاہم وہ بھی اب زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

بگ جم فوراً اسپتال پہنچا۔ اسے یہ جاننے کا جیس تھا کہ وہ نو جوان اس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ جب اس کے بیڈ کے قریب پہنچا تو نو جوان نزع کے عالم میں تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے کو تھیں مگر بگ جم کو دیکھ کر اس کے ذہنی وجود میں گویا زندگی کی بچی بچی توانائی عود کر آئی اور وہ جیسی لیکن انتہائی نفرت بھری آواز میں بولا۔ ”جھوٹے..... دھوکے باز..... وعدہ خلاف.....!“ اور پھر وہ دم توڑ گیا۔

بگ جم حیران رہ گیا۔ مرنے والے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے بگ جم نے اس کے ساتھ کوئی کاروباری معاہدہ کیا تھا جس کی اس نے خلاف ورزی کی تھی۔ مجرموں کی بھی اپنی ہی ایک دنیا، ایک سوچ اور ایک انداز فکر تھا..... یا پھر شاید یہ مجرم ہی اپنی کوئی الگ دنیا بسائے ہوئے تھے۔

اسے بعد میں علاقے کی پولیس اور عدالتی تفتیش سے پتہ چلا کہ وہ تینوں نو جوان پشسرگ کے رہنے والے تھے۔ شاید انہیں اس خصوصی ہم کے لئے پشسرگ سے بلوایا گیا تھا لیکن کس نے بلوایا تھا، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود ہی کوئی بڑا ہاتھ مارنے شکار گوائے ہوں۔ بڑا ہاتھ مارنے کے بجائے وہ خود مارے گئے تھے۔

پولیس نے ان کے بارے میں رپورٹ مرتب کرتے وقت حسب معمول یہی لکھا۔ ”نامعلوم افراد کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔“ ان کے ہاتھوں میں چونکہ پستول بھی پائے گئے تھے اس لئے یہی سمجھا گیا کہ یہ گروہوں کی آپس کی لڑائیوں کا شکار تھا۔ اس واقعے سے بہتہ خوری کرنے والی چھوٹی موٹی ٹولیوں اور آزادانہ طور پر کام کرنے والے بد معاشوں کو خاصی عبرت ہوئی اور ان کی سرگرمیاں کافی حد تک ختم ہو گئیں۔ جرائم پیشہ حلقوں تک تو اصل بات پہنچ گئی تھی۔ ان پر بگ جم کی خاصی دہشت چھنے لگی اور انہوں نے اس کی طرف رخ کرنے کے ارادے ترک کر دیے۔

بگ جم کو جان نور پور کا اچھا لگا کہ اس نے اسے مستقل طور پر شکار گو ختم ہونے اور اپنے ساتھ کاروبار میں شریک ہونے کی دعوت دی جان نور پور نے صرف چند منٹ کے غور و خوض کے بعد یہ دعوت قبول کر لی۔ اسے مین مین کے حالات اپنے حق میں کچھ زیادہ سازگار معلوم نہیں ہوتے تھے۔ وہاں مالیاتی قسم کے کاروباروں پر آئرش گروہوں کی گرفت زیادہ مضبوط تھی۔

جان نور پور خود اپنی نظر میں جتنا ”باصلاحیت“ تھا، اسکے مقابلے میں اسے اپنے لئے مین مین میں ”ترقی“ کے مواقع نظر آ رہے تھے۔ چنانچہ اس نے شکار میں بگ جم کے زیر سایہ قسمت اور صلاحیتیں آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں ۱۱۱ چار سال کی عمر میں جان نور پور شکار گو ختم ہو گیا۔

بگ جم نے ابتداء میں اسے جسم فروشی کے اپنے ایک اڈے کا منیجر مقرر کیا لیکن جان نور پور بہت جلد اس ”عہدے“ سے ترقی کر کے اس کے سارے ہی دھندوں کا گھران بن گیا۔ اسکی حیثیت اب بگ جم کے ”چیف لیفٹیننٹ“ کی تھی اور اسے تمام دھندوں میں سے کچھ حصہ ملنے لگا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ خوش تھا اور بگ جم جی..... بلکہ بگ جم زیادہ خوش تھا کیونکہ جان نور پور کو حصہ دینے کے باوجود اس کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا تھا اور اس کا دوسرا بالکل گم ہو گیا تھا۔ وہ ہر کام میں جان بھپانے سے بچ گیا تھا۔

مزید کچھ عرصے بعد جان نور پور نے اپنے پاس کی اجازت سے خود اپنا ”کاروبار“ بھی شروع کر دیا۔ اس نے بھی جسم فروشی کا اپنا ایک اڈہ کھول لیا جو وکنوریہ کے اڈے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے ”منیجر“ کے طور پر کام کرنے کے لئے جان نور پور نے مونٹانا سے اپنے ایک کزن کو بلوایا۔ اس کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن وہ راکسی کہلاتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک گن مین تھا۔

۱۱۱ میں شکار گو میں معیوب، ناجائز اور مجرمانہ دھندوں کے سلسلے میں کچھ دشواریاں پیدا ہونے لگیں۔ اس وقت شہر کا میئر ہیرسین تھا۔ گوکہ وہ بذات خود کپٹ آدمی نہیں تھا لیکن اس نے ناجائز دھندے کرنے والوں کو خاصی ذمیل دے رکھی تھی اور اپنا وقت عافیت سے گزارنے کے لئے ان کی طرف سے آنکھیں تقریباً بند کر رکھی تھیں لیکن اب اسے اصلاح پسند اور مذہبی طبقوں کے مسلسل دباؤ پر آخر کار ایک ”اصلاحی ڈویژن“ قائم کرنا پڑا۔

اس ڈویژن کا سربراہ ایک ریٹائرڈ میجر تھا۔ اس کا نام فنک تھا۔ وہ اصلاحات کے معاملے میں تقریباً جنوبی اور انتہا پسند تھا۔ وہ معاشرے کی اپنے حساب سے اصلاح کرنے کے لئے نہ جانے کب سے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس نے موقع ملنے ہی قلمیں اس طرح سنسر کر دیاں شروع کر دیں کہ ان کی درگت بننے لگی۔ وہ تکنیکل مسائل سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتا تھا اور کسی کی فریادیں سننا تھا۔

اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کپٹ نہیں تھا۔ اصلاحی ڈویژن کا سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسے اعزازی طور پر ”سینٹ ڈینی پولیس کمشنر“ کا عہدہ بھی ملا ہوتا تھا مگر وہ پولیس کے جھگے سے الگ رہتے ہوئے اپنے طور پر پولیس جیسی کارروائیاں بھی کر سکتا تھا جن کے لئے اس نے اپنے کچھ آدمی تعینات کئے تھے۔ یہ اس کا خصوصی اسکوڈ تھا۔

بگ جم نے کبھی مار کر جان نور پور کو اشارہ دے دیا کہ وہ تینوں ان کے مطلوبہ آدمی ہی ہیں۔ جان نور پور نے ایک لمحہ خالصتے کے بغیر بگ جم کے آدھوں کو کٹھنل دے دیا۔ ان کے نام ایڈریو اور پیٹرک تھے۔ وہ باہر نشانہ باز تھے۔ وہ تینوں نو جوان جو اپنی داشت میں اس وقت رقم وصول کرنے آ رہے تھے، پہلے سے بھی زیادہ بے خوف اور پراعتاد معلوم



چھ ماہ کے اندر اندر اس نے سخت گیری سے کام لیتے ہوئے اپنی نگرانی میں، بدنام علاقوں سے 350 افراد کو گرفتار کیا۔ ان میں پیشور

معلوم تھا کہ ہنگامہ کیسے شروع ہوا۔ بس کسی نے ایک گولی چلا دی تھی۔ اس کے بعد وہ مار دھاڑ شروع ہوئی کہ کسی کی بھی کچھ نہیں آیا کہ کس نے کیا کیا، کس نے کس کو مارا۔



جب ہنگامہ ختم ہوا تو گرفتار شدگان فرار ہو چکے تھے۔ اسکوڈ کے آدمی جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔ دونوں سرانصرساں بچا رہے، جن کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جو محض وہاں سے گزر رہے تھے، فٹ پاتھ پر مرے پڑے تھے۔ جان نوری کی گاڑی غائب ہو چکی تھی۔ کچھ لوگ زخمی ہو چکے تھے۔ سڑک پر پتھر، ٹوٹی ہوئی اور سالم توپیں اور دوسرا کاٹھ کیا ڈنگھرا ہوا تھا۔

اس واقعے کے بعد علاقے میں کشیدگی بہت بڑھ گئی۔ جان نوری کچھ عرصے کے لئے روپوش ہو گیا۔ کافی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ بگ جم بھی شکوک و شبہات، اور پھر غائب کی زد میں آ گیا۔ کسی نے اخبار میں اس کے بارے میں گمان مگر حلیہ مرسلہ لکھ دیا کہ ہنگامے کے وقت جان نوری کی گاڑی میں وہ بھی موجود تھا اور فائرنگ اسی آدمی نے شروع کی تھی۔ اس کے آدمی، پیٹرک کے پاؤں میں گولی بھی لگی ہوئی تھی۔

بہر حال اس سارے پتھر میں بگ جم کی نوکری جاتی رہی۔ صرف یہی نہیں، اسے دو چار دن حوالات میں بھی گزارنے پڑے۔ جس علاقے میں ہنگامہ ہوا تھا، اس علاقے کا پولیس آفیسر کیپٹن ریان بھی ایک کرپٹ آدمی تھا۔ اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اس کی جگہ کیپٹن میکس کوکیناٹ کیا گیا جسے ایک دیانتدار آفیسر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی شہرت بہت اچھی تھی۔ اس کی دیانتداری اس علاقے میں آنے کے بعد بھی برقرار رہی، جس کا ثبوت کچھ بھی ملا کہ اس کی آمد کے دوسرے ہی روز علاقے کا ایک ”معزز“ آدمی بلوم اس سے ملے پہنچا۔ وہ ایک ڈانس ہال کا مالک تھا۔ ڈانس ہال کی آڑ میں نہ جانے کیا کچھ ہوتا تھا۔

اس کا تجربہ تھا کہ بعض پولیس آفیسر کی شہرت تو یہی ہوتی تھی کہ وہ دیانتدار ہیں لیکن انہیں بھی شخصے میں اتارنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ وہ دراصل صرف محتاط ہوتے ہیں۔ بے حساب نہیں کھاتے اور منہ بھار کر کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔

اس نے نیچے دار باتیں شروع کیں اور آخر کار مطلب کی بات پر آیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جس طرح وہ سابق کیپٹن ”خدمت“ کرتا تھا، اسی طرح اسے اب بھی خدمت کا موقع ملے رہتا چاہئے۔

کیپٹن میکس نے سکون اور جملے سے اس کی بات سنی۔ بلوم نے محسوس کیا کہ وہ آدمی کی طرف آرہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سابق کیپٹن کو جتنی رقم پہنچایا کرتا تھا، نئے کیپٹن کو اس سے دینی پہنچایا کریگا۔ اس نے اپنے اس ارادے کا اظہار بھی کر دیا۔

کیپٹن میکس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بلوم خوش ہو گیا۔ وہ علاقے کا معزز آدمی تھا۔ یہی امید لے کر آیا تھا کہ میکس اس کی بات نال نہیں سکے گا۔ اس زمانے میں مطلوب مجرموں اور ”ہسٹری شیٹر“ قسم کے لوگوں کی تصویریں پولیس اسٹیشن کے بیرونی کمرے میں دیوار پر لگی ہوتی تھیں جبکہ علاقے کے معزین کی تصویریں معززانہی انداز میں، فریم کے ساتھ انخارج کے کمرے میں دیوار پر لگی ہوتی تھیں۔

کیپٹن میکس کے کمرے میں جتنی دیوار پر دوسرے کسی افراد کی تصویروں کے ساتھ بلوم کی بھی فریم شدہ تصویر آویزاں تھی۔ بلوم اس وقت اپنی اس تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے فخریہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ کیپٹن میکس نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے تصویر کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور اس نے تصویر دیوار سے اتاری۔

تصویر ایک ہاتھ میں پکڑے وہ بلوم کی کرسی کے قریب آیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے بلوم کو گریبان سے پکڑ کر کرسی سے اٹھایا۔ وہ اسے گھسیٹا ہوا اپنے کمرے سے باہر لے گیا۔ اس کا دفتر چند میز جوں کی بلندی پر تھا۔ اس نے بلوم کی پیٹھ پر ایک لات رسید کی اور وہ ان چند میز جوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے جا کر۔

اوپر سے میکس نے اس کی فریم شدہ تصویر بھی پھینک دی جو اس کے قریب جا کر گری اور اس کا شیشہ ٹوٹ کر کرسیوں میں تبدیل ہو گیا۔ بلوم نیچے پڑا ہوا پتھر پتھر آٹھکوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت شاید اسے اپنی چوٹی کی بھی پروا نہیں تھی، بلکہ شاید احساس تک نہیں تھا کہ اسے کوئی چوٹ بھی لگی ہے۔ اسے شاید اپنی آٹھکوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اس کے بعد سے لیوی کے علاقے میں گویا وقت کافی حد تک بدل گیا۔ بہت سے اڈے بند ہو گئے۔ بہت سے دھندوں کے لائسنس منسوخ ہو گئے۔ بہت سی گرفتاریاں ہوئیں۔ جسم فروشی کے ایک اڈے کے مالک اور ایک ”میڈم“ کے شوہر نے اپنے ملازمین کو تھوڑا دیں اور اڈے کو تالا لگا کر ٹھنڈی سانس لے کر رخصت ہوتے ہوئے بولا۔ ”گلتا ہے اب تو لیوی کے علاقے کی بہت اچھی طرح اصلاح ہو کر رہی رہے گی۔“

بگ جم اور جان نوری اس لحاظ سے عقلمند اور خوش قسمت تھے کہ انہوں نے یہ وقت آنے سے پہلے مضامقات میں اپنے کاروبار سیٹ کر لئے تھے۔ گوکہ بعد میں شہر میں قحط میں قحط نامی جو میسر منتخب ہوا وہ اصلاح پسندوں کا زیادہ حامی نہیں تھا۔ وہ خصوصی قوانین کے تحت جبری سے انداز میں لوگوں کے خلاف سخت کارروائیاں کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔

اسکی اصلاحی اسکوڈ سے نہیں بنی۔ اختلافات بڑھتے رہے۔ آخر کار اس نے اصلاحی اسکوڈ کو ختم کر دیا اور میجر فٹک کو برطرف کر دیا۔ اس کے باوجود بگ جم اور جان نوری کو احساس رہا کہ لیوی کے علاقے میں پہلے جیسے دن لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ انہوں نے اپنی توجہ مضامقاتی علاقوں کے کاروبار کی طرف ہی رکھی۔

ان سے انہیں بڑی اچھی آمدنی ہو رہی تھی۔ بگ جم کا ایک نائٹ کلب نما کینے تو بہت ہی اچھا چل رہا تھا حالانکہ اس میں کھانے پینے اور عام تقریبات کے علاوہ اوپر کے کمروں میں صرف جوا ہوتا تھا۔ کوئی اور معیوب دھندہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود صرف اسی سے بگ جم کو پچاس ہزار ڈالر ماہانہ کی آمدنی ہو رہی تھی۔ اس کا انتظام بھی اس کا پارٹنر جان نوری ہی چلاتا تھا۔ بگ جم اپنی جگہ خوش حال نظر نہیں تھا۔

جان نوری نے شکار گو کے ارد گرد کے مزید گاؤں دیہات کی طرف توجہ دی اور جہاں جہاں کم خرچ میں، آسانی سے اس قسم کے مزید مزید اور رینٹورٹس کھو لے جاسکتے تھے وہاں بھی کھول دیئے۔ جس جگہ مزید جس دھندے کی محاسبات ہوتی تھی اور اس میں کامیابی کا امکان نظر آتا تھا، وہاں وہ بھی شامل کر دیا جاتا تھا۔

ادھر 1919ء کے الیکشن میں قحط میں قحط کے دوبارہ میسر منتخب ہونے کی امید نہیں تھی۔ اخبارات اسکے خلاف لکھ رہے تھے۔ نیویارک ٹائمز نے اس کے بارے میں لکھا۔ ”اس نے بڑی محنت سے شہریوں کا اخلاق تباہ کیا ہے اور وہ اب بھی جوش و خروش سے اسی کام میں لگا ہوا ہے۔“

ایک اور اخبار نے لکھا۔ ”وہ شکاگو کی تاریخ کا بدترین میسر ہے۔“ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود 1919ء کے الیکشن میں بھی میسر قحط میں جیت گیا کیونکہ وہ دولت مند اور کامیاب کاروباری آدمی ہونے کے باوجود عوام میں پسند مقبول تھا۔ وہ ایک عوامی ساعی آدمی تھا۔ ہر طبقے میں گھل مل جاتا تھا۔ انہی جیسی زبان بولتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے دور میں گیس اور دوسری کئی چیزوں کی قیمتیں کم ہوئی تھیں جنہیں اس سے پہلے کوئی کنٹرول نہیں کر پا رہا تھا۔ اسکے علاوہ میسر قحط میں اس کے دور میں بیروزگاروں کو نوکریاں ملی تھیں۔ شاید انہی سب وجوہ کی بنیاد پر وہ دوبارہ میسر بن گیا تھا۔

..... اور یہی وہ زمانہ تھا جب نیویارک میں الیکشن کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس نے ایک آئرش گروہ کے آدمی آر تھر کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور گروہ کے سینکڑوں باس وکیم نے اسے تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ آخر کار اس کے باس ہیل نے فیصلہ کیا تھا کہ الیکشن کو شکاگو بھجھ دیا جائے۔ معاملہ ٹھنڈا پڑنے تک وہ وہیں رہے۔ اس نے جان نوری سے بات بھی کر لی تھی۔ ان حالات اور اس پس منظر میں الیکشن کو چلا آیا تھا۔

وہ نوجوان اور نا تجربے کار تھا۔ پناہ لینے کیلئے شکاگو آیا تھا۔ ظاہر ہے کسی بڑی پوزیشن پر تو فائز نہیں ہو سکتا تھا۔ جان نوری کا ایک کلب ”فور ڈیوسز“ اچھا چلتا تھا۔ اس کی عمارت بھی خاصی بڑی تھی۔ الیکشن نے پہلے تو اس میں باؤنسر کے فرائض انجام دینے شروع کئے۔ باؤنسر اس شخص کو کہا جاتا تھا جو شراب خانوں اور کلبوں وغیرہ میں، نشے میں دھند ہو کر شور شرابہ کرنے یا دوسرے گاؤں کے لئے بد مزگی کا سبب بننے والوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیتا تھا۔ الیکشن کا قہر کچھ چونکا اچھا تھا اور وہ ایک مضبوط نوجوان تھا۔ وہ اس کام کے لئے موزوں تھا۔ لڑائی جھگڑے سے وہ گھبراتا بھی نہیں تھا۔

ایک پرانے اخبار کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ بعد میں کسی رپورٹر نے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ اس نے الیکشن کو اس کی جدوجہد کے شروع کے زمانے میں کبھی بکھار کلب کے دروازے پر بھی کھڑے دیکھا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں وہ اور کوٹ کے کار کھڑے کر لیتا تھا اور ہیٹ کا چھپاؤ را بھکا لیتا تھا۔

کسی ”موزوں“ قسم کے راہ گیر کو آتے دیکھ کر وہ یہ ظاہر ہے پروا سے انداز میں اس کے ہم قدم ہو کر چلنے لگتا تھا اور گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بڑبڑاتا تھا۔ ”ادھر بڑی حسین لڑکیاں موجود ہیں۔“

بہر حال الیکشن نے زیادہ عرصے اس قسم کے فرائض انجام نہیں دیئے۔ جان نوری نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ ایک باصلاحیت نوجوان تھا۔ وہ اس پر اعتماد کرنے لگا اور اہم ڈسے داریاں بھی اسے سونپنے لگا۔ الیکشن بھی اس کا بہت احترام کرتا تھا۔ اسے زیادہ واسطہ بھی جان نوری سے ہی پڑتا تھا۔ بگ جم کو کہ اس کا پارٹنر تھا لیکن الیکشن سے اس کا تعلق رکھی سا تھا۔

بگ جم اس دوران مالی طور پر بے حد مضبوط ہو چکا تھا۔ وہ شہر کی ممتاز شخصیات میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس کا کسی حد تک سیاسی اثر رسوخ بھی ہو گیا تھا۔ وہ میسر اور ایملڈ زمین کے الیکشن میں کھڑے ہونے والوں کو اطالویوں اور سیاہ فاموں کے ہزاروں ووٹ دلا سکتا تھا۔

الیکشن ایکس سال کی عمر میں جان نوری کی نظر میں خاصی اہمیت حاصل کر چکا تھا اور وہ اس سے بہت کچھ سیکھ بھی رہا تھا۔ کچی بات یہ تھی کہ وہ جان نوری سے کافی متاثر تھا۔ سردست وہی الیکشن کا آئیڈیل تھا۔

کچھ عرصے بعد ہیل نے اسے پیغام بھیجا کہ وہ چاہے تو نیویارک واپس آ سکتا ہے، لیکن الیکشن نے شکاگو ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ”فور ڈیوسز“ کلب کی عمارت میں سامنے کی طرف ایک حصہ خالی پڑا تھا۔ الیکشن نے اس میں تین چار پرانی میزیں اور ایک شوئیس لاکر ڈالا۔ شوئیس میں اس نے شیشیوں چھوٹی موٹی چیزیں بھر دیں۔ ایک کونے میں ایک گٹار دوسرے کونے میں ایک ایکویریم رکھ دیا۔

شوروم ٹاپ اس دکان کی پیشانی پر اس نے بورڈ لگا دیا: الیکشن: سینکڑ ہینڈ فرنیچر پٹر

اس نے اپنے کارڈ بھی چھپوائے جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سینکڑ ہینڈ فرنیچر اور نواد کا ڈیلر ہے۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ وہ کیا کرتا ہے، تو وہ مسکراتے ہوئے کہتا۔ ”میں ہر وہ چیز بیچ سکتا ہوں جو انسان کے کام آسکتی ہو۔“

پھر وہ اپنا ڈیننگ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھام دیا۔ قحط میں تیسری مرتبہ شکاگو کا میسر منتخب ہو چکا تھا۔ یہ ایک ریکارڈ تھا۔ مجموعی طور پر کرپشن اور جرائم بڑھ رہے تھے۔ 1920ء میں صرف نومبر کے مہینے میں لوٹ مار کے 250 واقعات پیش آئے جو ایک ریکارڈ تھا۔ اس سال تین سوئیل کی وارداتیں ہوئیں۔

اسی سال معزز شہریوں پر مشتمل ایک کمیشن قائم کیا گیا۔ اس کا نام ”شکاگو کرائم کمیشن“ تھا۔ شہریوں نے اس امید پر یہ کمیشن قائم کیا تھا کہ پولیس جو کام انجام نہیں دے پارہی تھی، شاید یہ کمیشن وہ کام کر سکے۔ یعنی جرائم کے اسباب تلاش کرنا اور ان کے سدباب کی کوششیں کرنا۔

ماہرین سماجیات اکثر یہ رائے دیتے ہیں کہ غربت جرائم کو جنم دیتی ہے۔ غریب لوگ اکثر ضروریات سے مجبور ہو کر جرم کی راہ اپنا لیتے ہیں۔ کافی حد تک یہ بات درست ہے لیکن کرائم کمیشن نے گہرے مشاہدے، باریک بینی اور بڑی تحقیق کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ شکاگو میں جرائم بڑھنے کی وجہ غربت نہیں تھی۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ بہت سے لوگوں نے جرائم کو پیشہ اور کاروبار بنالیا تھا۔ گروہ بھی ان کاموں میں پیش پیش تھے اور انفرادی سطح پر بھی شخص راتوں رات کھتی پھٹی ہونے کی فکر میں تھا۔

ادھر تین سال سے امریکا میں شراب کی تیاری اور فروخت پر کچھ پابندیاں عائد کرنے کے مطالبے ہو رہے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ شراب تیار کرنے اور فروخت کرنے کے لئے لائسنس وغیرہ کی پابندی عائد کی جائے۔ اس وقت تک جتنی بھی شرابیں تیار ہو رہی تھیں، بغیر کسی لائسنس اور بغیر کسی پابندی یا اندراج کے تیار ہو رہی تھیں۔ ان پر معمولی سے متاقی ٹیکس کے سوا کسی قسم کا کوئی ٹیکس عائد نہیں تھا۔ اسلئے ہر طرح کی شراب بہت سستی و دستیاب تھی۔

منسلک سیاسی اور اخلاقی دباؤ کی وجہ سے آخر کار 1920ء میں پارلیمنٹ نے کچھ قوانین منظور کر لئے جن کے تحت شراب کی تیاری، فروخت اور ایک سے دوسری جگہ لے جانے کیلئے اجازت ناموں وغیرہ پابندیاں لگائی گئیں اور کچھ ٹیکس بھی عائد کئے گئے۔

ان پابندیوں کی وجہ سے شروع میں تو امریکا میں گویا بوجھال سا آ گیا۔ پہلے پہلے تو کچھ ایسا ناشریہا ہو گیا جیسے شراب کوئی ممنوع چیز قرار دے دی گئی ہے۔ شراب تیار کرنے والے، سپلائی کرنے والے، فروخت کرنے والے اور پینے والے، سب ہی پریشان ہو گئے۔ ہر طرف ایک عجیب ہالہ کار سی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ملک پر کوئی بہت بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔

(جاری ہے)

عورتیں، ان کے اینجنس، جواہری اور کئی اڈوں کے مالکان بھی شامل تھے۔ اس نے کئی انتہائی بدنام اڈوں پر تالے لگی ڈلوادے لیکن مسند یہ تھا کہ اسے پولیس اور عدالتی نظام کی مدد صحیح طور پر حاصل نہیں تھی۔

جب معاملہ پولیس اور عدالتوں کے ہاتھ میں پہنچتا تھا تو خرابیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ ایک تو قانونی گھماؤ پھراؤ اور موٹگیالیاں آڑے آنے لگتی تھیں۔ دوسرے ان دونوں شعبوں میں خوب کرپشن تھی۔ انتظامیہ میں کف لین اور کینا جیسے لوگ موجود تھے۔

پولیس کا حال اور بھی زیادہ خراب تھا۔ علاقے کے پولیس اسٹیشن کے انخارج خود جرائم پیشہ لوگوں اور برے دھندے کرنے والوں کیلئے مغربی کرتے تھے اور انہیں وقت سے پہلے مطلع کر دیتے تھے کہ ان کے ہاں چھاپے پڑنے والا ہے۔ ان حالات میں فٹک کی کوششوں سے وہ نتائج تو حاصل نہیں ہو سکتے تھے جن کی وہ تیار رکھتا تھا لیکن بہر حال ان سے برائیوں اور جرائم کے پھیلنے پھولنے کی رفتار کچھ کم ہوئی۔

بگ جم اور جان نوری کے دھندوں پر گوکہ کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا تھا لیکن نوری نے بہر حال برے حالات کی آہستہ سنی لی تھی اور اسے اہمیت بھی دی تھی۔ وہ فوراً متوازی اور متبادل کاروبار شروع کرنے کے لئے سرگرم ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ صنعتی علاقے جو باری تیسرے صد کے قریب واقع تھے، آبادیوں سے کافی دور تھے۔ لوگوں کی بڑی تعداد مختلف شغلوں میں کام کرنے کے لئے وہاں جاتی تھی لیکن وہاں بڑی سڑکوں کے کنارے کہیں بھی ڈراؤ حٹک کے رینٹورٹس یا کسی قسم کی تفریح گاہیں نہیں تھیں۔

اس نے یہ بھی دیکھا کہ امریکا میں لوگوں کے پاس ذاتی کاریں نظر آنے لگی تھیں جن کی تعداد روز بروز تیزی جارہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کاروں میں ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھے گی اور انہیں بھی سڑکوں کے کنارے ہوٹلوں اور رینٹورٹس کی ضرورت محسوس ہوگی۔

چنانچہ جان نوری نے برن ہیم کے علاقے میں پہلا کلب نما رینٹورٹ کھول لیا۔ برن ہیم ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو وہاں سے قریب ہی تھا۔ وہیں سے اس کے لئے ملازم بھی مل گئے۔ جلد ہی جان نوری نے وہاں اپنے دوسرے دھندے بھی شروع کر دیئے۔ کھانوں اور شرابیوں وغیرہ کے علاوہ وہاں عورتیں بھی دستیاب ہونے لگیں۔ یہاں کاروبار کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ یہاں شکاگو کے کسی بھی علاقے کی پولیس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ گاؤں دیہات کی پولیس اور انتظامیہ کے جو بھی ٹھوڑے بہت لوگ ہوتے تھے، وہ خود ایسی جگہوں پر پارٹ ٹائم نوکری ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

بگ جم اور جان نوری اب باقاعدہ پارٹنر تھے۔ انہوں نے مل کر ایسے ہی مقامات پر مزید رینٹورٹ کھول لئے جن میں ہر ”سہولت“ دستیاب تھی۔ یوں گویا شہر کی خرابیوں کو مضامقات میں پناہ مل گئی۔

1914ء کے وسط میں شکاگو کے اس حصے میں بڑی کشیدگی پھیلی ہوئی تھی جو فرسٹ اور سینکڑ وارڈ اور اسی طرح کے کچھ دوسرے علاقوں پر مشتمل تھا۔ اس حصے کو مجموعی طور پر لیوی کہا جاتا تھا۔ اس علاقے میں اصلاحی ڈویژن کے ایک منبر کو قتل کر دیا گیا تھا۔ پھر مزید ستم یہ ہوا کہ جو سرانصرساں اس کے قتل کی تحقیقات کر رہا تھا، اسے بھی کسی نے جاقو گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ جس نائٹ کلب نما اڈے پر سرانصرساں کو قتل کیا گیا تھا اس کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا اور اسے بند کر دیا گیا۔ تاہم دوسرے کے وقت چونکہ مالک وہاں موجود نہیں تھا، اس لئے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکی۔

اس کا نام ابھری تھا۔ ایک روز وہ کسی اور کلب میں بیٹھا خوب پی رہا تھا۔ شاید اپنا اڈہ بند ہونے کا غم متا رہا تھا۔ نشے میں دھند ہونے کے بعد اس نے اپنی میز پر بیٹھے لوگوں سے لڑکھاتی آواز میں کہا۔ ”یہ فٹک کا بچہ اپنے آپ کو بھگتا کیا ہے۔ اس کا خیال ہے اسے شکاگو کو پاک صاف کرنے کا ٹھیکہ مل گیا ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں ہے کہ اس کا اپنا وقت قریب آ گیا ہے۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ جلد ہی اس کی۔۔۔۔۔ اور اس کے قریبی ساتھیوں کی لاشیں کہیں نہ کہیں پڑی ملیں گی۔“

اکثر شرابی نشے میں دھند ہونے کے بعد بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ کھوکھلے دعوے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن ابھری کے دعوے نے اس حالت میں بھی خاصی سنسنی پھیلا دی۔

اسی فضا اور اسی پس منظر میں ایک اور افسوسناک واقعہ رونما ہو گیا۔ اصلاحی اسکوڈ نے ایک روز جسم فروشی کے ایک اڈے پر چھاپے مارا اور کچھ لوگوں کو گرفتار کیا۔ یہ ظاہر یہ بھی ایک کلب تھا اور اس کا نام ”ٹرف“ تھا۔ اسکوڈ والوں نے اپنے دو آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ بڑی بھیگی کا بندوبست کر کے گرفتار شدگان کو اس میں بٹھا کر لے چلیں۔

وہ لوگ ایک دوسرے اڈے پر چھاپے مارنے چلے گئے۔ پیچھے اصلاحی اسکوڈ کے دونوں سادہ لباس والوں نے اپنے قیدیوں کو کچھ میں بٹھایا ہی تھا کہ سامنے سے علاقے کے کچھ چھوٹے نمونے بد معاش اور آوارہ سے لوگ ان کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے آ گئے۔ کسی نے ایک اینٹ بھی پھینک دی۔ اسکوڈ کے آدمیوں نے قدرے خوفزدہ ہو کر اپنی گتیں نکال لیں۔

اسی دوران پولیس کے دو اور سرانصرساں ادھر سے گزرتے وقت ہنگامے کی آوازیں اور شور شرابیں سن کر قریب آ گئے۔ انہوں نے جب دو سادہ لباس والوں کو بھوم کی طرف گتیں تانے دیکھا تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ اسکوڈ کے آدمیوں کو نہیں پہچانتے تھے۔ وہ سمجھے کہ شاید بد معاشوں نے شہریوں پر گتیں تانی ہوئی ہیں۔ گھبراہٹ میں انہوں نے بھی اپنی گتیں نکال لیں۔

اسی دوران گرفتار شدگان نے بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی اور اسی وقت جان نوری بھی فائر بریگیڈ کی گاڑی جیسے سرخ رنگ کی اپنی نئی کار میں وہاں سے گزرا۔ اس کی گاڑی سے ایک آدمی کو دھکے لگاتے ہوئے

بعد میں جمع ہونے والی بعض شہادتوں کے مطابق اس شخص کا جو حلیہ بتایا گیا، اس کے مطابق وہ جان نوری کا لڑکا راکھی ہو سکتا تھا لیکن دوسری چند شہادتوں میں جو حلیہ بتایا گیا، ان کے مطابق وہ بگ جم کا لگن مین پیٹرک بھی ہو سکتا تھا۔ ایک آدھ شہادت اس بات کی بھی ملتی کہ گاڑی میں بگ جم بھی موجود تھا۔

بہر حال محسوس اور ناقابل تردید شہادت کسی بھی بات کی نہیں مل سکی جیسا کہ اس قسم کے ہنگاموں میں اکثر ہوتا ہے۔ صحیح طور پر کسی کو بھی نہیں



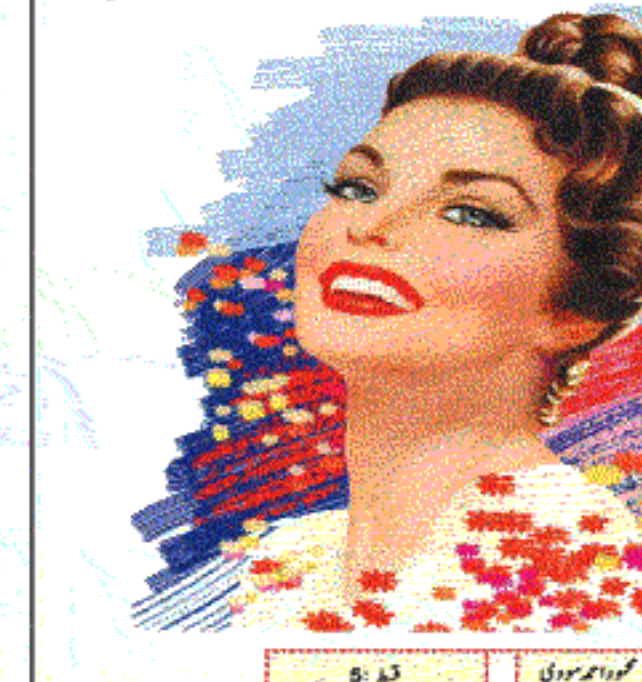
شراب کی تیاری، فروخت اور نقل و حمل پر بہت سی پابندیاں اور ٹیکس لگنا جہاں بہت سے لوگوں کیلئے پریشانی کا باعث تھا، وہاں جان نوریو کے لئے گویا یہ خوشی کی خبر تھی۔ اسکے دل کی مراد یہی تھی۔ وہ مستقبل پر بہت

خلاف ورزی پر جرمانے اور سزائیں بہت کم تھیں۔ زیادہ سے زیادہ سزا ایک سال تھی۔ بہت آگے جا کر بھی کوئی ایسی مثال سامنے نہیں آئی کہ کسی جج نے زیادہ سے زیادہ جرمانے یا قید کی سزا کسی مجرم کو دی ہو۔ اس معاملے میں ججوں کا رویہ بہت نرم رہا۔

# الکیون

## ALCAPONE

جرم کے بادشاہ کی انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز زندگی کہانی  
ماہی کالیک کراؤ کو کسی نہ کسی رُپ میں منظریتار متناہے



ترجمہ: محمود احمد سودی

قانون پر عملدرآمد کے سلسلے میں کسی مضحکہ خیز مثالیں بھی سامنے آئیں۔ امریکا میں قانون کی خواہش تھی خلاف ورزی ہوتی رہے لیکن قانون پر حرف بہ حرف عمل کرنے کا شوق بھی بہر حال امریکیوں کو رہا ہے۔ اگرچہ کچھ حرف یہ حرف عملدرآمد نہ بھی ہو سکے تب بھی انہیں یہ ظاہر کرنے کا شوق ضرور ہے کہ انہوں نے عملدرآمد کرنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی ہے۔

نئے قوانین میں درج تھا کہ غیر قانونی شراب کی نقل و حمل کے لئے جو سواری یا کوئی بھی دوسری چیز استعمال کی جا رہی ہوگی، اسے موقع پر ہی ضبط یا نایام کیا جاسکے گا۔ آنے والے دنوں میں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ ایک بینک کا پریذیڈنٹ اپنی چٹلون کی کچھلی جیب میں شراب کی ایک چٹنی اور چھوٹی بوتل رکھ کر پیدل ایک جگہ سے قریب ہی کسی دوسری جگہ جا رہا تھا۔

راستے میں اتفاقاً کسی پولیس والے نے تلاشی لے کر اس کی جیب سے وہ بوتل برآمد کر لی۔ اب سوال یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ بینک کے صدر کے خلاف تو جو کارروائی ہوگی، سو ہوگی لیکن کیا اس کی چٹلون کے بارے میں بھی کوئی کارروائی کی جائے؟ قانون کی رو سے دیکھا جاتا تو اس کی چٹلون شراب کی "نقل و حمل" میں استعمال ہو رہی تھی۔ کیا اسے موقع پر ہی ضبط یا نایام کیا جائے؟

دلچسپ بات یہ تھی کہ آئے دن پارلیمنٹ میں بھی اس قسم کے کسی نہ کسی سوال پر بحث ہوتی رہتی تھی کیونکہ ایسا کوئی نیکوئی واقعہ پیش آ جاتا تھا جس میں کوئی قانونی نکتہ عجیب انداز میں سامنے آ جاتا تھا اور وکیل اس صورتحال سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہ سب کچھ تو خیر بہت بعد میں ہوا لیکن جان نوریو نے حالات کا اندازہ شروع میں ہی لگا لیا تھا۔ اس کی شہرت ایک خطرناک آدمی کی تو تھی ہی..... لیکن وہ ایک شاطر برٹس میں بھی تھا۔ کاروبار کے میدان میں کس وقت، کس سمت میں قدم اٹھانا چاہئے، یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کچھ لوگ حالات سے بدول ہو کر شراب تیار کرنے کی فیکٹریاں جنہیں بڑبڑی کہا جاتا ہے، فروخت کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور جان نوریو ایسی دھندے میں زیادہ سے زیادہ دولت کماتے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

اس نے سستے داموں شراب کی دو فیکٹریاں خرید لیں جو نئے قوانین کا شور برپا ہونے سے پہلے ہی بند تھیں۔ چنانچہ وہ جان کو بہت ہی سستے داموں مل گئیں۔ کچھ اور بدعاش بھی یقیناً شراب کی تھیں بہت زیادہ بڑھنے کا اندازہ کر رہے تھے۔ اس کا ثبوت یوں ملا کہ جب نئے قوانین نافذ ہونے کا وقت قریب آیا تو کوئی علاقوں میں شراب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے ٹرک لوٹ لئے گئے۔

جان نوریو ان واقعات کے بارے میں پڑھ کر مسکرا دیا۔ اسے اعتراف تھا کہ یہ حرکتیں کرنے والے بھی تیز، شاطر اور مستقبل بین قسم کے لوگ تھے لیکن جان کے خیال میں انہوں نے بہت چھوٹے پیمانے پر حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ کوئی کروہ ایک یا دو ٹرک شراب کو آخر تک بیچ سکتا تھا؟ وہ تو اس صورت حال سے بہت بڑے پیمانے پر، اور مستقل طور پر فائدہ اٹھانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ ایک باقاعدہ بزنس یا صنعت چلانے جا رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اس میں سے حکومت کو کوئی حصہ دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اسکے خیال میں حکومت جب چیزوں پر بھاری اور غیر منصفانہ ٹیکس عائد کرتی تھی اور بڑی سودی لوگوں سے وصول کرتی تھی تو یہ بھی ایک طرح کی بہت خوری ہی تھی۔

وہ اپنے منصوبے پر بڑی مستعدی اور تندہی سے عمل پیرا تھا۔ تمام کام اپنی اپنی سمت میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن اسے ایک بہت بڑی تہذیبی کا احساس ہو رہا تھا جو اسے اپنی تیز رفتار ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ تہذیبی تھی کہ بے خوف اور دلیر بگ جم اب کچھ ڈر پوک اور بزدل ہوتا جا رہا تھا۔ دراصل وہ محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جان نوریو کو معلوم نہیں تھا کہ محبت انسان کو بڑی ہی بنا دیتی ہے۔ کم از کم بگ جم کے معاملے میں تو یہی ہوا تھا۔ جو جوں اس کی محبت میں شدت آتی تھی تو ان وہ زندگی کے بیشتر معاملات میں کم حوصلہ اور بزدل ہوتا گیا۔

اسکے ساتھ ایک عجیب معاملہ ہوا۔ وہ اچھا بھلا اپنی موٹی، بے ہنگم، بے کیف اور منہ پھٹ بیوی کو نور یہ کے ساتھ جین سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اب تو وہ عجیب قسم کے دھندوں سے بھی کافی حد تک نکل آیا تھا اور معززانہ قسم کے کاروبار چلاتے ہوئے ایک ممتاز بزنس مین بن چکا تھا مگر پھر اس کی زندگی میں ایک حسین مغنیہ اور قاصداً مگنی.....!

اس کا نام ڈیل ونٹر تھا۔ وہ ایک نہایت حسین اور سرورقہ عورت تھی جو ہر قدم پر فتنے چگاتی تھی۔ اس کا سراپا، اس کے نشیب و فراز، اس کا چہرہ نہایت دلکش تھا۔ گو کہ وہ زندگی میں خامے دھکے کھاتی ہوئی بگ جم تک پہنچی تھی لیکن اسکے چہرے پر مصومیت برقرار تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی حیرانی اور مصومیت لئے، اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکاتی تھی تو اس سے بات کرنے والے مردوں کے دل اٹھل پھٹل ہونے لگتے تھے۔

اس کی شخصیت اور صورت شکل جتنی اچھی تھی، قسمت اتنی ہی خراب تھی۔ وہ شکار گوسے کچھ دور کی چھوٹے قصبے میں رہتی تھی۔ گھریلو حالات اچھے نہیں تھے۔ ایسے میں اسے شکار گوا کوئی مجبور اور نوسر ہا سا آدمی ملا جس نے اسے شکار گوا میں اسٹیج کی ملکہ بنانے کے وعدے کئے۔ شاید اس بہانے اس نے وہاں بکھا اچھے اور ٹھیک دن بھی گزار لئے ہوں۔

نقصیت یہ تھا کہ ڈیل ونٹر اس کے ساتھ نہیں چل پڑی ورنہ شاید وہ بہت جلد جسم فروشی کے کسی اڈے پر جا پہنچتی۔ اس نے مجبوراً آدمی سے

دور تک نظر رکھنے والا آدمی تھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ نئے قوانین بہت سے لوگوں کو بے چارہ دولت مند بنانے کا ذریعہ بنیں گے۔ وہ خود کو بھی انہی لوگوں میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

اسے یقین تھا کہ جب شراب پر پٹی پابندیاں اور نئے قوانین لاگو ہوں گے تو اس کی قیمت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ اس وقت جو لوگ نئے قوانین کی زد سے باہر رہتے اور ٹیکسوں سے بچتے ہوئے شراب کا کاروبار کرنے کی ہمت کریں گے، وہ بہت دولت کمائیں گے۔ اگر کوئی صرف ایک بڑے شہر میں بھی اس کاروبار کو منظم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو بہت کم عرصے میں اس کے پاس دولت کے انبار جمع ہو جائیں گے۔

اس وقت پورے امریکا میں شراب بہت سستی تھی۔ گو کہ اس پر مقامی سطح پر معمولی سے ٹیکس عائد ہوتے تھے لیکن بعض لوگ ان سے بھی بچتے ہوئے شراب کی خرید و فروخت کا دھندہ کر لیتے تھے۔ جان نوریو نے دیکھا تھا کہ معمولی سے ٹیکسوں کی بچت کرنے والے وہ لوگ بھی اچھی خاصی اضافی دولت کماتے ہیں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اب تو بہت بڑے پیمانے پر دولت کماتے کا امکان پیدا ہو رہا تھا۔ ضرورت بس اس بات کی تھی کہ کوئی بہت ہوشیاری سے اس کاروبار کو منظم کرے۔ جان نوریو اپنے آپ کو اس کام کیلئے پوری طرح اہل سمجھتا تھا۔

صرف ایک بات سے اسے تھوڑا سا خوف محسوس ہوتا تھا اور وہ یہ تھی کہ نئے قوانین اور ٹیکس وغیرہ سب کچھ مرکزی حکومت کی طرف سے عائد ہو رہے تھے۔ یہ مقامی یا ریاستی معاملہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کی خلاف ورزی پر کارروائی بھی وفاقی سطح پر ہوگی۔ یعنی پکڑ چکڑ اور قانونی کارروائیاں ایف بی آئی کرے گی۔ ایف بی آئی جن معاملات میں مداخلت کرتی تھی، وہ ذرا ٹھیکین ہو جاتے تھے۔ بس یہ پہلو جان نوریو کے لئے ذرا تشویش کا باعث تھا۔

ایف بی آئی سے جان نوریو کو ایک بار پہلے بھی واسطہ پڑ چکا تھا۔ گو کہ اس وقت بھی اس کا براہ راست واسطہ نہیں پڑا تھا اور نہ آنا سامنا ہوا تھا لیکن اسے ایک ناخوشگوار تجربہ ضرور ہوا تھا۔

قصہ یہ تھا کہ ایک بار انہوں نے جسم فروشی کے اپنے ایک اڈے کی عورت کو اس کی مرضی کے خلاف دوسرے شہر بھیج دیا تھا۔ وہ پہلے ہی کچھ بھری چھٹی تھی۔ وہاں جا کر اس نے ہاتھ بٹانا شروع کر دیں اور ان لوگوں کے پول کھولنے لگی۔ اس کی ہاتھیں پولیس سے ہوتی ہوئی ایک ایف بی آئی ایجنٹ تک پہنچ گئیں۔ کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور کرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنا انہو کے ذمے میں آتا تھا اور یہ جرم ایف بی آئی کے دائرہ اختیار میں آتا تھا۔

جان نوریو نے ایک آدمی کے توسط سے اس ایف بی آئی ایجنٹ سے معاملہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پابند ارادہ آدمی تھا۔ کبھی بھی طرح رشوت لینے پر آمادہ نہیں ہوا۔ چنانچہ جان نوریو کو کوئی باقاعدہ مقدمہ بننے سے پہلے اس عورت کو گول کرنا اور اس کی لاش غائب کرنا پڑی تھی۔

اب جبکہ جان نوریو کوئی ٹیکس ادا کے بغیر اور کسی قانون کی پابندی کے بغیر بڑے پیمانے پر شراب کی تیاری اور فروخت کا کاروبار شروع کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو ایک بار پھر ایف بی آئی کے خوف نے اس کے ذہن میں سرا بھارا۔

جلدی اس کا یہ خوف دور ہو گیا۔ مرکزی حکومت نے فاضل آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ پیدا کرنے اور اصلاح پسندوں کو خوش کرنے کی غرض سے شراب کے بارے میں قانون کو تھپا لیا تھا لیکن اس کی تمام شتوں پر عملدرآمد کرانے کے لئے اس کے پاس پورے ملک میں خاطر خواہ حملہ نہیں تھا۔ تھپا ایف بی آئی یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ اسکے پاس ملک بھر میں اتنے زیادہ لوگ تو نہیں تھے اور پھر ایف بی آئی کو دوسرے بہت سے کام ہوتے تھے۔

چنانچہ ان قوانین پر عملدرآمد کیلئے سروسٹ عارضی طور پر کچھ عہدہ ہر شہر میں بھرتی کیا گیا۔ اس کیلئے امیدواروں کو ایک امتحان بھی پاس کرنا تھا۔ امتحان پاس کرنے کے لئے دو مواقع دیئے جا رہے تھے۔ آدھے سے بھی کم امیدوار دو مواقع میں یہ امتحان پاس کر پا رہے تھے۔ حالانکہ امتحانی پرچہ بہت آسان اور مختصر ہوتا تھا۔ اس کی تیاری کے لئے مواد بھی فراہم کیا جاتا۔

پاس ہونے کے بعد جن لوگوں کو تعینات کیا جاتا تھا، ان کی حیثیت سرکاری نہیں ہوتی تھی اور ان کی تنخواہ بھی بہت کم تھی، یعنی سالانہ بارہ سو سے دو ہزار ڈالر کے درمیان۔ اس زمانے میں بھی گلیوں میں چھاڑو دینے والے اس سے زیادہ تنخواہ لے رہے تھے۔ گھروں پر آ کر کوڑا کرکٹ بیچ کر کے گاڑیوں میں لا کر لے جانے والوں کے معاوضے بھی اس سے زیادہ تھے۔

تعینات کئے جانے والے ان لوگوں کو فیلڈ ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ کم مشاہرے کی ان نوکریوں پر بھی زیادہ تر ترقی ریاں سیاستدانوں کی سفارش پر ہو رہی تھیں۔ اسکے باوجود ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ پورے ملک میں فیلڈ ایجنٹ کل چند سو کی تعداد میں تعینات کئے گئے تھے۔ ظاہر ہے اتنے افراد پورے ملک میں شراب کے معاملات کو کنٹرول کرنے کیلئے نا کافی تھے جبکہ شراب روزمرہ زندگی کا ایک حصہ تھی۔

شروع میں ان کی تعداد بڑھتی تھی۔ بعد میں فیلڈ ایجنٹس کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ کر 2300 تک پہنچی۔ لیکن یہ بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی۔ یہ ساری صورتحال بد عنوانی اور رشوت خوری کو دھت دینے والی تھی۔ کسی مجرم کے تحت اگر یہ سارے ایجنٹ نہایت دیانتدار بھی ہو جاتے تب بھی تمام معاملات کو صحیح طور پر کنٹرول کرنا اتنے کم لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

کرپشن کو دھت دینے والی دوسری بات یہ تھی کہ نئے قوانین کی

وعدہ کیا کہ وہ کچھ عرصے بعد شکار گوا لے گی اور اس سے ملے گی۔ مجبوراً آدمی کا دعویٰ تھا کہ شکار گوا میں اس کی حیثیت اسٹیج کے بادشاہ کی سی ہے۔ وہ خود ادا کار نہیں تھا لیکن بڑے بڑے پروڈیوسر اسکے مشورے کے بغیر ڈرامہ تیار نہیں کرتے تھے اور بڑی بڑی معروف ہیرئیں اس سے پوچھتے بغیر کوئی ڈرامہ سائن نہیں کرتی تھیں۔ اس نے ڈیل ونٹر کو اپنے دفتر کا پتہ دیا تھا جس میں، بقول اس کے، شو بزنس کے بڑے بڑے لوگوں کا ٹھکانہ رہتا تھا۔

کچھ عرصے بعد ڈیل ونٹر اپنی کشتیاں چلا کر اس پتے پر پہنچی تو وہاں کوئی دفتر نہیں تھا۔ وہاں بڑی سی ایک دکان تھی جسے چلانے والوں نے بھی اس مجبور آدمی کا نام بھی نہیں سنا تھا اور نہ ہی وہ اس صلیب کے کسی شخص کو جانتے تھے۔

ڈیل ونٹر کی دن اس کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ اس کے پلے جو تھوڑی سی رقم تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔ وہ پریشان حال، ادھر ادھر دھکے کھاتی اور بد قماشوں سے بچتی بچاتی پھر رہی تھی۔ اس کا انجام نہ جانے کیا ہوتا، مگر قسمت نے اس پر تھوڑی سی مہربانی کی کہ اس کی ملاقات آر تھر سے ہوگئی۔

آر تھر اس کے قصبے کا تھا۔ وہ لڑکپن میں ہی موسیقار بننے کا شوق دل میں لئے شکار گوا گیا تھا۔ اس نے مختلف ساز بجانے کی تربیت حاصل کی تھی۔ کئی ٹائٹ گلیوں میں سازندوں میں شامل رہا تھا۔ اب اسے خاصا اچھا موسیقار سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں وہ بگ جم کے کلب میں تمام سازندوں کا انچارج تھا۔ وہ اپنی جگہ ایک چھوٹا موٹا میوزک ڈائریکٹر تھا۔

اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ ڈیل ونٹر کو جانتا تھا۔ صرف یہی نہیں، لڑکپن اور نوجوانی میں اس کے دل میں ڈیل کے لئے ویسے ہی عشقیہ اور رومانی جذبات تھے جیسے اکثر نوجوانوں کے دلوں میں کسی غیر معمولی حسین اور دلکش لڑکی کیلئے ہوتے ہیں۔ ڈیل اس وقت نوجوان اور کم عمری تھی۔ آر تھر اس سے عمر میں خاصا بڑا تھا۔

دونوں کے درمیان چند ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں مگر وہ سیدھی سادی، معصوم اور بے ضرری ملاقاتیں تھیں۔ ڈیل ونٹر کو لگے اور اداکارہ بننے کا شوق اس وقت بھی تھا۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی اور اس نے گانے کی تربیت بھی لینا شروع کر دی تھی۔

جب آر تھر شکار گوا آیا تھا تو اس کا ڈیل ونٹر سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا اور وہ اپنی زندگی کی بھاگ دوڑ میں الجھ کر اسے بھول گیا تھا۔ بس دل میں ایک ٹھنکی سی سک باتی تھی۔ اب اچانک ڈیل ونٹر سے سامنا ہوا تو بچپن اور لڑکپن کی دھندلی یادیں واضح ہوتی چلی گئیں۔ ڈیل اب بچپن سال کی تھی اور آر تھر تقریباً پچیس سال کا تھا۔ وہ اب شادی شدہ تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔

وہ اب ڈیل سے شادی تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کی مدد ضرور کر سکتا تھا۔ وہ اس نے کی۔ دونوں جب ایک دوسرے کو اپنا اپنا احوال سنا چکے تو آر تھر نے اسے کچھ اچھے لباسات دلوائے۔ اچھی جگہ کھانا کھلایا اور قدرے بہتر جگہ پر اس کے قیام کا انتظام کیا۔ وہ ایک سستی اور گھٹیا سی سرائے میں ٹھہری ہوئی تھی۔

بہر حال یہ سب عارضی انتظامات تھے۔ اصل مسئلہ تو مستقل انتظامات کا تھا۔ آر تھر نے کافی سوچا کہ وہ ڈیل کیلئے کیا کرے؟ آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ اسے بگ جم سے متعارف کرا دے اور اس کی سفارش کرے۔ بگ جم بہر حال بطور پاس خاصا اچھا آدمی تھا۔

اس نے ڈیل کو ساتھ لے جا کر بگ جم سے ملوایا اور اسکے بارے میں سب کچھ سچ بتا دیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بگ جم ایک نلک ڈیل کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ آر تھر کو اس بات پر اس لئے حیرت تھی کہ وہ بگ جم کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس کی زندگی کے معمولات کو کافی قریب سے دیکھتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ عورت بگ جم کے لئے کوئی انوکھی چیز نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ عورتوں میں گھرے ہوئے گزارا تھا جن میں سے بعض غیر معمولی حسین بھی تھیں..... لیکن ڈیل کو بگ جم نے کچھ ایسی حیرت، اشتیاق اور اٹھناک سے دیکھا تھا جیسے گاؤں دیہات کے کسی نوجوان اور سادہ لوح لڑکے نے کسی حسین عورت کو پہلی بار اپنے قریب دیکھا ہو۔

بگ جم نے خوشی سے اسے اپنے کلب میں گانے کی اجازت دے دی۔ یہاں ڈیل کی قسمت اور اس کی صلاحیتوں نے اس کی کچھ اور مدد کی۔ اس نے کلب میں گانا کیا گیا، گویا میلہ لوٹ لیا۔ تماشاویوں اور سامعین نے دل کھول کر داد دی۔ وہ اس کے سراپا اور اس کی آواز پر فردا ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

ڈیل کا آزمائشی شو کامیاب رہا تو بگ جم نے اسے مستقل طور پر وہاں گانے اور رقص کرنے کی اجازت دے دی۔ ڈیل نے روزانہ وہاں اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ حالانکہ اس نے ناچنے اور گانے کی کوئی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی اور یہ کام ذہنک سے نہیں سیکھے تھے مگر اس میں گویا فطری طور پر کچھ ایسا صلاحیتیں موجود تھیں۔ اسے محفل کی جان بن جانے کا ہنر آتا تھا۔

بگ جم نے مرتبہ بیانوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی جو تنخواہ مقرر کی تھی وہ اس وقت کے لحاظ سے معقول تھی لیکن جلد ہی ڈیل کو وہ ناکافی محسوس ہونے لگی۔ ایک تو اسکے مسائل زیادہ تھے، دوسرے اسکے خواب اونچے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں میں جو خواب سجا کر شکار گوا کی تھی، ان میں رنگ بھرنے کے لئے یہ قلم نا کافی تھی۔

تاہم اس نے بگ جم سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ وہ ایک سمجھدار اور معقول عورت تھی۔ اسے احساس تھا کہ بگ جم نے اس کے ساتھ اچھا ہی سلوک کیا تھا۔ وہ چاہتا تو اس کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔ اس سے بھی کم معاوضہ دے کر اس سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتا تھا۔

چنانچہ ڈیل نے قریبی چرچ میں بھی ملازمت حاصل کر لی۔ وہاں وہ عبادت گزاروں کے سامنے مناجات اور مذہبی گیت پڑھنے لگی۔ ٹائٹ کلب میں وہ ایسا لباس پہنتی تھی، جس میں اس کے دلکش خد و خال نمایاں ہوں۔ اس لباس میں وہ حاضرین کا دل لہانے والے انداز میں ان کے درمیان لہراتی اور گاتی ہوئی ادھر سے ادھر جاتی تھی مگر چرچ میں نہایت بڑ وقار انداز میں مقدس چہورتے پر کھڑی ہو کر مذہبی اور عانیہ گیت گاتی تھی۔ اس کے جسم پر ڈھلا ڈھالا لبادہ ہوتا تھا اور سر بھی ڈھکا ہوا ہوتا تھا۔ آواز اس کی بہت اچھی تھی۔ وہ چرچ میں بھی اپنا جادو چگاتی تھی۔

لیکن چرچ میں جلد ہی اس کے دہرے کردار کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹائٹ کلب میں وہ جو کچھ کرتی تھی اس کا معاملہ زیادہ عرصے تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ باتیں تو بہت تیزی سے پھیلتی ہیں اور پھر اتوار کے اتوار چرچ میں حاضری دینے والوں میں سے تو بہت سے ایسے تھے جو ٹائٹ کلب میں بھی اسی لگن سے جاتے تھے۔

چنانچہ پہلے تو دے دے انداز میں اعتراضات ہوئے پھر اچھا خاصا شور مہونے لگا۔ چرچ کی انتظامی کمیٹی پر دباؤ پڑنے لگا۔ ایک سرگرم مذہبی کارکن نے بچھوں سے جھاگ اڑاتے ہوئے جوش و خروش اور غیظ و غضب کے عالم میں تقریر کی۔ "..... یہ بھلا کیا بات ہوئی؟ ایک عورت جو ٹائٹ کلب میں بیجان خیر موسیقی کی دھن پر ہنسنے لگتی ہو، جس کی حرکات و سکنات دعوت گناہ دہتی محسوس ہوں اور جو بے حیائی سے اپنے جسم کے نشیب و فراز نمایاں کرتی ہو، مردوں کے جذبات ابھارنے

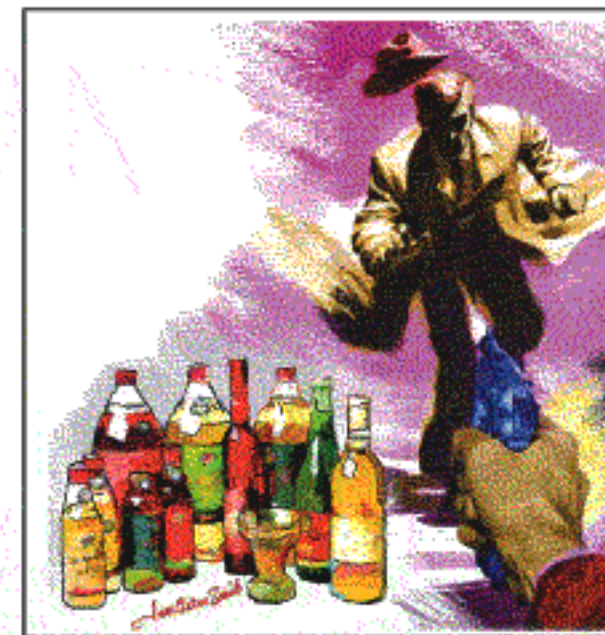


والے گھٹیا اور عامیانه گانے گاتی ہو، وہی چرچ میں مقدس چپوترے پر

کھڑی ہو کر مناجات اور دعا کیے گیت پڑھے، مذہبی ترانے گائے۔ اس سے بڑی منافقت کیا ہوگی؟ یہ تو بیک وقت خدا اور شیطان، دونوں کی

صرف اپنا ناک کلب چلا رہا تھا اور اپنی پوری توجہ اسی پر صرف کرتا تھا۔ وہاں کوئی خاص معیوب دھندہ نہیں ہوتا تھا۔ جس انداز میں بگ۔ جم

ناٹ کلب چلا رہا تھا، اسے اونچے طبقے میں کوئی معیوب کاروبار نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک اچھے ناٹ کلب کا مالک ہونا اونچی سوسائٹی میں



معرز ہوئے کی نشانی تھی۔ بگ جم بھی اب شہر کے معزز طبقے میں شامل ہو چکا تھا اور شاید وہ اب اپنی اس پوزیشن کو انداز کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جان نور یو محسوس کرتا تھا کہ بگ جم اب غیر قانونی اور معیوب دھندوں سے کچھ خوف کھانے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ معاشرے میں بڑی مشکل سے اسے جو حیثیت حاصل ہوئی تھی، وہ اس کی نظر میں بہت اہم ہو گئی تھی اور وہ اسے کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ جان نور یو کو تو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ بگ جم بڑول ہو گیا تھا۔ جان نور یو کو اس سے پہلے معلوم ہی نہیں تھا کہ کبھی کبھی محبت انسان کو بڑول بھی بنا دیتی ہے۔

جان نور یو نے اس سے جب بھی مستقبل کے منصوبوں پر بات چیت کرنے کی کوشش کی، اس نے ذرا بھی دلچسپی نہیں لی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے کسی بھی خطرناک دھندے سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے زندگی سے محبت ہو گئی تھی کیونکہ اس کی زندگی میں محبت آگئی تھی۔ وہ اب زندہ رہتا اور محبت کی اس مشاس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ وہ گولی کھانے، جیل جانے یا کہیں فرار ہونے پر مجبور ہونے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ سیدھے سادے شریفانہ انداز میں قناعت پسندی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔

جان نور یو اس تبدیلی کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہا تھا بلکہ کبھی کبھی تو اس کے دل میں غصے کا ہال بھی اٹھنے لگتا تھا۔ کیا یہی وہ شخص تھا جس کے لئے اس نے اسے خطرات مول لئے تھے؟ اس کے دھندوں کے لئے اتنی "محنت" کی تھی؟

مشکل یہ تھی کہ اس کے تعاون اور سرپرستی کے بغیر جان نور یو اب بھی اپنے آپ کو کافی کمزور اور ہلکا محسوس کرتا تھا۔ صورت حال خواہ کچھ بھی تھی لیکن بگ جم کی حیثیت اب بھی پاس ہی کی تھی۔ اس کے بغیر آگے بڑھتے ہوئے جان نور یو اپنے آپ کو اوجھڑا محسوس کرتا تھا۔

اس دوران شراب کی تیاری اور کاروبار کے سلسلے میں نئے قوانین نافذ ہو چکے تھے اور چھوٹے موٹے بدعاشوں نے بھی نہایت غیر منظم اور بے وقوفانہ انداز میں غیر قانونی شراب کا کاروبار کرتے ہوئے اچھی خاصی دولت کماتا شروع کر دی تھی۔ جان نور یو کو یہ دیکھ کر غصہ آ رہا تھا۔ وہ تو نہایت منظم انداز میں یہ کاروبار کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا جو بگ جم کی عدم دلچسپی کی وجہ سے گویا کسی مشین کی طرح پڑا پڑا لنگ خورہ ہو رہا تھا۔

جان نور یو اسے اس طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا اور بگ جم طلاق اور شادی کی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ایک روز رازدارانہ مگر خاصے پر جوش انداز میں جان نور یو کو بتایا۔ "میں نے کنویر یہ طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسکے بعد میں ڈیل سے شادی کروں گا۔ میرے دوست..... تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک اچھی اور پیار کرنے والی عورت سے شادی کی خوشی کیا ہوتی ہے!"

جان نور یو کو سخت غصہ آتا تاہم اس نے غصے کے زہر کو دل ہی دل میں دبائے ہوئے غرانے کے سے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے..... زندگی تمہاری اپنی ہے۔ تم اس کے بارے میں جو فیصلے چاہو کر سکتے ہو۔"

اسے بگ جم کے اس طرح محبت میں دیوانہ ہو جانے پر حیرت بھی ہوتی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ شادی تو میں نے بھی کی ہے، میری بیوی بھی ڈیل کی طرح خوبصورت اور محبت کرنے والی ہے۔ میں بھی اسکے ساتھ شریفانہ اور معززانہ زندگی گزارتا ہوں۔

اس کی یہ سوچیں کچھ ایسی غلط نہیں تھیں۔ اس نے 1912ء میں شادی کی تھی۔ اس کی بیوی کا نام ایسا تھا۔ شادی کے وقت جان نور یو تیس سال کا، بیک وقت تیس سال کی تھی۔ وہ ایک اچھے خاندان کی، خوش شکل اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ بس ان لوگوں کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ وہ قدرے غریبانہ علاقے میں رہتے تھے۔

تاہم شادی کے فوراً بعد جان نور یو نے ایک اچھے علاقے میں اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ تب سے اب تک وہ ایک پرسکون اور شریفانہ گھریلو زندگی گزار رہا تھا۔ انکی گھریلو زندگی میں اسکے دھندوں کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ وہ شراب کا دھندہ کرتا تھا مگر خود شراب نہیں پیتا تھا۔ شراب تو کیا، وہ گھریلو بھی نہیں پیتا تھا۔ وہ جسم فروشی کے اڈوں کا نگران اور تقریباً مالک و مختار تھا لیکن کسی پیشہ ور عورت کے قریب نہیں جاتا تھا۔

گویا کبھی اور گھریلو زندگی میں وہ ایک صاف سحر اور معزز آدمی تھا لیکن نہ جانے کیوں بجز نام کے کاروبار نہایت منظم انداز میں اور بہت بڑے پیمانے پر کرنے کی خواہش اس میں بڑی شدت سے موجود تھی۔ وہ زندگی کے دیگر تمام معاملات کو پس پشت ڈال کر اس بچ پر انتہائی سنجیدگی اور تفصیل سے سوچتا رہتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی ذہنی مصروفیت یہی تھی۔

گھریلو زندگی میں اس کی بیوی ایسا اس سے بہت خوش تھی اور اس کے بارے میں کہا کرتی تھی۔ "میرا شوہر دنیا کے تمام شوہروں سے اچھا ہے۔ اس کے ساتھ میری اب تک کی زندگی ایک طویل عرصے میں اس طرح گزری ہے جس میں کبھی کوئی بدحظی نہیں آئی۔"

اپنی نئی زندگی کو دیکھتے ہوئے جان نور یو ہجرت سے سوچتا تھا کہ آخر وہ بھی تو ایک خوبصورت اور محبت کرنے والی بیوی کا شوہر ہے اور اپنی گھریلو زندگی کی تمام ذمے داریاں اچھے طریقے سے پوری کر رہا ہے۔ وہ جبے گھر چلا جاتا ہے اور باقی وقت سکون سے اپنی بیوی کے ساتھ گزارتا ہے..... لیکن وہ کسی بھی کاروبار کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ آخر بگ جم پر ایسی کون سی آفت ٹوٹ پڑی تھی یا اس کی محبوبہ دنیا کی ایسی کوئی انوکھی عورت تھی جس کے حشر میں گرفتار ہو کر وہ اپنے ایک کلب کے ساہرا کاروبار سے بے خبر ہو گیا تھا؟

وہ اپنی جگہ یہی سب کچھ سوچ کر دل ہی دل میں خار کھاتا رہا۔ ادھر مارچ 1920ء میں بگ جم نے کنویر یہ کو طلاق دے دی۔ اس نے اسے پچاس ہزار ڈالر دیئے اور اس الزام کے ساتھ عدالت میں اس سے جان چھڑائی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

کنویر یہ نے طلاق کے صدمے کو ذرا بھی دل سے نہیں لگایا۔ اس نے طلاق کی کارروائی مکمل ہونے کے دو ہفتے بعد ہی اپنے سے بیس سال چھوٹے ایک نوجوان انونیو سے شادی کر لی جو قبروں کے کتبے تیار کرنے کا کام کرتا تھا لیکن موقع ملے پھر چھوٹی موٹی چھری چکانا بھی کر لیتا تھا۔

ادھر بگ جم اور ڈیل ونٹر نے شادی کے لئے اٹھایا نا کارخ کیا جہاں جلد از جلد شادی کی اجازت مل جاتی تھی۔ بگ جم نے اپنی شادی پڑائے ہوئے مہمانوں کی تقریب طبع کے لئے ایک سرسک بلایا جوان دنوں وہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ سرسک میں شامل ریچھ کے ایک بچے نے ایک مہمان کے بازو پر کاٹ لیا۔ اس چھوٹی سی بدحظی کے علاوہ بگ جم کی شادی کے دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا۔

پنٹی مون منانے کیلئے بگ جم اور ڈیل ویٹ بیڈن کے علاقے میں چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد وہ اپنے علاقے میں لوٹ آئے۔ بگ جم اپنی دوسری بیوی کو ساتھ دوڑن میں واقع اپنے حلی نامکان میں لے گیا جو اس کے ناٹ کلب سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس دوران جان نور یو نے اپنی تیاریاں شروع کر دی تھیں مگر یہ

تیاریاں کچھ روز قسم کی تھیں۔ اس کا ابھرتا ہوا جوان نائب جسے کروہوں کی زبان میں لیفٹیننٹ کہا جاتا تھا، الگ ہوا تھا جس پر وہ پوری طرح اعتماد کرنے لگا تھا۔ جان نور یو نے الگ ہونے سے مشورہ کیا۔ دونوں نے سر جوڑ کر کئی دن تک صلاح مشورے کئے۔ انہیں ہر پہلو پر غور کرنا تھا، ہر بات کا خیال رکھنا تھا۔ وہ کوئی کچا قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی سراغ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار الگ ہونے کے مشورے پر نئیو یارک سے تیلی کو بلا لیا گیا۔

بگ جم کو جتنی مون سے واپس آئے ایک ہفتہ گزرا تھا جب جان نور یو نے اسے فون کیا اور بتایا۔ "لیری کے پاس لوٹی ہوئی دسکی کے دو ٹرک ہیں جو وہ جہیں دینا چاہتا ہے۔ تم اگر شراب کے بڑے بزنس میں دلچسپی نہیں لے رہے تو نہ سکی..... لیکن کم از کم یہ مال تو خرید لو۔ کوڑیوں کے دام مل جائے گا۔ دو ٹرکوں کا کیا ہے، وہ تو تمہارے کلب میں ہی کھپ جائیں گے۔"

بگ جم نے گویا بادل ناخاستہ آدمی کا ظہر کی۔ لیری ایک گروہ کا کارندہ تھا جو انٹرلوٹ کا مال مختلف لوگوں کو بیٹا رہتا تھا۔ بگ جم اور جان نور یو دونوں ہی اسے جانتے تھے۔

"تو پھر مشکل کو تم اپنے معمول سے کچھ پہلے کلب پہنچ جاؤ۔" جان نور یو نے بات آگے بڑھائی۔ "پار بیچ آ جاؤ۔ لیری کلب میں تمہارا منتظر ہوگا۔ اس کے ساتھ تفصیلات ملے کر لو کہ وہ ڈیوری کہاں دے گا اور اسے رقم کس طرح دی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گا۔" بگ جم نے کہا تاہم اس کے لہجے میں جوش یا خوشی نہیں تھی۔

ڈیل نے اس روز شاپنگ کے لئے جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ اس کی ماں کو بھی اس کے ساتھ جانا تھا جواب گاؤں سے آ کر اسی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ بگ جم نے اس سے کہا کہ وہ کلب چا کر گاڑی واپس بھجوا دے گا تا کہ ڈیل اور اس کی ماں شاپنگ کے لئے جا سکیں۔

بگ جم کلب میں عام طور پر پکھلے دروازے سے داخل ہوتا تھا۔ اس طرف چھوٹا سا ایک آفس تھا جس میں اس کا کالکٹ فریک بیٹھتا تھا۔ بگ جم سب سے پہلے اسی سے ویلو ہائے کرتا تھا اور پوچھتا تھا۔ "کیا ہو رہا ہے فریک؟"

"کچھ نہیں۔" عام طور پر فریک کا جواب یہی ہوتا تھا۔ اگر کسی روز کوئی خاص بات ہوتی تھی تو وہ اسے وہیں بتا دیتا تھا۔

اس روز بھی بگ جم نے وہی سوال کیا اور فریک نے وہی جواب دیا۔ پھر بگ جم نے دریافت کیا۔ "کیا میرے آفس میں کوئی جھ سے ملنے آیا ہوا ہے؟"

بگ جم کا آفس کلب کے سامنے کی طرف داخلے کے دروازے کے قریب تھا۔ اگر وہاں کوئی جھ سے ملنے آیا ہوتا تھا تو کوئی اور خاص بات ہوتی تھی تو فریک کو اس کا علم ہوتا تھا۔

"نہیں ہاں..... ابھی تو آپ سے ملنے کوئی نہیں آیا۔" فریک نے جواب دیا تو بگ جم کو حیرت ہوئی۔ اس کے خیال میں تو لیری کو اس سے ملاقات کے لئے موجود ہونا چاہئے تھا۔ پھر اس نے یہی سوچا کہ شاید کسی وجہ سے لیری کچھ تاخیر سے آئے۔ اس نے چند لمبے فریک سے بات چیت کی پھر حقیقی برآمدہ نما حصے میں چلا گیا۔ وہاں رک کر اس نے مزید چند منٹ کلب کے دوسرے ملازموں سے کچھ باتیں کیں۔ پھر وہ سامنے والے حصے کی طرف روانہ ہوا۔

چار سو جا رہے کا وقت ایسا تھا جب کلب میں تقریباً ویرانی ہی ہوتی تھی۔ ایسی جگہوں پر رونق تو شام ڈھلے شروع ہوتی تھی۔ وہ ایک راہداری نما حصے سے گزرتے آفس کی طرف جا رہا تھا جب دو دھماکے ہوئے۔ کلب کے ملازموں کو ان آوازوں پر تشویش ضرور ہوئی لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ گولیوں کی آواز بھی ہو سکتی ہے۔ کلب کی اب تک کی تاریخ پر سکون ہی رہی تھی۔ وہاں اب تک کسی فائر کی تو کیا، بول ٹوٹنے کی آواز بھی نہیں ابھری تھی۔

فریک اور کلب کا خاندان اس جب سامنے والے حصے کی طرف آئے تو انہوں نے شیشوں والے چار پٹ کے، گھومنے والے دروازے سے اندر کی طرف ایک راہداری نما حصے میں بگ جم کو اندھ سے پڑے دیکھا۔ اسکے سر کے ارد گرد خون جمع ہو رہا تھا اور وہ عجیب انداز میں آڑا تر چھا پڑا تھا۔

فریک اور خاندان اس قدر بدحواس ہوئے کہ پہلے تو وہ عورتوں کی طرح خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹے مگر جب ان کی آواز سن کر کچھ اور ملازم آگئے تو ان کے حواس کچھ ٹھکانے آئے اور انہوں نے بتایا کہ انہیں بگ جم ہی اس طرح پڑا نظر آیا ہے۔ انہوں نے کسی کو آتے، جاتے دوڑتے بھاگتے یا آس پاس نہیں کھڑے نہیں دیکھا تھا۔ بگ جم کا اپنا پتھول اس کی ہپ پاٹ میں موجود تھا۔

ایک گولی کا ٹکٹھ کے سرے کی دیوار کا پلستر اکھاڑتے ہوئے اسی میں پیوست ہو گئی تھی۔ دوسری گولی بگ جم کے کان کے پیچھے لگی تھی اور وہ فوراً ہی ہلاک ہو گیا تھا۔

بگ جم کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ پولیس چیف خود اپنے سرخرو سالوں کی پوری ٹیم اور دیگر افسروں کے ساتھ فوراً پہنچا۔ اس کے چند محسوس بعد جان نور یو بھی آن پہنچا۔ وہ سخت حیرت زدہ اور حواس باختہ دکھائی دے رہا تھا۔

جائے وقوع پر بھی بہت دیر تک تفتیش ہوئی اور بعد میں بھی کافی دنوں تک تفتیش جاری رہی۔ چھوٹی چھوٹی شہادتیں جمع کی گئیں۔ کانڈ کے چھوٹے چھوٹے پڑوں کا بھی صوبہ عدسوں سے معائنہ کیا گیا اور ان کی تحریروں پر داغ سوزی کی گئی۔ بیسیوں لوگوں سے بیانات اور شہادتیں لی گئیں مگر قاتل کا کوئی سراغ نہ ملا۔

صرف ایک بیان پولیس کی نظر میں اہم ٹھہرا۔ ایک آدمی نے بتایا کہ شیشے کا چار پٹ والا اور گھومنے والا دروازہ جس فٹ پاتھ کی طرف تھا، اس پر اس نے دھماکوں کی آواز سے ذرا پہلے ایک شخص کو کھڑے دیکھا تھا۔ گواہی دینے والے نے وہاں سے گزرتے وقت صرف ایک لمبے کے لئے اس کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ جس حد تک اس کا چہرہ اور حلیہ دیکھ پایا تھا، وہ اس نے بتا دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بعد میں اس شخص نے کیا کیا کیا وہ کہاں گیا؟

پولیس نے اس گواہ کا بیان کردہ حلیہ محفوظ کر لیا تھا۔ پولیس کو یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ کسی گروہی لڑائی یا پچھلتی کا شاخسانہ نہیں تھا۔ یہ قتل نہایت خفّہ دل سے، خوب سوچ بچار اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یہ کوئی اندر ہی کی کہانی معلوم ہوتی تھی..... لیکن اصل مسئلہ ثبوت کا تھا۔ ثبوت کے بغیر کسی کے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ڈیل ونٹر اس وقت شاپنگ میں ہی مصروف تھی جب اسے بگ جم کے قتل کی خبر ملی۔ وہ وہیں پکرا کر گری اور بیہوش ہو گئی۔ دو دن بعد بھی وہ بچھاؤ نہیں لے سکی اور گری کر رہی تھی۔ "میرا جم دنیا سے چلا گیا..... میرا تو سب کچھ چلا گیا..... میں اب جی کر کیا کروں گی۔"

تفتیش کے دوران کئی آدمی پولیس کے شبہات کی زد میں آئے۔ ان میں بگ جم کی سابق بیوی کنویر یہ کے دو بھائی بھی شامل تھے۔ بگ جم نے ان کی بہن کو طلاق دی تھی۔ ان کے دلوں میں بگ جم کے لئے غم و غصہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح کے مفروضوں کے تحت پولیس نے کئی افراد کو شامل تفتیش کیا مگر سب کے پاس جائے وقوع سے اپنی غیر حاضری کا ٹھوس ثبوت موجود تھا۔

بگ جم کی تدفین کے معاملے پر بھی خاصا تنازع رہا۔ آرج بپش نے ناگوار سے اسے اعلان کر دیا کہ بگ جم کو کئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس کے کاروبار مشکوک تھے۔ وہ کبھی چرچ میں نہیں آیا۔ اس نے کبھی چرچ کے لئے چندہ نہیں دیا۔ لہذا اس کی تدفین کیتھولک چرچ کے قبرستان میں نہیں ہو سکتی تھی۔ بہر حال یہ کوئی عقین مسئلہ نہیں تھا۔ جلدی تدفین کے متبادل انتظامات کر لئے گئے۔

(جاری ہے)

خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور ہم اس گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ غضب خدا کا..... اسے عبادت گزاروں سے جمع کئے لئے چندے میں سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔"

پادری صاحب نے اس طوفان کو روکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے وہ مشہور عالم فرمان بھی دہرایا۔ "اسے پہلا پتھر وہ مارے جس نے زندگی میں خود کوئی گناہ نہ کیا ہو۔"

انہوں نے حاضرین کو بھانے کی کوشش کی۔ "ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ چرچ سے باہر کیا کرتی ہے۔ چرچ میں جو بھی آتا ہے، کوئی اسکے بارے میں اس بات سے غرض نہیں رکھتا کہ وہ چرچ سے باہر کیا کرتا ہے۔ ہمیں مناجات اور مذہبی لغووں کو خوبصورت آواز اور دل نشیں انداز کے ساتھ پڑھنے والی ایک خاتون کی ضرورت ہے اور ڈیل ونٹر یہ خدمت بڑی عمدگی سے انجام دے رہی ہے۔ چرچ میں اس کا جو طرز عمل ہے، اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا....."

پادری صاحب کی ایک نہ چلی۔ ان کے دلائل کی کام نہ آئے۔ ڈیل کی مخالفت صرف چند لوگ کر رہے تھے مگر چرچ کئی ان کے دباؤ میں آگئی تھی۔ پادری صاحب بھی مجبور ہو گئے تھے اور یہ سب کچھ ڈیل کی موجودگی میں ہو رہا تھا۔

آخر کار اس نے خودی چپوترے پر آکر گھوٹیر آواز میں کہا۔ "میں ایک گناہ گار عورت سہی، لیکن میں تمام تر خلوس اور عقیدت سے یہ خدمت انجام دے رہی تھی اور خدا نے بزرگ و برتر سے امید رکھتی تھی کہ شاید وہ میری اس حقیر کاوش کو پسند فرمائے۔ شاید میری گناہ گار زندگی کی سیاہی کچھ کم ہو سکے..... لیکن چرچ کے معززین کو اگر میری اس کوشش پر اعتراض ہے تو میں آئندہ آپ لوگوں کے سامنے حاضر نہیں ہوں گی..... خدا حافظ....."

وہ اپنے آنسو پھپھتی چپوترے سے اتری اور خاموش کھڑے حاضرین کی صفوں کے درمیان سے تیزی سے نفقی چلی گئی۔ پھر وہ اپنے واجبات لینے بھی چرچ نہیں آئی۔

دوسری طرف بگ جم نے اسی ہفتے سے اس کی درخواست پر ہادی۔ ڈیل کی ذات میں اس کی بڑبڑی ہوئی دلچسپی اب دوسروں کو بھی صاف نظر آنے لگی تھی۔ وہ اب اسکے پاس اور مالک سے زیادہ اس کا محافظ معلوم ہونے لگا تھا۔ وہ جب کلب میں گاتی اور رقص کرتی تو ظاہر ہے اسے تماشا نیوں کی چھمچوری حرکات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ خاص طور پر جو پیٹنے پلانے کے بعد زیادہ تر تگ میں ہوتے تھے وہ تو شاید یہی محسوس کرتے تھے کہ انہوں نے تفریحی شو کا جو کٹ خریدا ہے، اس کی وجہ سے گلوکارہ اور رقاصہ بھی ان کے حصے میں آگئی ہے۔

ایسا کوئی آدمی جب ڈیل کو اپنی طرف کھینچنے پاس کے ساتھ کوئی بے ہودہ حرکت کرنے کی کوشش کرتا تو بگ جم پر غصہ نکلتا۔ آگے بڑھ کر اسے ایک جھانپڑ رسید کرتا۔ وہ اس بات کی بھی پروا نہ کرتا کہ اس طرح اس کے کلب کی ساکھ متاثر ہو سکتی ہے اور کاروبار پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔

اس سے پہلے نہ جانے کسی کیسی معزز اور حسین خاتون کے علاوہ بہت سی پیشہ ور مگر غیر معمولی عورتیں بھی بگ جم پر ہمہ گیر رہی تھیں لیکن اب جیسے وہ سب کو بھول گیا تھا۔ ڈیل ونٹر نے تو گویا اس پر جادو کر دیا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ مستقل طور پر محرزہ سا رہتا تھا۔ اس کے رویے سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ چاہتا ہے، ڈیل بس اس کی..... اور صرف اس کی ہو کر رہے۔ کوئی اور اس پر کسی کلام حق نہ جتاے۔

اس نے شہر کے سب سے بڑے اوپیرا ہاؤس کے میوزک ڈائریکٹر کو بلوا کر ڈیل کی آواز سنوائی اور اس سے رائے لی کہ اگر ڈیل کو خاطر خواہ تربیت ملے تو کیا وہ بڑی گلوکارہ بن سکتی ہے؟

میوزک ڈائریکٹر نے ڈیل کا گانا سننے کے بعد رائے دی کہ اس کی آواز بہت اچھی تھی تاہم اسے تربیت کی ضرورت تھی۔ اسکے بعد وہ اعلیٰ ترین اوپیرا میں کاسٹیج تھی۔ چنانچہ بگ جم نے اسے میوزک کالج میں داخلہ دلوا دیا۔

ظاہر ہے اس قسم کے معاشرے راز تو نہیں رہتے۔ ڈیل اور بگ جم کے مراسم کی کہانیاں کنویر یہ تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ اس کے بعد بگ جم کے گھر میں وہی کچھ ہونے لگا تھا جو اس طرح کی صورت حال میں اکثر شادی شدہ مردوں کے گھروں میں ہوتا ہے۔ یعنی روز کی جج جج اور بک.....

بگ جم جیسے آدمی کو زیادہ تنگ کرنے کی تو کنویر یہ میں جرأت نہیں تھی۔ بہر حال جلدی یہ نوبت آگئی کہ دونوں میاں بیوی علیحدہ گھروں میں رہنے لگے۔

ادھر بگ جم کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈیل اپنے قریبی جاننے والوں سے کہتی تھی۔ "میں بغیر شادی کے، اس کے ساتھ کبھی نہیں رہوں گی۔ گوکہ میں دل کی گہرائیوں سے اسے پیار کرتی ہوں..... اس سے زیادہ عزیز مجھے دنیا میں کوئی نہیں..... لیکن شادی کے بغیر اس کے ساتھ کوئی گہرا تعلق استوار کرنے پر میرا دل ہرگز آمادہ نہیں....."

شواہد بتاتے تھے کہ ان کی محبت واقعی ایک "پاکیزہ محبت" تھی۔ وہ دونوں جس قسم کے افراد تھے، جس طرح کا ان کا پیشہ اور کام تھا، جیسے ماحول میں ان کی زندگی گزر رہی تھی، اس سب کو دیکھتے ہوئے ان کی "پاکیزہ محبت" پر کسی کو یقین نہیں آتا تھا مگر بگ جم کے ذرا تیردوسن نے بھی کئی بار اس کی گواہی دی۔

وہ خود کافی حیران ہوتے ہوئے بتاتا تھا۔ "پاس روزانہ رات کو ڈیل کو چھوڑنے اس کے گھر جاتا ہے مگر راستے میں وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تک نہیں پکڑتے۔ بس باتیں کرتے ہیں یا اس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ ڈیل کے گھر کے سامنے اسے اتار کر پاس اسے شب بے خبر کیتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کے درمیان ذرا بھی بے تکلفی کا مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آتا مگر پاس جب واپس آتے ہیں تو اسے خوش نظر آتے ہیں جیسے انہیں کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ ان کے جسم میں جیسے ہی توانائی بھر جاتی ہے۔ راستے میں جو جوان لڑکوں کی طرح سینی بجاتے رہتے ہیں۔"

ادھر پاکیزہ اور افسانوی محبت کی یہ کہانی چل رہی تھی، ادھر جان نور یو بڑے پیمانے پر غیر قانونی طریقے سے شراب کے کاروبار کی تیاری کر رہا تھا اور اس نے اس سلسلے میں بگ جم سے بھی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ اسے تو قریب ہی کہ وہ دونوں مل کر اپنی تمام تر صلاحیتوں اور تجربے سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے اس میدان کے بے تاج بادشاہ بن جائیں گے۔

مگر کبھی کبھی وہ فکر مند سا ہو جاتا تھا۔ وہ بگ جم میں عجیب سی تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بگ جم کو شریفانہ اور معززانہ زندگی گزارنے کا شوق زیادہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے جواخانے، جسم فروشی کے اڈے اور اس طرح کے دوسرے کاروبار مکمل طور پر جان نور یو کے سپرد کر دیئے تھے۔ وہ اب ان میں جھانک کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔

تاہم جان نور یو یہ نہایت دیا اندازی سے اس کے یہ کاروبار چلا رہا تھا اور خاموشی سے اس کا مقررہ حصہ اسے پہنچا رہا تھا۔ بگ جم اب خود



بگ جم کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس نے شہر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

باروری صاحب نے تو چرچ کے قبرستان میں اس کی تدفین کی اجازت نہیں دی تھی لیکن وہ اگر اس کا جنازہ اور دوسرے قبرستان میں اس کی تدفین کے مناظر دیکھ لیتے تو یقیناً حیران رہ جاتے۔ بگ جم زندگی میں اتنا معزز آدمی دکھائی نہیں دیا تھا جتنا موت کے بعد نظر آنے لگا تھا۔

اس کے جنازے پر بڑا ہجوم تھا جس میں معززین شہر کی اچھی خاصی تعداد شامل تھی۔ پولیس آفیسر، دوسرے سرکاری عہدیدار، انتظامیہ کے لوگ اور اچھے خاصے سیاستدان بھی تھے۔ حتیٰ کہ چند جج بھی جنازے میں شریک ہوئے۔ ریسٹورنٹس کے مالک اور ممتاز کاروباری شخصیات بھی تھیں۔ مشکوک کاروباروں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے لیکن مجموعی طور پر بگ جم کے جنازے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی غیر معروف یا غیر مقبول آدمی کا جنازہ تھا۔

ایک منگنے اور خوبصورت تباوت میں آخر کار اوک وڈ کے قبرستان میں بگ جم کی تدفین عمل میں آگئی۔ اطالوی چرچ کے پادری کارلو نے دعائے مغفرت پڑھی۔ تدفین کے موقع پر خاصے رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے لیکن آخر کار سب لوگ اسے دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کر کے واپس آ گئے۔

پولیس نے بگ جم کے قتل کی تفتیش جلدی ترک نہیں کی۔ انہوں نے ایک طویل عرصے تک ہر زاویے سے تفتیش کی۔ حتیٰ کہ جان نوری اور الیکون بھی ان کی تفتیش کی زد میں آئے۔

پوچھ گچھ کے دوران جان نوری نے حیرت اور بے یقینی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا: ”کیا تم مجھ پر اس کے قتل کا شبہ کر رہے ہو؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ بگ جم میرے لئے بھائیوں کی طرح تھا۔“

پولیس کو یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ بگ جم کے قتل کیلئے آدمی کسی دوسرے شہر سے بلوایا گیا تھا۔ انہیں جان نوری کے نیویارک والے پس منظر کا علم تھا۔ انہوں نے نیویارک پولیس سے مدد کی درخواست کی۔ ایک گواہ کے بتائے ہوئے حلیے کی بنیاد پر نیل شے کی زد میں آیا۔ معاملہ اس حد تک بھی آگے بڑھا کہ نیل کو گواہ کے سامنے شناخت کیلئے پیش کیا گیا۔

اس زمانے میں شناخت پر پلے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا کہ گواہ کی شخصیت پردہ راز میں رہتی اور اس کی گواہی مکمل ہو جاتی۔ گواہ اور مشہر فرد آمنے سامنے تھے۔

تفتیشی افسر نے نیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا: ”کیا یہی وہ شخص ہے جسے تم نے فائروں کی آواز سننے سے چند لمحوں پہلے کلب کے باہر فٹ پاتھ پر دیکھا تھا؟“

گواہ بے چارہ متوسط طبقے کا ایک عام شہری تھا۔ اس نے نیل کی طرف دیکھا، نیل پلٹیں پلٹیں چھپکائے بغیر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گواہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا، اگر وہ سادہ لوح تھا تب بھی اس نے یقیناً نیل کی آنکھوں سے جھانکتا ہوا موت کا پیغام پڑھ لیا تھا۔

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ گڑ بڑا کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا: ”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے یہ وہ شخص نہیں ہے۔ ویسے بھی میں نے اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ وہ بھی پورے چہرے کی نہیں۔“

بس..... اتنی ہی بات تھی۔ بات ختم ہو گئی، پولیس کی ساری مستعدی اور طویل تفتیش کی بھگ دوڑ آکارت گئی۔ پولیس کی ساری محنت دھری کی دھری رہ گئی۔ خطرناک جرائم پیشہ لوگوں اور گردہ ہوں کو قانون کی یہی مجبوری پورا تحفظ دیتی ہے، ان کے حوصلے بڑھانے اور ان کے پھلنے پھولنے میں مدد دیتی ہے، موت کا ہر کارہ کی گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے یا گواہ کے گھر پر کوئی انتہائی مختصر مگر مؤثر پیغام بکھپاتا ہے اور گواہ بیچارہ ساری گواہی بھول جاتا ہے کیونکہ اسے اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی اور عزت بیکاری ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر قانون کے ہاتھ بندھ جاتے ہیں اور آنکھوں، مجرموں، دہشت گردوں اور گردہ بازوں کے حوصلے کچھ اور بلند ہو جاتے ہیں۔

بگ جم کے قتل کا معاملہ بھی خضخض پر کیا۔ اس کی کوئی وجہ سامنے نہیں آئی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ریاستی قوانین کے مطابق موت کے وقت وہ غیر شادی شدہ تھا۔ شکار کو چونکہ اسی نوائے ریاست میں تھا اور بگ جم نہیں کا شہری تھا، یہیں کاروبار کر رہا تھا اس لئے اس پر یہیں کے قوانین لاگو ہونا تھے۔ اسی نوائے کے شادی بیاہ کے قوانین کے مطابق طلاق کے بعد عورت اور مرد ایک سال تک دوسری شادی نہیں کر سکتے تھے۔

اسی لئے بگ جم اور ڈیل نے انڈیا یا نا جا کر شادی کی تھی مگر ایک سال تک ان کی یہ شادی الی نوائے کی حدود میں مؤثر نہیں تھی۔ چنانچہ بگ جم کی جائداد میں وکٹوریہ اور ڈیل دونوں ہی کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ بگ جم کی دولت، جائداد اور اثاثے گویا اسکی موت کے ساتھ ہی بری طرح سکر کر رہ گئے تھے۔ اس کی موت کے بعد ایسا لگنے لگا جیسے اسکے سارے ٹھاتے ہاٹ معنوی تھے، وہ گویا دکھاوے کی زندگی گزار رہا تھا اور نہ حقیقت میں اسکے وسائل کوئی خاص نہیں تھے۔

اس کے چاہنے والوں کا اندازہ تھا کہ اس کے پاس کم از کم پانچ لاکھ ڈالر نقد ہوں گے، کچھ جگہوں پر اس نے سرمایہ کاری بھی کر رکھی ہوگی مگر اس کے آفس کی تجوری اور بینک کے لا کر سے کل 28 ہزار ڈالر کے سرکاری باض اور دو ہزار ڈالر کے بیروں کے زیورات برآمد ہوئے جن میں ہیرے نہایت چھوٹے اور کم قیمت تھے، انہیں بیروں کے زیورات سمجھنا بھی غلط ہی لگ رہا تھا۔

اس کے کلب کی عمارت کرائے کی تھی۔ حویلی اس کے باپ کے نام تھی جو باپ ہی کو مل گئی۔ اس نے ازراہ کچھ ہزار ڈالر کے باض اور زیورات ڈیل کو دے دیئے اور بارہ ہزار ڈالر وکٹوریہ کو دیئے۔ بگ جم کی دولت اور جائداد کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اگر وہ بھی تو کہاں گئی، کوئی نہیں جان سکا کہ اس نے کہاں کہاں سرمایہ کاری کر رکھی تھی اور اس کے اثاثے کیا تھے۔

اس کی موت کے کچھ عرصے بعد ڈیل شوہر میں اس واپس آ گئی اور 1924ء میں اس نے ایک ایکٹر سے شادی کر لی جو پوڈیوسر بھی تھا۔ وکٹوریہ نے ایک سال بعد اپنے نوجوان شوہر سے طلاق حاصل کر لی اور نہ جانے کہاں غائب ہو گئی، اس کے بعد وہ شکار گولیں نظر نہیں آئی۔



اس نے بھی کسی ضرورت مند کو مایوس نہیں لوٹایا۔ کبھی کسی کمزور کو نہیں مارا۔ کبھی پینے پیچھے کی برائی نہیں کی، اگر کبھی کوئی گھٹیا کام بھی کیا تو اس ادا سے کیا کہ اس کی وجہ سے اس کی اپنی شخصیت گھٹیا نظر نہیں آئی۔ اس نے ہر حال میں اپنی عزت اور اپنا قدر برقرار رکھا۔

اسے اسی قسم کے الفاظ میں یاد کیا جاتا رہا اور اس کی شخصیت ایک طویل عرصے تک فراموشی کے دھندلوں میں غم نہیں ہوئی۔ الیکون کی زندگی پر بھی اس کی شخصیت کے خاصے گہرے اثرات موجود رہے حالانکہ اسے براہ راست اس کے زیر سایہ رہنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس کا رابطہ بھی بگ جم سے زیادہ عرصے نہیں رہا تھا۔ الیکون تو درحقیقت جان نوری کا آدمی تھا لیکن اس نے بگ جم کی شخصیت کا بھی گہرا مشاہدہ کیا تھا اور اس سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ جان نوری کا تو وہ بہر حال خاص آدمی تھا۔

☆.....☆.....☆

جان نوری پوکوا مید تھی کہ غیر قانونی شراب کے دھندے میں بہت کمائی ہوگی اور جو بھی اس میں کود پڑے گا، وہ بہت کمائے گا اور جو اسے جتنے زیادہ منظم انداز میں جتنے زیادہ اونچے پیمانے پر کرے گا، اتنا ہی زیادہ کمائے گا۔

جلدی ہی اس کا اندازہ صحیح ثابت ہوتا دکھائی دینے لگا۔ شہر میں گویا غیر قانونی شراب کا سیلاب آنے لگا۔ ایک سمٹانی نے اس دور کے شکار کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا: ”لگتا ہے جتنی شراب شکار گولیں پانی جاتی ہے، اتنی امریکا کے کسی اور شہر میں نہیں پانی جاتی۔ کبھی کوئی فائدہ بخشہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شہر شراب کے سیلاب میں ڈوب جائے گا۔“

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی حکومت اپنے خیال میں معاشرے کی بھلائی اور اپنے مالی فائدے کیلئے کچھ قوانین بناتی ہے مگر وہ معاشرے میں بہت بڑے بگاڑ کا سبب بن جاتے ہیں اور حکومت کے بجائے جرائم پیشہ لوگوں کو دولت مند بنادیتے ہیں۔ امریکا میں شراب پر پابندیوں کے قوانین کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہو رہا تھا۔

جان نوری پوکوا اپنے کاروبار اور اپنے کارندوں کو منظم کرنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ اطالوی ویسے تو بہت کھڑے رہتے تھے اور ایک غیر منظم قوم نظر آتے تھے لیکن اگر کوئی انہیں منظم کرنے والا میسر آ جاتا تو پھر ان سے زیادہ منظم کوئی نہیں تھا۔

ایک سمٹانی نے اس سلسلے میں اپنا تجزیہ بیان کرتے ہوئے لکھا تھا: ”اطالویوں میں چونکہ ایک قسم کا عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے اس لئے جب انہیں کوئی منظم کرنے والا میسر آتا ہے تو وہ سب سے زیادہ مضبوطی سے منظم ہوتے ہیں۔ کوئی بھی چالاک آدمی ان کے اسی عدم تحفظ کے لاشعوری احساس کو ابھارتے ہوئے ایک مضبوط لڑی میں پرو لیتا ہے۔“

کاروبار کو منظم کرنے میں الیکون بھی جان نوری کے خوب کام آ رہا تھا۔ اس نے ہر موقع پر اپنے آپ کو کارآمد اور قابل اعتماد سمجھنا ثابت کیا تھا۔ جان نوری اس سے بہت خوش تھا اور اس نے الیکون کو قائل کر لیا تھا کہ اس کا مستقبل اب شکار گولے ہی وابستہ تھا چنانچہ اب اسے نیویارک واپس جانے کا خیال چھوڑ کر مستقبل بنیادوں پر بنیں رہنے کا فیصلہ کر لینا چاہئے تھا۔

ویسے بھی ادھر نیویارک کے علاقے بروکلین میں اس کا دشمن ولیم پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ الیکون نے آنکھ پر تازی جس آنکھ کو مار کر تقریباً موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا، وہ آنکھ گروہوں میں سے ایک کارکن تھا اور ولیم اس وقت آنکھ گروہوں کا نائب سردار تھا۔ ان گروہوں کو ”وائٹ پنڈ کینگز“ کہا جاتا تھا۔ بروکلین میں اب ان گروہوں کا لیڈر ری ہاں بن چکا تھا اور اس کی جگہ ولیم ہی سب سے بڑا لیڈر یا پاس بن چکا تھا۔ کوکاب وہ وہاں الیکون کو ڈھونڈتا تو نہیں پھرتا تھا لیکن کچھ بعید نہیں تھا کہ شہر میں اس کے واپس آنے کی خبر سن کر یا اسے دیکھ کر ولیم کا جذبہ انتقام بیدار ہو جائے۔

الیکون کو خود بھی اب شکار گولیں اپنا مستقبل زیادہ روشن دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ جان نوری کام کا آدمی تھا اور اس کی رفاقت اس کیلئے بے پناہ فائدہ مند ثابت ہو گئی تھی چنانچہ وہ شکار گولیں مستقل رہائش اختیار کر کے کیلئے ذاتی طور پر رہنما مند ہو چکا تھا۔

وہ جان نوری سے ”کاروبار“ کے اسرار و رموز تو سیکھ ہی رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اپنی شخصیت اور عادات کو بہتر بنانے کے مشوروں پر بھی عمل کر رہا تھا۔ جان نوری کا کہنا تھا کہ آدمی خواہ کتنا ہی بڑا بدعاش ہو لیکن اسے بدعاش نظر نہیں آنا چاہئے، اس کے دھندے خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اسے اپنے لباس، اپنی گفتگو اور رکھ رکھاؤ سے پوری طرح ایک معزز برنس میں نظر آنا چاہئے۔ اس کے اعمال اس کے چہرے پر لکھے نظر نہیں آنے چاہئیں۔

الیکون نہایت توجہ سے اس کے مشورے سنتا تھا اور ان پر عمل کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا تھا۔ جان نوری ہی کے مشورے پر اس نے ٹائٹ اسکول میں بھی داخلہ لے لیا تھا اور اپنی تعلیم کا نوٹا ہوا سلسلہ جوڑ لیا تھا۔ جان نوری کا کہنا تھا کہ اسے تعلیم کے ذریعے بھی اپنے آپ کو گناہری طور پر مضبوط، نفس اور شاکستہ بنانا چاہئے۔

اس کا الیکون کے بارے میں کہنا تھا کہ وہ ابھی اکثر بروکلین کا بدعاش ہی نظر آتا تھا جو اسے نظر نہیں آنا چاہئے تھا۔ الیکون پر بھی بھار اچانک جو شہید فیضے اور اشتعال کا دورہ پڑتا تھا، جان نوری کے خیال میں وہ بھی بہت بڑی خرابی اور خرابی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان کو ہمیشہ پرسکون اور خن ملح مزاج نظر آنا چاہئے، وہ چاہے دس بیس آدمیوں کو قتل کرانے کا فیصلہ کر رہا ہو لیکن یہ فیصلہ اسے غصے میں نہیں کرنا چاہئے، بالکل خشنہ دل سے اور خوب سوچ سمجھ کر خن ملح مزاجی سے کرنا چاہئے۔

الیکون ان تمام مشوروں پر غلطیوں سے عمل کر رہا تھا۔ جان نوری کی زیر نگرانی اس کی تعلیم و تربیت کا عمل ڈراست روی سے آگے بڑھ رہا تھا مگر بہر حال بڑھ رہا تھا۔ الیکون کی شخصیت، عادات و اطوار اور رکھ رکھاؤ وغیرہ میں دھیرے دھیرے تبدیلیاں آ رہی تھیں۔

جان نوری پوکوا ایک اچھا پاس ثابت ہو رہا تھا۔ وہ الیکون کو بچیں ہزار

ڈالر سالانہ نوڈے ہی رہا تھا، جسم فروشی کے ڈالوں سے ہونے والی آمدنی میں بھی اس کا حصہ تھا، غیر قانونی شراب کے دھندے میں تو اس کا خاصا حصہ تھا کیونکہ اس کا زیادہ تر انتظام الیکون ہی چلا رہا تھا۔ بیشتر ذمہ داریاں اسی کے سر پر تھیں۔ اس کے علاوہ الیکون کے بیٹے کی ہی ہر سالگرہ پر جان نوری اسے پانچ ہزار ڈالر کا باض تحفے کے طور پر دیتا۔ اس کے علاوہ بھی ہر خوشی کے موقع پر جان نوری، الیکون اور اسکی فیملی کو اچھے تحفوں سے نوازنے میں کوتاہی نہ کرتا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ ساتھیوں کا دل جیتنے کیلئے طے شدہ معاوضوں اور حصے داروں سے قطع نظر بھی جتنے تحائف کا سلسلہ ضرور جاری رکھنا چاہئے۔ باہمی تعلق پر اسکے الگ اثرات ہوتے ہیں۔

یہ دوسری بات تھی کہ کاغذات میں الیکون کی تنخواہ صرف 75 ڈالر فی ہفتہ تھی۔

نومبر 1920ء میں بروکلین میں الیکون کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ دل کے مریض تھے، ایک روز گھر کے قریب ہی ایک پول ہال میں گرے اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے چل بسے، اس وقت ان کی عمر صرف 55 سال تھی، انہیں عارضی طور پر بروکلین میں دفن کیا گیا، بعد میں الیکون نے ان کی میت شکار گولنگوائی اور انہیں خاصے اہتمام سے ایک اچھے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ قبر کے سر ہانے سنگ مرمر کا خوبصورت کتبہ نصب کیا گیا۔

الیکون اپنے خاندان کا خیال رکھنے والا اور خاندان کے سب لوگوں کے کام کرنے والا آدمی تھا۔ وہ ان سب کی حتی الامکان مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا، اسے اپنے خاندان کے کام آ کر خوشی ہوتی تھی۔ اس معاملے میں وہ بڑا فراعزل تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ باپ کے انتقال کے فوراً بعد اس نے نہ صرف اپنی ماں اور سب بہن، بھائیوں کو بلکہ تین کزنوں کو بھی اپنے پاس شکار گولایا۔ اس کی فیملی میں دو بہنوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا، خضخض ان میں سے ایک کا نام روز، دوسری کامیت تھا۔ اپنی فیملی کے ساتھ اس نے جن تین کزنوں کو بلوایا تھا، ان کے نام چارلس، راکو اور جوزف تھے۔

الیکون نے سب سے پہلے اپنے بڑے بھائی رالف کو بلوایا تھا جو کتنی ہی چھوٹی موٹی ملازمتیں کر چکا تھا۔ کبھی کانسیر جنگ میں فوج میں بھی رہ چکا تھا۔ الیکون نے اپنی پوری فیملی کیلئے پندرہ کمروں پر مشتمل ایک مکان خرید دیا جو ساؤتھ پریری کے علاقے میں تھا۔ یہ اچھے خاصے خوشحال لوگوں کا علاقہ تھا۔ جان نوری پوکوا پراشٹ بھی یہاں سے دور نہیں تھا۔

پوری فیملی کے آجانے سے الیکون گویا شکار گولیں مستقل رہنے کے سلسلے میں یکسو ہو گیا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس نے بھی محسوس کیا کہ شکار گولیں عجیب شہر تھا۔ یہاں اگر کوئی شخص کچھ عرصہ گزار لیتا تھا تو یہ شہر گویا اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تھا۔ اسے کہیں جانے نہیں دیتا تھا حالانکہ بظاہر اس میں کوئی خاص کشش نظر نہیں آتی تھی۔

اس پر اگر طائرانہ نظر ڈالی جاتی تو وہ بہت بے شکم اور بے ترتیب دکھائی دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی منصوبہ بندی کے بغیر آباد ہوتا چلا گیا ہے۔ کہیں صنعتی علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ اونچی نیچی، آڑی ترچھی صنعتی عمارتوں کے قریب رہائشی علاقے بھی تھے۔

کہیں اچھے مکانات اور عمارتیں دکھائی دیتی تھیں۔ انہی کے پہلو پہ پھلوغریا نہ مکانات کی آڑی ترچھی عمارتیں بھی ایک دوسرے میں گڈمڈ نظر آتی تھیں۔ سچ میں کہیں خاصی دور تک پہنچی ہوئی خالی زمینیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس زمانے میں یعنی تقریباً سو سال پہلے اس کی آبادی تیس لاکھ کے قریب تھی۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ آبادی تھی اور بلاشبہ شکار گول بہت بڑا شہر تھا۔ اس کے باشندوں میں جرمن، آئرش، پولش، یٹلیکین، چائینیز، انڈین اور نہ جانے کون کون شامل تھے۔

ایسے لوگ جنہیں خالص امریکی قراد یا جاسکتا ہو، ان کی تعداد بیس فیصد سے زیادہ نہیں تھی، مختلف قومیتوں کی کچھڑی سی پکی ہوئی تھی اور امریکی اس کچھڑی میں گویا ہم کو کر رہے تھے، بے شناخت سے ہو گئے تھے، وہ اس صورتحال پر کچھ زیادہ خوش نہیں تھے لیکن ان کی خوشی یا ناخوشی کی پروا بھلا کسے تھی؟

بہر حال، شہر کے ان حالات اور اس پس منظر میں بغیر ٹیکس کی غیر قانونی شراب کا کاروبار بھی خاموشی سے ایک الگ ہی قسم کا انقلاب لا رہا تھا۔ ویسے تو اب بھی زیادہ تر مجرم انہی جرائم میں الجھے ہوئے تھے جو وہ پہلے سے کرتے آ رہے تھے لیکن ان میں سے جو غیر قانونی شراب کے دھندے کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، وہ مونے دماغ کے ہونے کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ کمانے لگے تھے۔ ان میں کاروباری سمجھ بوجھ نہیں تھی، اس کے باوجود ان میں سے بعض کے مالی حالات تو اتنے بدل گئے تھے کہ ٹیکس کا نکلنے ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا تاہم کچھ جرمائے ادا کر کے کچھ رشوتیں کھلا کے ان کی بھی گلوغلا سی ہو گئی تھی۔

اس قسم کے لوگوں میں برٹین ایک خاصا دلچسپ قسم کا کردار تھا۔ یہ شخص چور، اشیاء اور نقب زن ہوا کرتا تھا۔ دھماکا خیز مواد کے ذریعے اچھی خاصی بڑی اور مضبوط تجوری بھی توڑ لیا کرتا تھا لیکن اپنے اتنا بڑی پان بصدی کی وجہ سے کبھی زیادہ دولت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ بعض اوقات تو وہ اتنی رقم کی واردات نہیں کرتا تھا جتنی رقم کی رشوت دیکر اسے اپنی جان چھڑانی پڑتی تھی۔

ایک بار تو اس نے ایک تجوری توڑنے کیلئے دھماکا خیز مواد استعمال کیا تو عمارت کی پوری دیوار ڈگ گئی لیکن تجوری سلامت رہی۔ یہ تو خیر ایک ناکام واردات تھی لیکن کامیاب وارداتوں میں بھی اس کا حال کچھ اچھا نہیں تھا۔ ایک بار اس نے اپنی دانست میں اوپر تلے پانچ بڑی اور کامیاب وارداتیں کیں لیکن ان سے اسے مجموعی طور پر صرف نو ہزار ڈالر کی رقم حاصل ہوئی، اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ پکڑا گیا اور بری طرح قانون کے جھکے میں آ گیا۔

جان چھڑانے پر اس کے تیس ہزار ڈالر خرچ ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اس کی جمع پونجی بھی چلی جاتی تھی اور وہ بد حال کا بد حال ہی رہتا تھا۔ شراب پر جب مرکزی حکومت کی طرف سے کئی طرح کے ٹیکس عائد ہوئے اور کئی پابندیاں لگیں تو اس کے فوراً بعد وہ شراب کا ایک ٹرک لوٹنے والا پہلا آدمی تھا۔

اس کی یہ واردات بھی بڑی دلچسپ اور عجیب و غریب تھی۔ دسمبر کی ایک سرد صبح تھی۔ برٹین اپنی اوپنی جینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونے ایک سٹائن سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ ایک عمارت کے عقب میں اسے شراب کی بوتلوں سے لدا ہوا ایک ٹرک کھڑا دکھائی دیا شاید وہ کسی جگہ ڈیلوری دینے آیا تھا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

ٹرک میں ڈرائیور کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ کھڑکی میں کبھی ٹکائے ست سے انداز میں بیٹھا تھا، برٹین اس کے قریب پہنچا تو اسے نہ جانے کیا سوچھی کہ وہ ٹرک کے پائیدان پر چڑھ گیا، اس نے ڈرائیور کی گردن اپنے ایک بازو کے جھکے میں جکڑ لی اور اس کے سر پر تباہ توڑ کئی گھونے رسید کر ڈالے۔

اس کی یہ حرکت بالکل غیر ارادی اور اضطراری تھی۔ ایک منٹ پہلے تک اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گا، ڈرائیور بے ہوش ہو گیا۔ برٹین نے اسے کھینچ کر ٹرک سے نکالا اور سڑک پر پھینک دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹرک کی ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھا اور اسے لے کر چل دیا۔

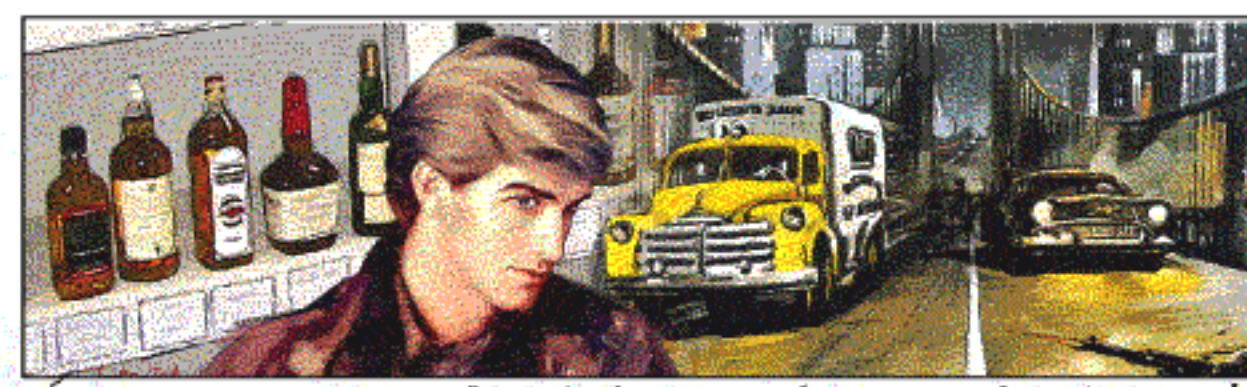
اس کی یہ حرکت بالکل غیر ارادی اور اضطراری تھی۔ ایک منٹ پہلے تک اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گا، ڈرائیور بے ہوش ہو گیا۔ برٹین نے اسے کھینچ کر ٹرک سے نکالا اور سڑک پر پھینک دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹرک کی ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھا اور اسے لے کر چل دیا۔

اس کی یہ حرکت بالکل غیر ارادی اور اضطراری تھی۔ ایک منٹ پہلے تک اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گا، ڈرائیور بے ہوش ہو گیا۔ برٹین نے اسے کھینچ کر ٹرک سے نکالا اور سڑک پر پھینک دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹرک کی ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھا اور اسے لے کر چل دیا۔

اس کی یہ حرکت بالکل غیر ارادی اور اضطراری تھی۔ ایک منٹ پہلے تک اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گا، ڈرائیور بے ہوش ہو گیا۔ برٹین نے اسے کھینچ کر ٹرک سے نکالا اور سڑک پر پھینک دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ٹرک کی ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھا اور اسے لے کر چل دیا۔



جب وہ ٹرک لے کر کافی دور نکل گیا تو اس کے ذہن میں سوال ابھرا کہ آخر وہ کہاں جا رہا تھا؟ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو گیا، وہ ٹرک لے کر تو جھگ ٹھکا تھا لیکن یہ تو اس نے سوچا



نہی نہیں تھا کہ وہ اسے کہاں لے کر جائے گا اور اس کا کیا کرے گا؟ چندہ منٹ تک وہ ادھر ادھر پھرتا پھرتا با آخر کار وہ ٹرک کو مارٹر کے گیراج پر لے گیا۔ مارٹر ٹھیک ٹھاک کر رہی تھی کہ پوری کی کاریں اپنے گیراج میں کھڑی کر رہا تھا۔ برینن نے ٹرک لے جا کر وہاں کھڑا کر دیا اور آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر فون کرتا رہا۔ وہ فون کے ذریعے پوری کی دسکی کا ایک ٹھکانہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار وہ آدھی قیمت پر ایک بریوری سے سی دسکی کے اس ٹرک کا سودا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آدھی قیمت لے کر بھی وہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ منافع بخش سودا تھا کیونکہ اس واردات میں اسے ایک گھنٹہ بھی نہیں لگا تھا۔

بہی برینن آگے چل کر غیر قانونی شراب کا دھندا کرنے والا بہت بڑا آدمی بن گیا لیکن شراب کے ٹرک یا گودام کو ملنے کا سلسلہ اس نے جاری رکھا اور یہ کام وہ بذات خود کرتا رہا، اپنے کارندوں سے اس نے کبھی یہ کام نہیں لیا حالانکہ بعض اوقات اس قسم کی واردات سے کوئی خاص مالی فائدہ نہیں ہوتا تھا لیکن برینن کو شاید ان وارداتوں کا چسکا پڑ گیا تھا، اسے شاید اس کام میں حرا آتا تھا۔

جان نور یو بھی غیر قانونی شراب کے کام میں بہت آگے چلا گیا تھا۔ کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کے اپنے گروہ کے تین آدمیوں نے شراب کی نقل و حمل کیلئے ٹرک خرید کر موٹر کھینچنی بنائی تھی اور اس کا نام ”ورلڈ سٹور سرورٹ کپنی“ رکھ دیا تھا، وہ اسے شراب کے دھندے سے بالکل الگ تھلک سیدھی سادی کاروباری کپنی ظاہر کرتے تھے۔

اگر کبھی کوئی ٹرک شراب لے جاتے ہوئے پکڑا بھی جاتا تھا تو ڈرائیور وغیرہ بڑی مصیبت سے کہہ دیتے تھے کہ ٹرک تو کچھ لوگوں نے سامان لے جانے کیلئے کرائے پر لیا تھا، اب انہیں کیا پتہ کہ بندہ بیٹیوں میں وہ کیا لے کر جا رہے ہیں۔ اس طرح وہ اکثر اپنا ٹرک تو چھڑا کر لانے میں کامیاب رہتے تھے، زیادہ سے زیادہ شراب ہی ضبط ہوتی تھی۔

ٹرکوں کی خریداری بھی الیکپون ہی کے ذمے تھی کیونکہ اس میں نقد رقم کے لین دین کا معاملہ ہوتا تھا اور رقم کے معاملے میں جان نور یو زیادہ تر الیکپون پر ہی اعتماد کرتا تھا۔ الیکپون اتنے اور پرانے ٹرک خریدتا رہتا تھا اور زیادہ پرانے ہو جانے والے ٹرکوں کو نکال کر بیٹا تھا۔

جان نور یو کے دوسرے دھندے بھی اپنی اپنی جگہ جاری تھے لیکن اب ان کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ”فورڈ یوسر کلب“ جو جگہ جگہ کے زمانے میں ایک اچھا خاصا بڑا اور محترم زائیم کلب بن گیا تھا، اب اس کی حالت یہ تھی کہ وہ جسم فروشی کا ایک سستا گم کاڈھ معلوم ہوتا تھا۔

بہر حال جان نور یو کو اپنے سب آؤں سے اچھی خاصی آمدنی ہو رہی تھی تاہم شراب کا دھندا اب سب سے اوپر چلا گیا تھا اور جان نور یو کی سب سے زیادہ توجہ بھی اسی کی طرف تھی۔ اس کیلئے کام کرنے والوں کی تعداد بھی کافی بڑھ چکی تھی۔

اسکے گروہ میں شامل ہونے کیلئے پہلی سیرمی اس کا کوئی ٹرک ہوتا تھا یعنی امیدوار کو سب سے پہلے کسی ٹرک کے ڈرائیور کے طور پر بھرتی کیا جاتا تھا۔ اسکے بعد اگر وہ کچھ ”ترقی“ کر جاتا تھا تو تھوڑی بہت مالدھارٹ والے کام بھی اسکے سپرد کئے جاتے تھے تاہم ابھی تک گروہ کیلئے ”سینڈ کیٹ“ یا ”مافیا“ وغیرہ جیسے الفاظ استعمال نہیں ہوتے تھے۔

گروہ کے ارکان زیادہ سے زیادہ اسے ”آؤٹ فٹ“ کہہ دیتے تھے۔ وہ اپنے تعارف کراتے ہوئے کہتے تھے۔ ”میں آجکل جان نور یو کی آؤٹ فٹ میں کام کر رہا ہوں“ کوئی کہہ دیتا تھا ”میں الیکپون کی آؤٹ فٹ میں ہوں۔“

سننے والے اس کا مطلب سمجھ جاتے تھے۔

جان نور یو نے الیکپون کو خاصی آزادی دے رکھی تھی اور وہ اسکی اچھی خاصی غلطیاں بھی نظر انداز کر جاتا تھا۔ گوکہ اس نے الیکپون کو تہذیب کرنے اور اسے ایک سلجھا ہوا ”برنس مین“ بنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور بلاشبہ الیکپون کی ذات میں بہت سی تبدیلیاں آئی بھی تھیں لیکن انسان کی فطرت تو تینیں بدلتی، عادات اور طور طریقے البتہ بدل جاتے ہیں چنانچہ الیکپون کی فطرت کبھی کبھار اپنی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

30 مارست 1922ء کی صبح الیکپون تین مردوں اور ایک عورت کے ساتھ اپنی گاڑی میں کہیں جا رہا تھا۔ جس قسم کے ان لوگوں کے دھندے تھے، ان میں زیادہ تر اتمیں جاگتے ہوئے ہی گزرتی تھیں۔ اس روز بھی وہ رات کے جاگے ہوئے تھے۔ پینے پلانے کا دور بھی چل رہا تھا اس لئے صبح معنوں میں کسی کا بھی دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔

ایک موڑ کاٹنے وقت الیکپون کی گاڑی پھلتی اور ڈرا آگے کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی سے بری طرح جا لگائی۔ ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیور بیٹھا آؤگہ رہا تھا۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ الیکپون کی گاڑی کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا اور نہ ہی گاڑی میں موجود لوگوں کو کوئی خاص چوٹ لگی لیکن ٹیکسی کو اچھا خاصا نقصان پہنچا اور اس کا ڈرائیور بھی زخمی ہو گیا۔

اس کے سر سے خون بہنے لگا اور وہ اسٹیرنگ ڈنیل پر سرنگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ الیکپون ایک ہاتھ میں گن اور دوسرے ہاتھ میں ہینڈل کا ایک ستارہ مناج لئے بڑے غصے میں گاڑی سے اتر اور جا کر ڈرائیور پر گر گئے برسنے لگا جو بچا رہا جواب دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

الیکپون کے ساتھی نہایت تھنڈی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی سے اترے اور وہاں سے ٹھک لئے۔ الیکپون کو اس بات کا پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ ایک ہاتھ میں ریلو اور دوسرے میں ستارہ مناج لہرا تے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور پر گرج برس رہا تھا، وہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ڈنڈی شریف ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور بے چارہ اس کی ڈانٹ ڈپٹ پر کوئی رد عمل ظاہر کرنے سے قاصر تھا، وہ اسٹیرنگ ڈنیل پر سرنگا کر رہا تھا۔ وہ اس حد تک زخمی ہو چکا تھا کہ اسے فوری طور پر ہسپتال لے جانے کی ضرورت تھی۔ الیکپون اس کی نگہ کرنے کے بجائے اسے شوٹ کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا۔

آخر کار ایک اسٹریٹ کار کا ڈرائیور اتر کر قریب آیا۔ اسٹریٹ کار ایک قسم کی چھوٹی وین ہوتی تھی جو مسافروں کو لے کر مختلف روٹس پر چلتی تھی اور انہیں ان کے مطلوبہ اسٹاپ پر اتارتی جاتی تھی۔ اس وقت اسٹریٹ کار ڈھکی تھی، اسکے ڈرائیور نے سارا منظر دیکھا تھا۔

وہ ہمت کر کے ذرا سخت لہجے میں الیکپون سے مخاطب ہوا۔ ”تم اس آدمی پر گن کیوں تانے کھڑے ہو؟ وہ بچپن کا پہلے ہی بڑا ہے، تم اسے ہسپتال پہنچانے کی فکر کرنے کے بجائے گن دکھا کر ڈرا دھکا رہے ہو جبکہ غلطی بھی تمہاری ہے، اس کی ٹیکسی تو ایک طرف کھڑی ہوئی تھی، تم نے آکر اسے نگر ماری ہے۔“

کچھ بعد نہیں تھا کہ الیکپون اسے بھی شوٹ کرنے کی دھمکی دے ڈالا لیکن اس دوران پولیس کی ایک گاڑی گھنٹیاں بجائی ہوئی آن پہنچی۔ اس

کے ساتھ ایسی پولیس بھی تھی۔ پولیس کو کسی طرح واقعے کی اطلاع ہو گئی تھی اور وہ بروقت آن پہنچی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ہسپتال لے جایا گیا اور الیکپون کو حراست میں لے لیا گیا۔ فوری طور پر اسے پولیس اسٹیشن کے انچارج کے سامنے بھی پیش



کر دیا گیا۔ اسے تین الزامات کا سامنا تھا، ایک تو گاڑی کے ذریعے کسی کو ہلاک کرنے کی کوشش، دوسرے نشے کی حالت میں ڈرائیونگ، تیسرے بغیر لائسنس کے گن رکھنا اور اس سے دوسرے کو دھمکانا۔ اس دور کے اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے پولیس اور پورٹرز کو بھی دھمکیاں دی تھیں۔ پولیس اسٹیشن کے انچارج سے اس نے کہا تھا کہ وہ اس کا جادو ایسی ایسی جگہ کروائے گا جہاں وہ سر پکڑ کر روے گا۔ پورٹرز سے اس نے کہا تھا کہ اگر کسی نے اس کے بارے میں اتنی سیدھی کہانیاں گھسنے کی کوشش کی تو اس کا وہ شہر ہوگا کہ بعد میں وہ سوچنا ہی رہ جائے گا کہ یہ کیا ہوا اور کیسے ہوا؟

تاہم ایک آدھ اخبار کے نوآموز پورٹرز نے اس واقعے کے بارے میں رپورٹ چھاپ ہی دی۔ اس نے یہ بھی لکھ دیا ”بدنام سایہ آدمی ایک بدنام آڈے ”فورڈ یوسر“ میں رہتا ہے“ اس نچارے کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ الیکپون ”فورڈ یوسر“ میں نہیں رہتا بلکہ وہ ایک کلب ہے اور الیکپون اس کا تقریباً مالک ہی ہے۔

پرانے اخباروں کے تجزیے کار پورٹرز جو بد معاشوں کو ذرا بہتر طور پر جانتے تھے، انہوں نے اس واقعے کی رپورٹ ذرا احتیاط انداز میں چھاپی، بہر حال الیکپون نے خطاط اور غیر خطاط دونوں ہی قسم کے پورٹرز کو نہیں چھیڑا۔ اسے شاید اپنی مصروفیات کی وجہ سے اپنے بارے میں خبریں پڑھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

وہ اس دوران اس سمجھوت سے اپنی جان چھڑانے میں مصروف تھا۔ الزامات خاصے تھیں تھے مگر ہواوی جو الیکپون لے جاتا تھا۔ مقدمہ عدالت میں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی، یقیناً اس معاملے میں جان نور یو نے بھی انکی مدد کی ہوگی۔ اس نے حسب معمول قتل مزاحیہ کا مظاہرہ کیا اور شاید یہی سوچ کر الیکپون کو معاف کر دیا کہ ابھی اس کی عمر صرف 23 سال تھی اور وہ گرم دماغ کا نوجوان تھا۔ جان نور یو اسے بدلنے کی کوشش تو کر رہا تھا لیکن ظاہر ہے وہ اسے مکمل طور پر نہیں بدل سکتا تھا۔

اس عمر میں بھی الیکپون اپنی شان، رعب اور اثر رسوخ کا اظہار خوب کرتا تھا۔ کلب کی طرف جاتے وقت اسے راستے میں ایک ٹریفک کانٹریل ڈیوٹی پر کھڑا نظر آتا تھا، وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے اور ان کے درمیان ”ہیلو ہائے“ ہوتی تھی۔

کبھی الیکپون زیادہ اچھے موڈ میں ہوتا تو چند لمحوں کیلئے ٹریفک کانٹریل کے قریب رک کر کہتا۔ ”ہیلو چارلس! اگر تمہارا سار جرنٹ بننے کا ارادہ ہو تو مجھے بتا دینا۔“

چارلس بچپن سے ہی بار سنجیدگی سے اس کی پیشکش کے بارے میں سوچا۔ اسے معلوم تھا کہ الیکپون کے یہ کہنے کا مقصد شہی جھاڑنا نہیں ہوتا تھا، وہ کچھ ڈور یاں ہلاتا تو جج اسے سار جرنٹ بنا سکتا تھا لیکن ہر بار وہ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد اسی نتیجے پر پہنچتا کہ الیکپون کا احسان نہیں لینا چاہئے، اگر اس نے احسان لے لیا تو وہ زندگی بھر اس احسان کے بوجھ تلے دبا رہے گا اور سار جرنٹ بننے کے بعد اسے اس کے جواب میں الیکپون کیلئے نہ چاہئے کیا کچھ کرنا پڑے۔ یہ سوچ کر چارلس بچپن سے سار جرنٹ بننے کی خواہش کو دل میں ہی دبائے رکھتا۔

لیکن جان نور یو اور برینن کے گروہ مضبوط ہو جانے اور شراب کا دھندا بہت پھیل جانے کے بعد غیر محسوس سے انداز میں حد بندیوں ہونے لگی تھیں۔ شمال کی طرف کا زیادہ تر علاقہ گویا برینن کے قبضے میں آ گیا تھا۔ برینن ہی کی طرح اس کے گروہ میں صف اول میں زیادہ تر بد معاش پہلے لقب زن ہوا کرتے تھے اور تجوریوں توڑتے تھے۔

برینن سمیت یہ لوگ جسمانی طور پر بھی کافی مضبوط تھے۔ مالدھارٹ اور قتل و غارت ان کیلئے کوئی مشکل کام نہیں تھا، خود برینن تو ایک نہایت خطرناک قاتل تھا۔ ایک پولیس آفیسر کا اسکے بارے میں خیال تھا کہ اس نے چالیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے پہلے کم از کم تیس قتل کئے تھے جبکہ ایک دوسرے پولیس مین کے خیال میں یہ تعداد ساٹھ سے کم نہیں تھی۔

اس معاملے میں وہ خاصا متم ظریف بھی تھا۔ جب اس کا کسی کو قتل کرنے کا ارادہ ہوتا تھا، اس کے سامنے اگر کوئی اس شخص کی برائی کر رہا ہوتا تھا تو برینن ہنستے ہوئے کہتا تھا۔ ”ارے نہیں بھئی..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی وہ تو بہت اچھا آدمی ہے۔“ اور اس کے دو چاروں بعد برینن اس شخص کو خو قتل کرتا تھا یا کسی سے کرا دیتا تھا۔

اسکے ڈرائیور نے ایک بار زارا دارانہ انداز میں کسی کو بتایا۔ ”باس کل اکیلا گاڑی لے کر گیا تھا۔ جب اس نے وہاں آکر گاڑی کھڑی کی تو اس کی سیٹ پر گاڑھا گاڑھا سا کچھ لگا ہوا تھا، میرے خیال میں وہ خون اور پیچھے کا ملغوبہ تھا۔ میں نے باس کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ بے پروائی سے بولا۔ ہاں..... ہاں..... ٹھیک ہے..... اسے صاف کر دو، اس نے اس کے بارے میں کچھ بتانے کی زحمت نہیں کی، میرا خیال ہے اس نے گاڑی میں ہی کسی کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا تھا۔“

برینن کے خاص خاص ساتھی بھی کچھ اسی قسم کے لوگ تھے۔ برینن نے جب غیر قانونی شراب کے دھندے میں ہاتھ ڈالا، اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی، اس وقت وہ بمشکل اٹھائیس سال کا تھا، اس کے قریبی ساتھیوں کی عمریں اس سے بھی کم تھیں۔

جرائم اور ناجائز دھندوں کی اجارہ داری کے حساب سے شکار گواہ کئی حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور ہر حصے پر کسی مخصوص گروہ کا راج تھا۔ کوئی گروہ چھوٹا تھا، کوئی بڑا..... کسی کے پاس کم علاقہ تھا، کسی کے پاس زیادہ..... کوئی میدان میں زیادہ آگے تھا اور کوئی کسی دوسرے میدان میں۔

رفتہ رفتہ حد بندی پر جھگڑے ہونے لگے۔ جب کوئی گروہ کسی ایسے علاقے میں شراب اور غیر سلائی کرنے کی کوشش کرتا تھا جسے دوسرا گروہ ”اپنا علاقہ“ سمجھتا تھا تو مزاحمت ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ مالدھارٹ بھی ہونے لگی۔ گولیوں چلنے لگیں، گھات لگا کر بھی ایک دوسرے کو مارا جاتا۔

اچانک کہیں فائرنگ شروع ہو جاتی، دو چار لاشیں گر جاتیں، کسی کی کچھ مین نہ آتا کہ جھگڑا کیا ہے لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ یہ سب حد بندی کے جھگڑے ہیں۔ گروہوں کی آپس کی چیلنج میں شراب خانوں اور سیلٹنز کے الفاظ کی بڑی شامت آتی۔

وہ کسی ایک گروہ سے شراب کی سلائی لے رہے ہوتے تھے اور کاروبار ہمارا انداز میں چل رہا ہوتا تھا کہ کسی روز کسی اور گروہ کے دو چار

آدمی اپنے چہرے پر خوشخواری لئے اکڑتے ہوئے شراب خانے یا سیلٹن میں آ جاتے تھے۔ وہ اپنی جیبوں میں ٹھنسی ہوئی یا بلیٹ میں پھنسی ہوئی گن کی جھلک سب کو دکھا دیتے تھے۔

ان کا لیڈر کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے آدمی سے غرانے کے سے انداز میں پوچھتا تھا۔ ”تمہارے پاس جونی کا مال آتا ہے؟“

”ہاں۔“ بارٹینڈر ہونٹوں پر زبان بھیر کر جواب دیتا تھا۔ ”کل سے تمہارے پاس برینن کا مال آئے گا۔“ بد معاشوں کا لیڈر حکم صادر کرتا۔

”لیکن..... سر.....!“ بارٹینڈر ریا ریا کا مالک کچھ کہنے کی کوشش کرتا۔ ”لیکن لیکن کچھ نہیں..... بس کل سے یہاں برینن کا مال آئے گا ورنہ.....!“ وہ بد معاش جملہ ادھورا چھوڑ دیتا لیکن اس کا مطلب واضح ہوتا تھا۔

وہ چلے جاتے تو دوسرے روز برینن کا مال آنے سے پہلے جونی کے آدمی آ جاتے۔ ان کا لیڈر تمباکو کو چباتے ہوئے اور تھوک کے چھینٹے اڑاتے ہوئے پوچھتا۔ ”سنا ہے تم برینن سے مال لینا شروع کر رہے ہو؟“

بارٹینڈر یا مالک ڈرتے ڈرتے عرض کرتا۔ ”سر..... اوہ..... مال لینا شروع تو نہیں کیا لیکن کل اس کے آدمی آئے تھے۔“

”خبردار..... جو ان سے مال خریدنے کی ہامی بھری۔“ بد معاشوں کا لیڈر پوری بات سننے سے پہلے ہی حکم صادر کر دیتا۔

”لیکن..... سر.....!“ بارٹینڈر بے چارہ اپنی مجبوری واضح کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس گروہ کے نمائندے بھی اس کی فریاد نہ سنتے۔ بد معاشوں کا لیڈر بات کاٹنے ہوئے فیصلہ سناتا۔ ”تمہارے پاس شروع سے ہمارا مال آ رہا ہے، آئندہ بھی ہمارا ہی آئے گا۔“

وہ اپنا حکم سن کر رخصت ہو جاتا۔ جگہ کا مالک اور سارے ملازمین سر پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ وہ جس گروہ سے بھی مال لیتے، دوسرا گروہ انہیں سختی سکھانے آ جاتا، وہاں ہنگام ہوتا، فرنیچر ٹوٹا، پولیس نوٹیں..... حتیٰ کہ بعض لوگوں کی کھوپڑیاں بھی مٹھائی جاتیں۔ ظاہر ہے یہ سب کاروبار کو تباہ کرنے کے طریقے تھے۔

آخر میں یہ ہوتا کہ جو گروہ زیادہ طاقتور ہوتا اور وہ مال کے ساتھ ساتھ کاروبار کو تحفظ بھی فراہم کرنے کے قابل ہوتا، جگہ کا مالک اسکے زیر سایہ آ جاتا، تحفظ فراہم کرنے اور اپنی دہشت بھانے کیلئے ہی بڑے اور طاقتور گروہ چھوٹے گروہوں کے دو چار آدمیوں کو سر ہایا نہیں گھات لگا کر گولیوں سے پھینکی کر دیتے تھے۔

خطرناک مسابقت اور مقابلے کی اس فضا میں کبھی کبھار تھیں گرانے کا حربہ بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جان نور یو کو بھی اپنی بیڑی کی قیمت گرائی پڑی حالانکہ اس کا اور برینن کا گروہ ہی شہر میں باقی سب سے زیادہ مضبوط تھا۔ بیڑی کا ایک ہیرل وہ پچاس ڈالر میں سیلائی کر رہا تھا، ایک باس کی ضد میں وہ اس کی قیمت کم کرتے کرتے دس ڈالر فی ہیرل پر لے آیا حالانکہ دس ڈالر سے زیادہ تو اس پر لاگت آ جاتی تھی لیکن ”گردن کاٹ“ مقابلے میں یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

اس فضا اور اس پس منظر میں 1923ء کے میز کے انکیشن میں ڈیور نامی امیدوار ایک لاکھ دو سو ڈال کی اکثریت سے جیت گیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی اور ڈیور کا اس اکثریت سے جیتنا بھی ایک حیرت انگیز واقعہ تھا کیونکہ ڈیور ایک نہایت نیک نام، اصلاح پسند اور دیانتدار آدمی تھا۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں جرائم خوب پھیل پھول رہے تھے، کرپشن اور بد عنوانی عروج پر تھی، وہاں ایک ایسے آدمی کا میئر منتخب ہو جانا عجیب لگتا تھا، جس کی شہرت بے داغ تھی، جس کی اصول پرستی اور دیانتداری کے سب قائل تھے۔

شاید یہ معاشرے کی اس دلی ہوئی مگر اصل اور بنیادی خواہش کی عکاسی تھی کہ اسے جرائم اور کرپشن سے نجات ملے، وہاں کے لوگ بھی جرائم سے پاک اور صاف ستھرا ماحول چاہتے تھے۔

ڈیور کی عمر اس وقت ساٹھ سال تھی۔ وہ دس سال تک ایک علاقے کا ایڈمرین اور پھر جج رہا تھا۔ کسی بھی حیثیت میں بھی اس کی شہرت پر ڈر سا بھی داغ نہیں آتا تھا تاہم اس کی شخصیت اور اس کی کامیابی کے بعض پہلو خالص دھچپ تھے۔

مثلاً یہ کہ وہ خود زبردست شرابی تھا، اس کا شمار بے تحاشا پینے والوں میں ہوتا تھا لیکن وہ شراب کے سلسلے میں حکومت کی عائد کردہ تمام پابندیوں اور ٹیکسوں وغیرہ کے حق میں تھا۔

اس کا کہنا تھا۔ ”میں شرابی ضرور ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شرابی اصلاح پسند نہیں ہو سکتا۔ مجھے فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں اور میں کوئی بہت اعلیٰ قسم کی اصلاحات بھی نہیں چاہتا، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ معاشرے میں قانون کی حکمرانی ہونی چاہئے۔ حکومت وقت جو قوانین نافذ کرے، ان پر واقعی عمل ہونا چاہئے۔“

دوسری عجیب بات یہ تھی کہ ڈیور کی انتخابی ہم میں برینن نے بھی پیسہ لگایا تھا اور ڈیور نے یہ جانتے ہوئے بھی اس کا پیسہ قبول کر لیا تھا کہ وہ غیر قانونی شراب کا دھندا کرنے والوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ ناجائز دھندے اور محکوک کاروبار کرنے والے لوگ عام طور پر سیاستدانوں کی انتخابی ہم میں اسلئے پیسہ لگاتے ہیں کہ اگر وہ برسر اقتدار آ گئے تو ان کے بیسیوں کام سنواریں گے۔

تاہم برینن کا ڈیور کی ہم میں پیسہ لگانا پھر بھی حیرت کی بات تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ڈیور بد عنوان سیاستدان نہیں ہے۔ اصلاح پسند ہے اور خاص طور پر شراب کے بارے میں اصلاحات نافذ کرنے کا زبردست خواہشمند ہے۔ شاید برینن نے سوچا ہو کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، اقتدار میں آنے کے بعد سب ٹھیک کی کان میں ٹھک ہی ہو جاتے ہیں۔ سب دولت کی ہوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور سب اپنے اصول قاعدے بھول جاتے ہیں۔ اسے امید ہوگی کہ ڈیور لاکھ اصول پسند اور دیانتدار کسی لیکن انتخابی ہم میں اس کا پیسہ لگوانے کے بعد کچھ تو ”حق ٹھک“ آوا کرے گا۔

دوسری طرف ڈیور نے اس ضمن میں دلیل دی۔ ”میں معاشرے میں اصلاح چاہتا ہوں لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ میرے پاس کچھ اختیارات ہوں اور اختیارات حاصل کرنے کیلئے انکیشن لڑنا پڑتا ہے جبکہ انکیشن لڑنے کیلئے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، مجھ جیسے لوگ جن کے پاس موروثی دولت بھی نہیں ہوتی اور جو دولت کمانے کا فن بھی نہیں جانتے، وہ تو سادگی سے بھی انکیشن لڑنے کے قائل نہیں ہو سکتے، ایک ایسا شخص جس نے اپنے عہدے سے کبھی کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا ہو اور صرف اپنی جائز آمدنی میں ہی گزارا کیا ہو، اسے انکیشن لڑنے کیلئے سہاروں کی ضرورت تو پڑتی ہے، فی الحال میں یہ نہیں دیکھ رہا کہ سہارا کس کی طرف سے میسر آ رہا ہے، پہلے میرے لئے ایک با اختیار پوزیشن پر پہنچنا ضروری ہے پھر میں دیکھوں گا کہ مجھے اپنے خیالات کو عملی جامہ کیسے پہنانا ہے۔“

لگتا بھی تھا کہ لوگوں نے ڈیور کی اس دلیل کو قبول کر لیا تھا اور اس کی ذات سے اچھی امیدیں بدستور وابستہ کر رکھی تھیں۔ اسی لئے اسے بھاری اکثریت سے میئر منتخب کر لیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ شہر کی اصلاح کیلئے کیا کرتا ہے؟

(جاری ہے)



ڈیور نے میز منتخب ہوتے ہی بڑ جوش انداز میں اصلاح کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کیپٹن مورگن کولن کو پولیس چیف مقرر کر دیا۔ کیپٹن کولن بھی میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوا کرتا تھا لیکن

اصل خطرہ یہ تھا کہ کولن اگر اسی یکسوئی اور جوش و خروش سے اپنی کارروائیاں کرتا رہا تو آخر کار دھندے ہانگل ہی بند ہو جائیں گے۔ جان نوریو نے کولن کو ایک ہزار اور روزانہ دینے کی پیشکش کی جس کے عوض وہ صرف یہ یقین دہانی چاہتا تھا کہ اس کے دھندوں میں

# الکھون

جرم کے بادشاہ کی امتیازی دلچسپی اور سنسنی خیز جی کہانی

ماہی کا ایک کھڑا بکوسنی ندی کی لڑکی میں جنم لینا رشتا ہے

ترجمہ: محمود احمد مودی

قسط: 7



پولیس کی نوکری میں آگیا تھا۔ اس کی شہرت ایک دیا انتظار پولیس آفیسر کی تھی۔ دیا انتظار ہونے کے ساتھ ساتھ اسے ایک ایسا پولیس آفیسر بھی سمجھا جاتا تھا جسے اگر موقع دیا جاتا تو وہ بڑے بڑے اصلاحی کام کر سکتا تھا۔ ڈیور نے اسے پولیس چیف بنا کر گویا موقع بھی فراہم کر دیا اور ضروری اختیارات بھی مہیا کر دیئے۔

ویسے جب وہ کیپٹن تھا تو ایک بار پولیس کے ایک تفتیشی افسر نے اس کے بارے میں افسران بالا کو رپورٹ دی تھی کہ اس کے پولیس اسٹیشن کی حدود میں کم از کم سولہ آدمی سڑکھانے اور غیر قانونی شرطیں بک کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو بک بیکر یا مختصر بک کہا جاتا تھا۔

اس افسر کی رپورٹ اس کی ایک نئی کثوت نہیں تھی اور نہ ہی وہ شہر کی اصلاح کی فکر میں دہلا ہو رہا تھا بلکہ یہ محض دفتری سیاست اور پیشہ ورانہ رقابت کا شواہد تھی۔ ہر دفتر اور ہر جگہ میں دیا اندازی سے اپنے فرائض انجام دینے والوں کو بھی اپنے ساتھیوں کے حسد اور رقابت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کے اپنے ہی ساتھی ان کی ٹانگ کھینچنے کیلئے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

تاہم دیا انتظار افسروں کے دل میں چونکہ چور نہیں ہوتا اس لئے وہ ایسی صورتحال سے پریشان نہیں ہوتے اور وہی جواب دیتے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ کیپٹن کولن نے اس اعتراض کے جواب میں اپنے افسر سے کہا تھا۔ ”سرا! مجھے اپنے علاقے کی ہر مشکوک جگہ کی نگرانی کرنے اور ان پر نظر رکھنے کیلئے کم از کم تین سو مزید آدمیوں کی ضرورت ہے، ان جگہوں کے آگے پیچھے دونوں طرف دروازے ہوتے ہیں اور ان میں ہر وقت چچاس افراد کی آمد و رفت رہتی ہے، ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ طرز کورنگے ہاتھوں سمیت پکڑیں، ایسی ہی کارروائی موثر بھی جاتی ہے۔ اگر کارروائی کا کوئی نتیجہ نہ نکلے اور عدالت میں کوئی بات ثابت نہ کی جاسکے تو اسے بھی وقت اور توانائی کا زیاں سمجھا جاتا ہے اور اس پر بھی ہمیں افسروں سے ڈانٹ پڑتی ہے۔ آپ خود ہی سوچیں موجودہ پولیس فورس کے ساتھ میں کی طرح موثر کارروائیاں کر سکتا ہوں؟ جو کچھ میرے بس میں ہے، وہ بہر حال میں کر رہا ہوں۔“

اس کے استدلال کے سامنے افسر بھی لا جواب ہو گئے۔

ڈیور نے جب اسے پولیس چیف بنایا تو جس حد تک بجٹ اجازت دیتا تھا، اس حد تک کچھ نئی مہرتیاں کرنے کا اختیار بھی دیا۔ کولن نے اس کے فراہم کردہ مواقع اور اختیارات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی سے کارروائیاں شروع کر دیں۔

اس نے قمار خانوں اور بدنام جگہوں کے خلاف ہم کے انداز میں کارروائیاں کیں۔ ایک مرحلے میں اس نے 500 آدمیوں کو گرفتار کیا۔ دوسرے مرحلے میں 450 افراد کو گرفتار کیا، چھ مہینے کے اندر اندر اس نے چار ہزار سے زائد سیلون بند کر دیئے اور پانچ سو کے قریب ایسی جگہیں بند کر دیں جو ”سوڈا پار“ کہلاتی تھیں۔ بظاہر وہاں لوگ صرف کوئلہ دیکھ پینے آتے تھے لیکن درحقیقت وہاں شراب و غیرہ ملتی تھی اور موقع دیکھ کر لوگ دوسری حرکتیں بھی کر لیتے تھے۔

کولن نے تمام قاتلوں کے انچارج آفیسرز سے کہہ دیا تھا: ”مجھے ہر حال میں نتائج چاہئیں، مجھے اس شہر کو ناجائز دھندوں سے پاک کرنا ہے۔“

پھر اس نے ایک پریس کانفرنس میں کہا۔ ”اگر میرے ساتھی آفیسر مجھے میرے مطلوبہ نتائج نہیں دیں گے تو جلد ہی وہ اپنے لئے دوسری نوکریاں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔“

پریس والوں نے پہلے بھی بہت سے پولیس آفیسرز سے اس قسم کے دعوے سنے تھے۔ وہ نظریے اور استہزائیہ سے انداز میں مسکرا کر رہ گئے۔ گویا دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں۔ ”اچھا جتنا ب.....! آچکھی دیکھ لیتے ہیں کہ آپ کیا حیرت مارے ہیں۔“

لیکن پھر جب مختلف کاروبار کرنے والے 1400 سے زائد افراد کے لائسنس منسوخ کئے گئے تو پریس والوں کو بھی یقین کرنا پڑا کہ نیا پولیس چیف اپنے ارادوں کے معاملے میں ٹھوس معلوم ہوتا ہے۔

ظاہر ہے جان نوریو اور الیکھون کا کاروبار بھی کولن کی کارروائیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ کولن معقولیت اختیار کرنے پر ذرا بھی آمادہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جان نوریو اور الیکھون کی اصطلاح میں ”معقولیت اختیار کرنا“ رشوت قبول کرنے کو کہتے تھے۔

رشوت قبول کرنے والے آفیسر کے بارے میں وہ لوگ اس طرح بات کرتے تھے کہ ”بھئی کل میں کیپٹن جونی سے ملا تھا، بڑا ہی معقول آفیسر ہے۔“

جو آفیسر رشوت نہیں کھاتا تھا، ان کی اصطلاح کے مطابق وہ نامعقول ہوتا تھا۔

جان نوریو کا کلب ”ڈیورسز“ اب اس کا اور الیکھون کا ہیڈ کوارٹر تھا لیکن وہ بھی کولن کی کارروائیوں کی زد میں آگیا۔ کولن نے بذات خود اس پر چھاپہ مارا اور اس پر بڑا سا ٹانگا لگا دیا۔ ویسے تو ان کے پاس ایک متبادل ہیڈ کوارٹر ”پرنسٹن ہول“ میں بھی تھا لیکن ان کی اصل پریشانی یہ نہیں تھی کہ وہ ہیڈ کوارٹر کے طور پر کون سی جگہ استعمال کریں۔

ان کی اصل پریشانی تو کولن کا طریقہ کار تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اگر کولن اسی طرح شہر کو ناجائز دھندوں سے پاک کرنے کی ہم چلاتا رہا تو ان کیلئے ”کاروبار“ جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اب بھی کاروبار میں دشواریاں پیش آرہی تھیں لیکن ناجائز دھندے کرنے والے بہت سخت جان ہوتے ہیں، وہ اپنی ہٹا کی جنگ لڑتے رہتے ہیں۔ آسانی سے ہار نہیں مانتے۔

ابھی کسی نہ کسی حد تک یہ اطمینان تھا کہ ایک آؤہ بند ہوتا تھا تو اس کی جگہ چھپ چھپا کر کوئی نہ کوئی دوسرا آؤہ نکل جاتا تھا۔ دوسرے آؤہ سے پرگو کہ پہلے آؤہ جیسا دھندہ نہیں ہوتا تھا۔ آمدنی کم ہو جاتی تھی لیکن یہ اطمینان ہوتا تھا کہ کم از کم دھندہ جاری تو ہے۔ جان نوریو اور الیکھون کو

مدخلت نہ کی جائے، اس نے یہ پیشکش بتدریج بڑھا کر ایک لاکھ ماہانہ تک کر دی۔ آج سے تقریباً 80 سال پہلے ایک لاکھ ڈالر ماہانہ بہت بڑی رقم تھی اور کولن کو یہ پیشکش صرف جان نوریو ہی کی طرف سے نہیں تھی، شہر میں اور بھی کئی شخصیات تھیں جو کولن کو ایسی ہی پیشکشیں کر رہی تھیں مگر وہ شخص اپنے کردار کی مضبوطی پر بلاشبہ داد و تحسین کا مستحق تھا کہ وہ لالچ میں نہیں آیا۔ جس راستے پر وہ چل رہا تھا، اس پر اس کے قدم نہیں ڈگمگائے حالانکہ اس کا انکار اسے نہ صرف بھاری مالی فوائد سے محروم کر رہا تھا بلکہ اس کیلئے روز بروز خطرات بھی بڑھ رہے تھے۔ وہ درندوں کی کچھاروں میں ہاتھ ڈال رہا تھا۔ ایسے ایسے لوگوں کے دھندے بند کر رہا تھا جنہوں نے اس سے پہلے پولیس سے مکمل تحفظ حاصل کر رکھا تھا۔ پولیس، جان نوریو اور الیکھون جیسے لوگوں کی توجیب میں ہوتی تھی۔

ایک طرف پولیس کی سختی جاری تھی، دوسری طرف انہی دنوں جان نوریو اور الیکھون کے دو مشترکہ دشمن سراٹھانے لگے۔ ان میں سے ایک کا نام ڈؤل اور دوسرے کا مارٹن تھا۔ ڈؤل ایک قد آور مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا۔ چہرہ شکن آلود ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بڑی عمر کا لگتا تھا لیکن درحقیقت اس کی عمر کچھاتی زیادہ نہیں تھی۔

ڈؤل کے تین بھائی بھی تھے۔ چاروں کے چاروں بھائی بد معاش تھے لیکن ڈؤل سب سے بڑا بد معاش تھا۔ وہ الیکھون کو خاص طور پر اپنا حریف تصور کرتا تھا اور اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھ کر اکثر کہا کرتا تھا۔ ”الیکھون اگر مردوں کی طرح خالی ہاتھ آکر کسی سڑک یا کسی میدان میں مجھ سے مقابلہ کرے تو میں اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں، اگر وہ بھی میرے جیسے چڑھ گیا تو میں اسے زندہ دفن کر دوں گا۔“

اس قسم کے اعلانات وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ اپنے بد معاش بھائیوں کے سر پر بھی وہ کچھ زیادہ اکڑتا تھا تاہم اس کا اور الیکھون کا بھی آنا سامنا نہیں ہوا تھا اور ڈؤل کو اپنے دعوے عملی طور پر چرچ ثابت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

درحقیقت ڈؤل کا بھی ناجائز شراب کا دھندہ تھا مگر سچ میں وہ کچھ عرصے کیلئے چل چلا گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا کاروبار درہم برہم ہو گیا۔ وہ اس کا سب سے زیادہ ڈے دار الیکھون کو سمجھتا تھا۔

وہ بیرون پرنٹیل سے رہا ہوا تو تمام تر ناموافق حالات کے باوجود اس نے دوبارہ اپنا دھندہ جمانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ چیل میں رہنے کے دوران اس کے بہت سے ایسے لوگوں سے تعلقات استوار ہوئے جو اس کی نظر میں ”کام“ کے آدمی تھے۔ ان میں سے بھی بعض بیرون پر رہا ہو چکے تھے، ڈؤل نے انہیں بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

وہ جن سیلونز اور شراب خانوں میں اپنے نمائندوں کو شراب کی سپلائی کے معاملات طے کرنے کیلئے بھیجتا تھا، ان میں زیادہ تر جان نوریو اور الیکھون کی شراب کے گاہک ہوتے تھے۔ ڈؤل کے آدمی وھونس اور دھمکی کے ذریعے انہیں اپنا سپلائر تبدیل کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتے۔ جان نوریو کو پتہ چلا کہ ایک اور پارٹی مقابلے میں آگئی ہے تو اس نے اپنی تیز کی قیمت دس ڈالر فی بیرل کم کر دی۔ وہ پہلے کاروباری حریفوں کے ذریعے ہی حریف کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اسی دوران ڈؤل کا نمائندہ ایک بار میں پہنچا۔ اس کے مالک کا نام گیز تھا اور اس روز گیز خود بھی بار میں موجود تھا۔ وہ تقریباً چالیس کی عمر کا ایک مضبوط اور باؤی بلڈز ٹائپ آدمی تھا، وہ الیکھون اور جان نوریو کا بہت ہی وفادار گاہک تھا۔ اب تو پتہ چلا کہ دس ڈالر فی بیرل کی مزید رعایت سے بھی ملنے لگی تھی لیکن وہ اس قسم کا آدمی تھا کہ اگر اسے یہ رعایت نہ ملتی تب بھی وہ جان نوریو اور الیکھون کی تنہی ہوئی شراب ہی خریدتا۔

وہ اس وقت کاؤنٹر پر ایک طرف لالچ سے انداز میں کھڑا تھا۔ جب ڈؤل کا نمائندہ اندر آیا اور بارینڈر سے مذاکرات کرنے لگا، مذاکرات کیا تھے بس دھمکیاں ہی دھمکیاں تھیں۔ بارینڈر نے بے بسی سے گیز کی طرف دیکھا تو وہ آگے آیا۔

”میرے آدمی نے جب تمہیں بتادیا ہے کہ ہم کسی اور سپلائر سے مال لیتے ہیں تو تم اسے اپنا مال بک کرانے پر کیوں مجبور کئے جارہے ہو؟“ اس نے کافی جمل سے ڈؤل کے نمائندے سے پوچھا۔

”اور جب ہم اسے بتا چکے ہیں کہ یہ اب اپنے پرانے سپلائر کو بھول جائے تو یہ ہماری بات کیوں نہیں سن رہا؟“ نمائندہ غرایا۔ ”تم نے ڈؤل کا نام تو سنا ہی ہوگا، آئندہ تمہیں ڈؤل ہی کا مال لینا ہوگا یا پھر کاروبار بند کر کے کوئی اور کام کرنے کے بارے میں سوچ لو۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ گیز نے اب بھی رساں سے پوچھا۔

”ہاں۔“ نمائندے نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اور ہماری دھمکی صرف دھمکی نہیں ہوتی ہمیں اس پر عمل کرنا بھی آتا ہے۔“

تب گیز کاؤنٹر کے عقب سے نکل آیا۔ اس نے اچانک اور نہایت تیزی سے نمائندے کو دو گھونے رسید کئے، اس کیلئے دھمکونے ہی کافی تھے، نمائندہ وہیں چت ہو گیا۔ گیز نے اسے کسی بوری کی طرح دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور بارے سے باہر لے جا کر پھینک دیا۔ نمائندے کے ساتھ پتلا دبلا بندر ٹائپ ایک شخص اور بھی تھا، وہ نمائندے کو گھونے پڑتے دیکھ کر پہلے ہی باہر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو بچانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ گیز ہاتھ جھانڑا ہوا اندر واپس آگیا اور دوبارہ کاؤنٹر کے عقب میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

گیز ایک جرأت مند اور بے خوف آدمی تھا۔ اس نے ڈؤل کے بارے میں سن رکھا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ کس طرح وھونس، دھمکی اور غلڑہ گردی کے ذریعے شراب کے کاروبار میں قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ ان باتوں سے مرعوب نہیں ہوا تھا اور اس نے اپنی دانست میں ڈؤل کے نمائندوں کے ساتھ سچ سلوک کیا تھا۔ اسے کسی حد تک یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ جس طرح جان نوریو اور

الیکھون کا قافدار گاہک تھا، اسی طرح وہ دونوں بھی اسے اہمیت دیتے

تھے اور انہوں نے اشاروں کنایوں میں اسے تسلی دے رکھی تھی کہ اگر وہ اچھے دوستوں کی طرح ثابت قدمی سے ان کے ساتھ چلے گا تو وہ اس کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور اسے پولیس اور حریفوں کی چیرہ دستی سے بچائیں گے۔

گو کہ گیز کو ان تسلیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ایک دلیر آدمی تھا اور وہی کرتا تھا جو اس کا دل کہتا تھا لیکن بہر حال جان نوریو اور الیکھون جیسے آدمیوں کی طرف سے اس قسم کی تسلی نے اس کے حوصلے بڑھائے تھے اور اسے مزید بے خوف بنایا تھا۔

تاہم اس بچارے کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی یہ بے خوفی اسے کتنی بھی پڑنے والی تھی۔ ابھی اسے ڈؤل کے نمائندے کو بارے سے باہر پھینکے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ چار آدمی گھنٹیں لہراتے ہوئے بار میں داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی گیز کے سر پر گولوں کے دستوں سے کئی وار کئے۔

اگر دست بہ دست لڑائی ہوئی تو شاید گیز چار آدمیوں کا بھی مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا لیکن آنے والوں نے اسے اس کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کی کھوپڑی ہی بری طرح چٹختی دی، وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

چاروں بد معاشوں نے بارینڈر کو بھی نہیں بخشا۔ وہ بچپارہ ایک مسکین اور مفتی سا آدمی تھا۔ وہ ان کی سفاکانہ مار پیٹ کی تاب نہ لا سکا اور چند لمحوں میں ہی جان سے گزر گیا۔ ڈؤل کے چاروں بد معاشوں نے قہقہے لگاتے ہوئے اور قاتحانہ انداز میں اکڑتے ہوئے دروازے کا رخ کیا۔ یہ چاروں بھی ڈؤل ہی کی طرح بیرون پر رہا ہونے والے پرانے جرائم پیشہ اور بد معاش تھے۔

بارے نکلے وقت انہوں نے اپنی گھنٹیں بھی بیجوں میں ٹھونس لی تھیں۔ اس وقت ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے باہر آتے ہی چار آدمیوں کو صف کی سی صورت میں سامنے کھڑے پایا۔ وہ پگلیں جھپٹے بغیر انہیں گھور رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ خاص بات یہ تھی کہ ان چاروں کے ہاتھوں میں خوفناک ساخت کے رپو اور تھے جن کا رخ انہی کی طرف تھا۔

ڈؤل کے بد معاشوں کو اپنے رپو اور دوبارہ جیبوں سے نکالنے کی مہلت نہیں ملی۔ دوسرے ہی لمحے فضا قافروں کے دھماکوں سے گونج اٹھی اور وہ چاروں آڑے تر جھجے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا تو آدھا چہرہ ہی اڑ گیا تھا۔ انہیں موقع پر ہی اپنے کئے کی سزا مل گئی تھی اور کچھ زیادہ ہی مل گئی تھی۔

وہ چاروں بندوق بردار چند لمحوں کے اندر اندر وہاں سے غائب ہو گئے۔ سڑک پر بھگدڑ مچ گئی تھی، جس کا جدر مدہ اٹھا، بھاگ لیا۔ خواہنے والے تک غائب ہو گئے۔ ٹیلیوں والے اپنے ٹیلی دھکیلے ہوئے نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ چار لاشوں سے بہتا ہوا خون سڑک کو سرخ کر رہا تھا، وہ ایک عبرتناک منظر تھا۔

ہوا دراصل یہ تھا کہ جب ڈؤل کے نمائندے آئے تھے اور گیز ان سے الجھ رہا تھا تو جان نوریو اور الیکھون کا ایک آدمی گاہک کی حیثیت سے بار میں موجود تھا۔ اس نے جب گیز کے ہاتھوں ڈؤل کے نمائندے کی درگت بننے دیکھی تھی تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے، اس نے باہر جا کر جلدی سے الیکھون کو اس صورتحال سے مطلع کر دیا تھا۔

الیکھون اپنے اور جان نوریو کے وقاداروں کو مشکل وقت میں تباہ چھوڑنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس نے فوراً اپنے کارندے روانہ کر دیئے تھے اور انہیں ہدایت کر دی تھی کہ وہ ڈؤل کے آدمیوں کو کوئی بھی حرکت کرنے سے باز رکھیں اور اگر وہ کوئی کارروائی کر چکے ہوں تو انہیں اسی کی مناسبت سے سخت ترین سزا دیں۔ الیکھون کے آدمی جب وہاں پہنچے تو انہیں یہی اندازہ ہوا کہ ڈؤل کے آدمیوں نے گیز اور اس کے بارینڈر کو بیدری سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، انہوں نے انہیں سزا دینے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔

گیز بہر حال ایک سخت جان آدمی تھا۔ اس کی کھوپڑی جس طرح چٹختی تھی، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید مر چکا ہوتا لیکن وہ اسپتال پہنچ کر موت کے منہ سے واپس آگیا، اس کا بارینڈر البتہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

اس واقعے نے شہر میں سنسنی پھیلا دی۔ شراب کے دھندے اور حد بندی کے جھگڑے کے سلسلے میں ہونے والی یہ پہلی خونریزی تھی۔ حسب توقع اس واقعے کا بھی کوئی چشم دید گواہ میسر نہ آسکا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کون آیا، کہاں سے آیا، کس نے کس کو مارا..... بعض لوگوں نے یہ اعتراف ضرور کیا کہ انہوں نے قاتلنگ کی آواز سنی تھی لیکن انہیں نہیں معلوم کہ قاتلنگ کس وجہ سے ہو رہی تھی اور کون کس پر قاتلنگ کر رہا تھا۔ میئر نے اس سلسلے میں گویا سکھ کی سانس لیتے ہوئے پریس کو بیان دیا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ اس واقعے میں شریف شہری ہلاک نہیں ہوئے۔“

اس نے بے چارے بارینڈر کو بھی شریف شہریوں میں شمار نہیں کیا تھا۔

حریفوں اور دشمنوں کے معاملے میں قسمت جان نوریو اور الیکھون پر مہربان تھی۔ ڈؤل کا دماغ تو اپنے چار بد معاشوں کی اس انداز میں موت سے ہی کافی حد تک ٹھنکا ہے پر آگیا۔ جان نوریو اور الیکھون کا ایک اور کاروباری حریف مورٹن بھی تھا۔ وہ برٹین کا دوست بھی تھا۔ اس دوستی کی بنیاد پر وہ اپنے آپ کو اور بھی زیادہ طاقتور محسوس کرتا تھا۔

وہ بھی اکثر جان نوریو اور الیکھون کو سبق سکھانے اور ان کا دماغ درست کرنے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ الیکھون کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اس شخص سے ٹکرانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

مورٹن کو گھڑ سواری کا بہت شوق تھا اور وہ خود کو بہت اچھا گھڑ سوار سمجھتا تھا۔ یہ محض اس کی خوش قسمتی تھی۔ اس نے اپنا کوئی گھوڑا پیالا ہوا نہیں تھا۔ جب اسے گھڑ سواری کا شوق چراتا تھا تو ایک اچھے اصطبل سے گھوڑا کرائے پر لے لیتا تھا اور کسی طرف نکل جاتا تھا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا اور ایک عمدہ اپارٹمنٹ میں رہتا تھا، اس کا دوست برٹین دو سال پہلے شادی کر چکا تھا۔

ایک روز مورٹن گھڑ سواری کیلئے گھوڑا لینے کی غرض سے اصطبل پہنچا۔ اس نے اپنے لئے عمدہ نسل کا سفید اور صحت مند گھوڑا پسند کیا، اصطبل کے منتظم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”سر.....! یہ گھوڑا ابھی صبح طرح سدھا ہوا نہیں ہے، ہو سکتا ہے یہ آپ کیلئے مسئلہ بنے، بہتر ہے کوئی دوسرا گھوڑا پسند کر لیں۔“

”نہیں.....! مجھے یہی گھوڑا چاہئے۔“ مورٹن کے لہجے میں فوراً ہی خدائ گئی۔

”سر.....! یہ ابھی کچھ سرکش ہے..... ہفتے دس دن میں باہر لے جانے کے قابل ہو جائے گا۔“ منتظم نے ایک بار پھر اسے سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش کی۔ مورٹن جیسے لوگوں سے اسے مرعوب ہی رہنا پڑتا تھا، وہ انہیں زیادہ سختی سے کسی بات سے منع نہیں کر سکتا تھا۔

”تمہارا خیال ہے کہ میں سرکش گھوڑوں کو قابو میں کرنے کا اہل نہیں ہوں؟“ مورٹن نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

تب بے چارہ منتظم خاموش ہو گیا۔

مورٹن گھوڑا لے کر اصطبل سے باہر آیا اور اس پر سوار ہوا تو گھوڑا ابری طرح نہنٹا اور کچھلی دونوں ناگوں پر کھڑا ہو گیا۔ مورٹن نے اسے قابو میں کرنے کی کوشش کی تو وہ اور پھر گیا اسی کیفیت میں وہ سڑک پر گولی کی رفتار سے بھاگنے لگا۔

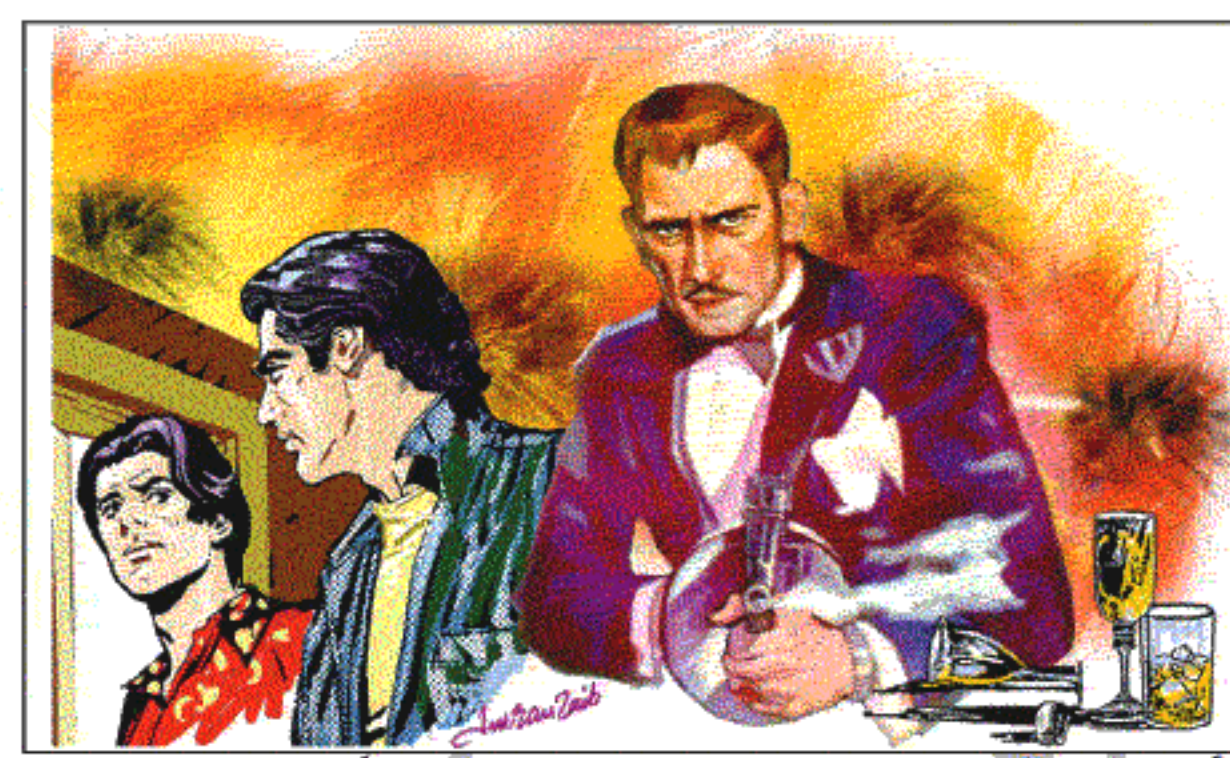


اب مورٹن کے حواس ذرا خراب ہوئے۔ اس نے سوچا کہ گرنے سے

بچنے کیلئے اسے رکابوں میں پاؤں بٹا کر کھڑے ہو جانا چاہئے مگر اس کی بدقسمتی تھی کہ جو نبی وہ کھڑا ہوا، اس کے وزن سے ایک طرف کی رکاب

انہیں ان کے آبائی گاؤں لے آیا تھا اور یہاں بھی ان کیلئے دنیا کی ہر آسائش کا انتظام کر دیا تھا۔

گاؤں کے پچارے سیدھے سارے لوگوں کو معلوم تھا اور نہ ہی انہیں یہ جاننے سے غرض تھی کہ جان نوریو نے امریکا میں دولت کیسے کمائی ہے،



تھی۔

وہ گھوم کر سر کے بل اس طرح سرک پر گرا کہ اس کا دوسرا پاؤں بدستور رکاب میں پھنسا ہوا تھا۔ گھوڑے کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی، وہ اسی طرح گھٹ پھٹا رہا تھا۔ آخر کار جب برٹین کے آدی مورٹن کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے تو وہ بہت بری حالت میں سرک پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

انہوں نے اسے اٹھا کر اسپتال پہنچایا مگر اسے ہوش نہ آیا، اسی بے ہوشی کی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ برٹین کو ایک سچے دوست کی طرح اس کی موت کا بے حد افسوس ہوا، اس افسوس کا عملی اظہار اس نے یوں کیا کہ گھوڑے کو تلاش کر کے رسیوں سے بندھوایا اور پھر اسے ایک میدان میں لے جا کر گولی مار دی۔

واپس آ کر اس نے اسٹبل کے مالک کو فون کیا اور کہا۔ ”میں نے تمہارے اس ڈیل گھوڑے کو بیٹھ سکا دیا ہے۔ اس کی لاش گراؤنڈ میں پڑی ہے، اگر اس کی زین کچھ قیمتی ہے اور تمہیں اس کی ضرورت ہے تو کسی آدی کوچنگ کراٹر والو۔“

یوں جان نوریو اور الیکھون کو اپنے دوسرے دشمن اور کاروباری حریف سے خود بخود نجات مل گئی۔ ڈول کے چار آدمیوں کے قتل پر میگز ڈیور پولیس والوں پر خوب برہم ہوا۔ اس نے ایک پولیس آفیسر کو معطل بھی کر دیا اور ایک کا تدارک کر دیا۔

پریس کے سامنے اس نے دعویٰ کیا۔ ”ٹھیک ہے..... مرنے والے کوئی اچھے انسان نہیں تھے لیکن پولیس بہر حال دوسرے سب کام چھوڑ کر ان کے قاتلوں کو تلاش کرے گی اور اس وقت تک جین سے نہیں بیٹھگی جب تک انہیں سزا نہیں مل جاتی۔“

شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے پہلے پریس کے سامنے جو بیان دیا تھا، اس پر لے دے ہو سکتی تھی اسلئے اس نے جلدی سے دوسری پریس کانفرنس میں یہ بات کر دی تھی۔ اسے اندازہ تو تھا کہ یہ واردات جان نوریو اور الیکھون کے گروہ کی تھی لیکن اسے ثابت کرنا بہت مشکل تھا۔ واردات کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ غیر قانونی شراب کی فروخت کا شواہد تھا۔

اس نے پوچھ گچھ کیلئے الیکھون کو بلوا بھی لیا جبکہ جان نوریو خود ہی حاضر ہو گیا۔ واردات کے وقت جان نوریو تو شہر میں ہی نہیں تھا۔ الیکھون نے بھی جانے دھڑ سے اپنی غیر حاضری ثابت کر دی۔ اسکے رپورٹور بھی چپک کے گئے۔ اسکے پاس دور یو اور تھے مگر اسکے پاس ان کے لائسنس بھی موجود تھے۔

ویسے تو جرائم پیشہ لوگوں کیلئے بھی ہتھیاروں کے لائسنس حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اگر فکا گوئیں کوئی دشواری پیش آتی تو قریبی شہر سیمرو جا کر لائسنس حاصل کیا جاسکتا تھا۔ الیکھون کے پاس دونوں لائسنس سیمرو سے جاری شدہ تھے۔

سیمرو، فکا گو سے تقریباً چھ میل دور ایک الگ شہر تھا۔ وہ فکا گو جتنا بڑا تو نہیں تھا لیکن بہر حال ریاست الی ٹوائے کا پانچواں بڑا شہر تھا۔ وہ شہر خاص طور پر الیکھون کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اسے اس شہر میں بہت سی خوبیاں نظر آتی تھیں۔

سب سے اچھی بات تو یہ تھی کہ وہ فکا گو سے دور نہیں تھا مگر وہاں کے قوانین فکا گو سے بہت مختلف تھے۔ دوسرے وہاں کی انتظامیہ ذمہ داری کر پٹ تھی۔ وہاں سرکاری عہدیداروں کو آسانی سے خریدنا جاسکتا تھا۔ شہری آبادی اچھی خاصی تھی۔ وہاں ناجائز شراب کی کھپت اور دیگر جرائم سے ہماری آمدنی ہو سکتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ فکا گو کی افعال جرائم پیشہ افراد کی توجہ اس شہر کی طرف نہیں تھی۔ کسی بڑے گروہ نے وہاں قدم نہیں بھانے تھے۔

سب سے پہلے الیکھون ہی کی نظر کرم اس شہر کی طرف گئی تھی اور اس نے وہاں بچے گاڑنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اس نے وہاں ایک ناکام اور متروک ہوئی سٹے داموں خرید لیا تھا اور اسے دوبارہ چلانے کے انتظامات کرنے لگا تھا۔ اسے اس طرح کی جنگوں کو چلانے کا خوب تجربہ ہو چکا تھا۔

ویسے بھی فکا گو میں ”اصلاح پسند“ میسر کی وجہ سے جان نوریو اور الیکھون جیسے لوگوں کیلئے دشواریاں روز بروز بڑھ رہی تھیں۔ ایسے میں ایک متبادل اور مضبوط مرکز کا ہونا بہت ضروری تھا۔ فکا گو میں بھی ان کے کاروبار پر تو تھوڑا بہت اثر پڑا تھا لیکن باقی تمام پہلوؤں سے وہ اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ میسر ڈیور جیسے آدی کیلئے بھی ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہا تھا۔

ڈول کے آدمیوں کے قتل کے کیس میں ان کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میسر ڈیور کے پریس کے سامنے دعوے محض دعوے ہی رہے۔ بڑے شہروں کی ہما بھی اور ہنگامہ خیز زندگی میں لوگ بہت جلد بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں تو اگر آج کے مقابلے میں وہ دور خاصا ست رفتار تھا اور آج کے بڑے شہروں کے مقابلے میں فکا گو کی آبادی کو بہت زیادہ نہیں کہا جاسکتا لیکن سب چیزیں بہر حال اپنے اپنے وقت کے پیمانوں سے ناپی جاتی ہیں۔ اپنے وقت کے اعتبار سے فکا گو بہت بڑا شہر اور وہاں کی زندگی بڑی ”طوفانی“ تھی۔

پولیس کو جان نوریو اور الیکھون کو پوچھ گچھ کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ ڈول بھی سروسٹ تو چپ ہو کر بیٹھ گیا تھا، ایسا لگتا تھا کہ وہ انتقام کی منصوبہ بندی کیلئے پہلے اس جھگڑے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جان نوریو کی والدہ اور سوتیلے والد بروکلین میں رہتے تھے۔ انہی دنوں اس کی ماں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ جان نوریو بروکلین پہنچا تو اس کی ماں نے بڑے جذباتی اور دردمبرے لہجے میں کہا۔ ”پنیا! میں اور تمہارے پاپا اب بوڑھے ہو گئے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ ہم زندگی کے آخری دن اپنے آبائی وطن میں، اپنی سرزمین پر، اپنے گاؤں میں گزاریں اور ہمیں وہیں موت آئے کیا تم ہماری یہ خواہش پوری کر سکتے ہو؟“

جان نوریو یو جرم پشاور بد معاش سہی لیکن والدین کیلئے وہ ہر ممکن حد تک سعادت مند تھا۔ اس نے نورابائی بھری اور اپنے والدین کو سسلی لے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کام میں چند قانونی دشواریاں حائل تھیں لیکن اس نے رفتہ رفتہ سب کا حل نکال لیا۔ ان چکروں میں ڈھائی تین ماہ لگ گئے لیکن آخر کار وہ اپنے والدین کو لے کر سسلی روانہ ہو گیا۔

اپنے گاؤں پہنچ کر جان نوریو نے اپنے والدین کو ایک ولاخیرہ کر دیا اور ان کی خدمت کیلئے کئی نوکر رکھ دیئے۔ اس کے والدین بہت خوش تھے اور اسے دعائیں دیتے تھے۔ ان کے پرانے جاننے والے اور گاؤں کے دوسرے لوگ ان کے شہادت بائٹ دیکھنے آتے اور حیران ہونے کے ساتھ ساتھ ان پر رشک بھی کرتے کہ اللہ نے انہیں کیسا سعادت مند بننا دیا تھا جس نے امریکا جا کر خوب دولت بھی کمائی تھی، وہاں بھی اپنے والدین کو عیش و آرام سے رکھا تھا اور اب ان کی خواہش پر آخری عمر میں



وہ تو بس حیرت اور رشک سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے والدین کے شہادت بائٹ دیکھتے تھے۔

جان نوریو کو خود بھی گاؤں میں ایسا دل لگا کہ وہ کئی مہینوں تک وہیں پڑا رہا، اس کا واپس جانے کوئی نہ چاہا۔

انکی عدم موجودگی میں الیکھون نے سارا کاروبار اور سارے معاملات اس سے بھی زیادہ بہتر انداز میں سنبھالے۔ ویسے بھی اب وہ جان نوریو کا فتنی فتنی کا پائرن تھا اور اسے تمام فیصلے کرنے کا بھی اختیار حاصل تھا چنانچہ اب وہ ہر قدم ذرا سی ہنگامہ پٹ کے بغیر اٹھاتا تھا اور کاروبار کو خالصتاً اپنے انداز میں چلا رہا تھا۔ درحقیقت اب وہی مالک و مختار تھا، جان نوریو پس منظر میں چلا گیا تھا، اسے بس بیٹھے بٹھائے اپنا حاصل جاتا تھا، وہ اپنی اس پوزیشن پر خوش اور مطمئن تھا۔ درحقیقت وہ کافی حد تک آرام طلب ہو گیا تھا اور اپنے آپ کو زیادہ چھٹووں میں ڈالنے سے بچائے رکھتا تھا۔ الیکھون کی طرف سے آئے اطمینان تھا کہ وہ اس کا حق اسے پہنچا رہا ہے، اس کے مفادات کی حفاظت کر رہا ہے اور کاروبار کو بہتر انداز میں چلا رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ تمام سلسلے اسی طرح خوش اسلوبی سے چلتے رہیں گے اور وہ اپنے دھندوں کی پریشانیوں میں الجھے بغیر زندگی سے لطف اندوز ہوتا رہے گا۔

انکی عدم موجودگی میں الیکھون نے سب سے اہم فیصلہ تو یہی کیا کہ اپنا ہیڈ کوارٹر فکا گو سے سیمرو منتقل کرنے کے منصوبے پر سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ فکا گو میں بھی دھندے چلے تو رہے تھے لیکن انہیں جاری رکھنے میں خاصی دشواریاں پیش آنے لگی تھیں۔ الیکھون نے یہ امکان ذہن میں رکھا تھا کہ فکا گو میں ان پر مزید براہ وقت بھی آسکتا ہے اس نے اس کیلئے پیش بندی کر لی تھی۔ سیمرو میں انہیں کسی خاص کاروباری رقابت کا سامنا کرنے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔

وہاں جوئے کے دھندے پر صرف ایک آدی چھایا ہوا تھا۔ اس کا نام وگل تھا، اس نے بھی جوا خانے وغیرہ نہیں کھولے ہوئے تھے، وہ صرف سلاٹ مشینوں کے ذریعے جوا کھلاتا تھا، ان مشینوں میں سکہ ڈالا جاتا تھا تو وہ آن ہو جاتی تھیں۔ مختلف مشینوں میں مختلف طریقوں سے جوا کھلیا جاتا تھا۔

وگل نے یہ مشینیں شہر کے شراب خانوں خاص خاص دکانوں اور سیلونز وغیرہ میں لگا رکھی تھیں، آمدنی کا ساتھ فیصد وہ خود لیتا تھا اور چالیس فیصد اس جگہ کے مالک کو دیتا تھا جہاں مشین نصب ہوتی تھی۔ اس کا دھندہ بڑے ہموار انداز میں چل رہا تھا اور اسے اس سے بڑی اچھی آمدنی ہو رہی تھی۔

ایک طرح سے سیمرو میں ناجائز دھندہ کرنے والا وہی سب سے بڑا آدمی تھا۔ وہاں کی پولیس بلکہ پوری انتظامیہ ہی انکی جیب میں تھی۔ اسے ایڈورڈ نامی ایک سابق باسکر بھی مدد حاصل تھی۔ وہ اس کا خاص کارندہ تھا، جہاں بد معاشی کی ضرورت ہوتی تھی، وہاں ایڈورڈ آگے ہوتا تھا۔

وگل سے الیکھون کا کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ کم از کم الیکھون تو یہی سمجھتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وگل آدھا یورپین تھا اور وہ اطالیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ خاص طور پر وہ الیکھون کے ماضی اور حال سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اور جان نوریو فاشی کے اڈے چلاتے رہے ہیں اور ابھی تک چلا رہے ہیں۔

وگل خواہ مخواہ جوئے کی مشینوں کی کمائی کھاتا تھا لیکن اس کی کچھ اخلاقیات تھیں۔ وہ اس طرح کی کمائی کھانے والوں کو بہت ہی برا اور ناقابل برداشت سمجھتا تھا۔ شاید اس بات میں اس کی کوششوں کا بھی کچھ دخل تھا کہ سیمرو میں فاشی کا کوئی باقاعدہ اڈہ نہیں تھا اور وگل کی خواہش تھی کہ یہ صورت حال اسی طرح رہے۔

الیکھون نے سیمرو میں قدم بھانے کا فیصلہ کیا تو اس نے سب سے پہلے وہاں ایک کام شروع کر دیا جو اس کے خیال میں سب سے جلدی چل پڑتا تھا۔ اس نے جو بول خریدا تھا، وہ تو ابھی تو پھوڑ اور نئے سرے سے تزئین و آرائش کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اسی دوران اس نے ایک ایک کمرے کے اپارٹمنٹس پر مشتمل چھوٹی سی ایک بلڈنگ خریدی اور چھ بری عورتوں کو اس میں منتقل کر دیا۔ ان دنوں فکا گو میں ان کا ہر دھندہ بہت خفشار تھا۔

ان کے فکا گو والے ٹائٹ کلب ”فور ڈیوسز“ میں لال بالوں والی ایک ”میڈم“ بیٹھا کرتی تھی۔ وہ فاشی کے اڈے چلانے میں بڑی ماہر تھی۔ الیکھون نے سیمرو میں نیا اڈہ چلانے کیلئے اسے ہی بھیجا لیکن بھاری اس میڈم کو وہاں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ہی نہیں ملا، پولیس نے پہلی ہی رات اس اڈے کو بند کر دیا۔

الیکھون نے پولیس کی اس مستعدی پر حیران رہ گیا تاہم اس نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک مصروف چہرہ پر ایک دکان کھلوائی۔ اس کا ارادہ اس دکان کی آڑ میں شراب کا دھندہ شروع کرنے کا تھا لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب دوسرے ہی دن پولیس نے اس بے ضرری دکان کو بھی بند کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دکان میں جو کوئی بھی موجود تھا، پولیس نے اسے بھی حراست میں لے لیا۔

الیکھون کو یہ پتہ چلا کہ اس نے ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ یہ سب کچھ وگل کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ وگل یہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ سیمرو اپنی جگہ ایک شہر ضرور تھا لیکن قانونی طور پر وہ ایک کاؤنٹی کی عملداری میں آتا تھا جس کا نام ٹنگ تھا، چنانچہ ٹنگ کاؤنٹی کا شریف ہی سیمرو کا سب سے بڑا حاکم تھا اور شریف..... الیکھون کی جیب میں تھا مگر یہ بات بے چارے وگل کو معلوم نہیں تھی۔

شریف کا نام ہوف مین تھا۔ وگل کی جوئے کی مشینوں کو بھانا شریف ہوف مین کی ذمہ داری تھی لیکن اس نے انہیں نظر انداز کر رکھا تھا۔ اس نے کسی ذاتی غرض اور لالچ کے بغیر وگل کو اس معاملے میں ڈیل دے رکھی تھی لیکن جان نوریو اور الیکھون کا وہ بہر حال ”ٹنگ خوار“ تھا۔

جب ان دونوں کی طرف سے اس پر دباؤ پڑا تو اسے حرکت میں آنا پڑا۔ اسے وگل کی جوئے کی مشینوں کو دھوڑنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ تو کسی خوف اور اندیشے کے بغیر گویا سرا عامی ہوئی تھیں۔ شریف نے وہ سب کی سب اٹھالیں یوں گویا وگل کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بند ہو گیا۔

اس ”آپریشن“ میں جو پیغام پنہاں تھا، اسے سمجھنا وگل کیلئے مشکل نہیں تھا۔ جان نوریو اور الیکھون نے گویا اس پر واضح کر دیا تھا کہ اگر وہ سیمرو میں ”کاروبار نہیں کر سکتے تو پھر کوئی بھی نہیں کر سکتا۔“

وگل نے گھٹے ٹھیکے میں دیر نہیں لگائی اور جلد ہی صلح کا جھنڈا بلند کر دیا۔ اس نے کچھ لوگوں کو کوچ میں ڈالا کہ جان نوریو اور الیکھون اس کی صلح کرائی جائے۔ جان نوریو تو چونکہ سسلی میں تھا اور اس کی غیر موجودگی میں تمام اختیارات الیکھون کے پاس ہی تھے اس لئے وگل کو اسی کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔

وہ اکیلا ہی الیکھون کے سامنے نہیں گیا۔ فکا گو کا ڈول بھی اسکے ساتھ گیا جس کے چار آدمی الیکھون نے ایک ساتھ ہی صاف کرا دیے تھے،

اسے بھی گویا پٹیل میں چکا تھا، وہ بھی صلح کا خواہشمند تھا۔

الیکھون نے انہیں ڈیل نہیں کیا اور اپنے سامنے زیادہ جھکا نے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے آسانی سے انہیں معاف کر دیا۔ اس کے خیال میں یہی کافی تھا کہ ان کا دامغ جلد کھانے پر آ گیا تھا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ وگل اور ڈول دونوں ہی الیکھون کے تقریباً ساتھی بن گئے۔ ڈول کا ایک بھائی تو باقاعدہ الیکھون کیلئے کام کرنے لگا۔

جان نوریو طویل عرصے سسلی میں ہی رہا، اس نے اپنے والدین کیلئے چہرہ لو کر رکھ لئے تھے اور خود اپنے لئے اس نے اٹلی اور سوئٹزر لینڈ کے بینکوں میں دس لاکھ ڈالر محفوظ کر دیئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس جیسے لوگوں پر براہ وقت آتے دیر نہیں لگتی۔ اس نے یہ جمع پونجی برے وقت کیلئے رکھ دی تھی۔

اس کی غیر موجودگی میں الیکھون نے سارے ”کاروبار“ نہ صرف عہدگی سے چلائے بلکہ انہیں خوب وسعت دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے اعزاز و اطوار میں بردباری آتی جا رہی تھی، اب وہ بات بات پر اشتعال میں نہیں آتا تھا۔ اس نے مخالف گروہوں سے بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھنا چھوڑ دیا تھا، جب کوئی بہت ہی زیادہ جان کو آجاتا تھا تو پھر وہ اسے سبق سکھانے کا بندوبست کرتا تھا تاہم کبھی کبھی چھوٹی موٹی باتوں پر بھی اس کا رواجی غصہ ابل پڑتا تھا۔

اس زمانے کے بیشتر بد معاشوں کی طرح الیکھون بھی پیسٹی سے گھبراہٹا تھا۔ اسے بالکل شوق نہیں تھا کہ اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں۔ اس ضمن میں بد معاشوں کا ایک نظریہ یہ بھی ہوتا تھا کہ مختلف موقعوں پر مختلف زاویوں سے کھینچی ہوئی تصویریں انسان کی شناخت کا بڑا ذریعہ بن سکتی ہیں اور ان جیسے لوگوں کی شناخت جتنی بھی اہم اور غیر واضح رہے، اتنا ہی بہتر ہے۔

کافی عرصے تک الیکھون نے یہ بھی یہی نظریہ اپنائے رکھا۔ اگر کبھی کسی اخبار کا فوٹو گرافر کسی ایسی جگہ اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا جہاں دوسرے لوگ بھی موجود ہوتے تھے تو وہ اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیتا تھا اور اگر کوئی فوٹو گرافر اکیلے میں اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا تھا تو اسے وہ وہاں تھپتھپ کر رہتا تھا۔

ایک فوٹو گرافر نے بہت بعد میں 1923ء کے زمانے کا ایک واقعہ اپنے ذہن میں تازہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”کسی مسئلے پر پوچھ گچھ کیلئے کسی طرح پولیس نے الیکھون کو ہیڈ کوارٹر بلایا تھا جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ الیکھون کئی فوٹو گرافرز کو تھپتھپوں سے مار رہا تھا اور پولیس ایک طرف کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ پتہ چلا کہ فوٹو گرافرز نے کچھ اس حالت میں اس کی تصویریں کھینچنے کی کوشش کی تھی جس سے ظاہر ہوتا جیسے وہ پولیس کی حراست میں ہے اور اس کیلئے انہوں نے کسی سے پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی بس اس پر الیکھون تو آپے سے باہر ہو گیا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ذرا دیر سے وہاں پہنچا تھا اس لئے مار کھانے والوں میں شامل ہونے سے بچ گیا۔ پولیس والے چونکہ دل ہی دل میں تو پریس فوٹو گرافرز سے ناخوش ہی رہتے ہیں اس لئے وہ بھی مداخلت کی زحمت نہیں کر رہے تھے بلکہ شاید وہ اندر ہی اندر خوش ہو رہے ہوں۔ درحقیقت وہ اگر کبھی کبھار الیکھون جیسے لوگوں کو رسی کی پوچھ گچھ کیلئے بلا بھی لیتے تھے تو یہ بھی پریس ہی کے دباؤ کا نتیجہ ہوتا تھا ورنہ ان میں سے اکثر تو الیکھون جیسے لوگوں کے ہاتھوں کیے ہوئے ہوتے تھے۔“

بعد میں تو خیر الیکھون اپنی نمایاں شخصیت بن گیا کہ شناخت وغیرہ کے مسائل اس کیلئے بے معنی ہو گئے۔ اسی زمانے میں ایک روز نامے ”ہیرارڈی“ کے ایڈیٹر نے اسے سمجھایا۔ ”تم صحافیوں اور پریس فوٹو گرافرز کے ساتھ بدسلوکی نہ کیا کرو، اب تم اس مقام پر ہو کہ تصویریں اور خبریں چھپنے سے تمہیں نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی پہنچے گا۔ یہ درست ہے کہ تمہاری تصویر یا خبر کسی اچھے حوالے سے نہیں چھپے گی لیکن رسوائی بھی درحقیقت ایک طرح کی شہرت ہی ہوتی ہے اور شہرت کی بہر حال اپنی ایک طاقت ہے۔ پریس میں جتنا زیادہ تمہارا ذکر آئے گا، تمہاری طاقت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔“

لگتا ہے یہ بات الیکھون کی کچھ میں آگئی کیونکہ اس کے بعد اس نے فوٹو گرافرز سے منہ چھپانا اور ان کے ساتھ مار پیٹ کرنا ترک کر دیا بلکہ پھر تو اس کا معاملہ بالکل ہی الٹ ہو گیا۔ پریس کے ساتھ اس کے دیکھنا تمام بد معاشوں کی نسبت زیادہ خوشگوار تعلقات استوار ہو گئے، پریس والوں کیلئے اس سے ملنا سب سے زیادہ آسان ہو گیا، وہ جب چاہتے اس سے رابطہ کر سکتے تھے، وہ انہیں اہمیت دینے لگا۔ یوں رفتہ رفتہ پریس والوں کے دل میں بھی اس کیلئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا اور وہ کسی حد تک اسے پسند بھی کرنے لگے۔ ویسے کی اس تہذیب نے بھی اس کی شہرت کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

تاہم ان تہذیبوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ الیکھون کچھ زیادہ نرم دل شائستہ یا مذہب ہو گیا تھا۔ جوں جوں وہ ظاہری طور پر مضبوط ہو رہا تھا اور اس کی دولت میں اضافہ ہو رہا تھا، اسکے اندر کا بد معاش بھی بدتر بن جاتا اور ہوا تھا۔ اس کے انداز و اطوار میں زیادہ بے خوفی آ رہی تھی، اس کا ایک شوٹ ”فاریٹ ویو“ والے واقعے سے بھی ملتا ہے۔

”فاریٹ ویو“ دراصل فکا گو اور سیمرو کے درمیان نئی آبادی گئی ایک ٹاؤن شپ یا ہاؤسنگ اسکیم تھی۔ اس کا پس منظر کچھ یوں تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں نمایاں خدمات انجام دینے والے ایک ریٹائرڈ فوجی آفیسر کو بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ فکا گو کے مقامات میں دیہی طرز کی ایک ایسی بستی بسائی جائے جہاں مکان، اپارٹمنٹ یا دیگر گھمبیں سابق فوجیوں کو ترجیحی بنیادوں پر دی جائیں تاکہ وہ کھانا آبادی سے ذرا ملتے کر پرسکون اور پر فضا مقام پر اپنی بیوی، بچوں یا پوتے، پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ رہ سکیں۔ سابق فوجیوں کو دینے کے بعد جو گھمبیں اور پلاٹ وغیرہ بیچ جائیں، وہ عام شہریوں کو دینے جائیں۔

فکا گو سے ڈیڑھ دو میل دور اس کی اپنی بھی چند ایکڑ زمین تھی جس پر بیکار سے فارم بنے ہوئے تھے جن سے کوئی خاص آمدنی نہیں تھی۔ اس نے پہلے پہل اپنی اسی زمین سے ہاؤسنگ اسکیم کا آغاز کرنے کیلئے دوڑ دوڑ شروع کر دی، بعد میں اس کے ساتھ کچھ اور سابق فوجی بھی شامل ہو گئے۔

کافی تیزی سے ان کے کام ہوتے چلے گئے اور ”فاریٹ ویو“ کے نام سے ایک نئی نوآبادی ہاؤسنگ اسکیم آباد ہوئی چلی گئی۔ جس سابق فوجی کے خواب کی یہ تعبیر تھی، اس کا نام نوکڑ تھا، اب وہی اس کا کرتا دھرتا تھا، وہ وہی آباد ہونے والی اس گاؤں کا اسکیم کا پولیس مجسٹریٹ بن گیا۔

اس کا بھائی اس اسکیم کا پریذیڈنٹ بن گیا۔ وہاں کے پولیس چیف کے طور پر انہوں نے ڈن نامی ایک شخص کا تقرر کر دیا۔ ڈن کا بھی اپنے بارے میں یہی کہنا تھا کہ وہ سابق فوجی ہے لیکن اس کے بارے میں یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ درحقیقت وہ کوئی سزا یافتہ سابق قیدی تھا جس کی کچھ سزا ایک سابق گورنر نے معاف کر دی تھی۔

جلدی ڈن نے نوکڑ کو بتایا کہ رالف اور الیکھون نامی دو بھائیوں نے تجویز دی ہے کہ وہ ”فاریٹ ویو“ میں ایک ہوٹل تعمیر کرنا چاہتے ہیں، انہیں اس کی اجازت دی جائے۔ نوکڑ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ ظاہر ہے ایک اچھے ہوٹل کی تعمیر سے اس کی نوآبادی کو کچھ اور ترقی ملتی۔ بعد میں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے نوکڑ نے بتایا۔ ”مجھے پتہ نہیں تھا کہ رالف اور الیکھون اس قسم کے لوگ ہیں۔ میں نے خوشی خوشی متعلقہ لوگوں کو ہدایت کر دی کہ ہوٹل کا منصوبہ لے کر آنے والوں کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جائیں لیکن مزید چند دن بعد جب میرے پاس رالف اور الیکھون کے بارے میں معلومات جمع ہوئیں تو میرے ہوش اڑ گئے۔“

(جاری ہے)



نوڈک نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب مجھے ذرا تفصیل سے معلوم ہوا کہ رالف اور الکھن کس قسم کے آدمی ہیں تو یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ وہ ہماری بستی ہوئی اس نئی بستی میں ہوئی کیوں تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

پورا طور ہی اس نے اس مقصد کے لئے مخصوص کر لیا۔ وہاں تمام ضروری خانگی انتظامات کئے گئے۔ کڑکیوں میں موٹی اور مضبوط سلاخیں لگائی گئیں۔ ان کے اوپر مونے آہنی شتر بھی لگائے گئے جو بہ وقت ضرورت کھولے اور بند کئے جاسکتے تھے۔



میں چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا کہ اگر وہ یہاں ہوئی تعمیر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اس کا مصروف کیا ہوگا اور اسکی وجہ سے یہاں کیا کچھ ہوگا۔ چنانچہ میں نے ذہن سے کہا کہ وہ ان بد معاشوں اور ان کے ساتھیوں کو فارسٹ دیو سے نکال باہر کرے۔

نوڈک کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ رالف اور الکھن کس قسم کے آدمی ہیں لیکن اس نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی کہ ان کی مخالفت کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

دوسرے روز ایک شخص لات مار کر اسے آفس کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں گویا آگ برساری تھیں۔

”تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟“ انہی نے پھینک مارنے کے سے انداز میں پوچھا۔ وہ نوڈک کی میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر خطرناک انداز میں اس کی طرف جھکا ہوا تھا۔

”نہیں.....“ نوڈک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں تمہیں جاننے سے پہلے یہ جاننا چاہوں گا کہ تم ایسے بے ہودہ انداز میں میرے آفس میں کیوں داخل ہوئے ہو؟“

اس مضبوط اور دراز قد آدمی نے آدھو عمر نوڈک کو گریبان سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کی سر سے اٹھالیا اور تقریباً اس کی ناک سے ناک ملا کر بدستور پھینکا مارنے کے سے انداز میں بولا۔ ”میرا نام رالف ہے۔

میں الکھن کا بھائی ہوں۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ تم نے ہمیں یہاں ہوئی کی تعمیر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ہم یہاں زمین بھی خرید چکے ہیں۔ نقشہ بھی منظور کرا چکے ہیں۔ یعنی ایک موٹی رقم انویسٹ کر چکے ہیں؟ تمہارا خیال ہے ہم یہ رقم ڈوبنے دیں گے؟ تم ہوتے کون ہو تمہیں روکنے والے؟“

نوڈک کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد رالف نے اسے واپس کرسی پر بیٹھنے ہوئے کہا۔ ”ہوئی یہاں ضرور تعمیر ہوگا۔ تم ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں تمہیں علاقے کے سب سے بڑے گٹر میں پھینک دوں گا۔“

رالف کی یہ بے خوفی اور غنڈہ گردی دیکھ کر بھی نوڈک ان کی طاقت کے بارے میں اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔ اسے سخت غصہ آیا اور اس نے متعلقہ لوگوں کو ہوئی کے لئے زمین کی فروخت اور نقشہ منسوخ کرنے کا حکم دیا۔ ابھی شاید کوئی اس کے حکم پر عملدرآمد کے لئے قلم بھی اٹھا نہیں پایا تھا کہ دوسرے روز صبح کے چار بجے، یعنی منہ اندھیرے دو بجاری بھر تک آدھی نوڈک کے گھر میں گیس آئے۔

وہ اسے بستر سے نکال کر گھینٹے ہوئے ناؤن ہال لے گئے جو قریب ہی واقع تھا۔ وہاں سات مسخ آدمی اور موجود تھے۔ انہوں نے نوڈک کو دیکھتے ہی بندھنوں کے دستوں سے مارنا شروع کر دیا۔ کچھ نہیں اس کے سر پر بھی گئیں۔ وہ گھٹنوں کے مل فرش پر گر گیا اور گڑ گڑانے لگا۔ وہ ان بے رحم لوگوں سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

بعد میں اس نے کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے اعتراف کیا۔ ”مجھے یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں کہ میں بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ لوگ مجھے جان سے مار دیں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں دل میں بھی دعا کر رہا تھا کہ میری جان بچ جائے اور میں نے ان خبیثوں سے بھی زندگی کی بھیک مانگی۔“

بد معاشوں نے اس کی جاں بخشی اس شرط پر کی تھی کہ وہ فوری طور پر اس بستی سے نکل جائے جس کی بنیاد اس نے خود رکھی تھی۔ نوڈک نے یہ شرط مان لی تھی۔ یہ بھی ایک ستم ظریفی تھی کہ جس نے بستی بسائی تھی اسے خود اس بستی سے اجڑنا پڑا۔

الکھن کے گروہ نے ایک ایک کر کے تقریباً جیس آدمیوں کو محزیہ وہاں سے نکال باہر کیا جن کے بارے میں انہیں اندیشہ تھا کہ وہ ان کے راستے میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ اسکے بعد انہوں نے وہاں مضافاتی علاقوں کا سب سے بڑا ہوٹل ”میل ان“ تعمیر کرایا۔

یہ ہوٹل کیا، بس ہر طرح کے ناجائز دھندوں کا بہت بڑا اڈہ تھا۔ فاریسٹ ویو رفته رفته عام لوگوں میں ”الکھن ول“ یعنی الکھن کی مضافاتی بستی کے نام سے جانا جانے لگا۔ یہ نام اسے وہاں کے اخبار ”شعبون“ نے دیا تھا۔ بعد میں دوسرے اخبار بھی اس ناؤن کے لئے یہی نام استعمال کرنے لگے۔

اخبارات نے یہ نام طرز پر رکھا تھا۔ ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ فاریسٹ ویو میں تو بس الکھن کی بادشاہت ہے۔ الکھن اس خطر کا برا نہیں مناتا تھا۔ اس نے واقعی وہاں اپنی بادشاہت قائم کر لی تھی اور یہ بادشاہت اس نے لوگوں کو دہشت زدہ کر کے قائم کی تھی۔ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے مگر الکھن کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اس احساس سے لطف اندوز ہوتا تھا کہ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے لیکن اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔

اس منزل پر آنے والوں کو پہلے پچیس فٹ لمبی ایک راہداری سے گزرتا پڑتا تھا جس میں یہ ظاہر مختلف کاموں کے لئے کچھ لوگ میز کرسیاں وغیرہ لگا کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ کوئی مہمانوں سے ہیٹ وغیرہ لے کر سنبھالتا تھا۔ کوئی سگاریوں کے ڈبے وغیرہ ایک اسٹینڈ پر سجائے بیٹھا تھا لیکن درحقیقت یہ سب الکھن کے تعینات کئے ہوئے گاؤ تھے جو ہر آنے والے ملاقاتی اور مہمان پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پچیس فٹ لمبی اس راہداری سے گزرتا لوگ گویا مکمل ایکسرے ہو جاتا تھا۔

1924ء میں یہ ہوئی نئے سرے سے آباد ہوا اور اسکے بعد جلد ہی آس پاس الکھن کے دوسرے اڈے کھلنے لگے۔ سب سے پہلے ہوئی کے قریب ہی جوئے کا ایک اڈہ کھلا۔ بظاہر یہ سگاریوں کی دکان تھی اور ”سموک شاپ“ کہلاتی تھی۔

جوئے کا دوسرا اڈہ ”سب دے“ کے نام سے اور تیسرا ”ریڈ یو“ کے نام سے کھلا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے اس ایک شاہراہ پر ہی الکھن کے، جوئے کے چھ اڈے قائم ہو گئے۔ یہ ظاہر ان سب میں کوئی اور کاروبار ہوتا تھا۔ دکھاوے کے لئے پولیس کبھی بھگدان میں سے کسی ایک اڈے پر چھاپہ مار دیتی تھی۔ آخر اسے بھی عوام اور پولیس کے سامنے اپنی کچھ کارکردگی دکھانی ہوتی تھی۔ دو چار دن بعد وہ اڈہ دوبارہ کھل جاتا تھا۔

بندرچ ان کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔ ہر اڈے کے مالک صرف جان نور پور اور الکھن ہی نہیں تھے، بعض اڈوں کی ملکیت میں انہوں نے دوسروں کو بھی شریک کر لیا۔ ان میں سے ایک میں ان کا پانچو برٹین بھی تھا جو بھی ان کا کاروباری حریف اور دشمن ہوا کرتا تھا۔ ان کا وہ اڈہ بڑی وسعت اختیار کر گیا۔ شاید وہ شہر کا ہی نہیں، بلکہ اس وقت ملک کا بھی سب سے بڑا جوئے کا اڈہ تھا۔ اس میں بعض اوقات جوئے کی میزوں پر ایک لاکھ ڈالر بکھرے ہوتے تھے۔

خود سرکاری افسروں کا اندازہ تھا کہ جان نور پور اور الکھن ان کو ان اڈوں سے کم از کم تین لاکھ ڈالر ماہانہ آمدنی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ دوسروں کے اڈوں سے بھی پچاس فیصد آمدنی وصول کر رہے تھے۔ آمدنی کے اندازے کیلئے انہوں نے دوسروں کے اڈوں پر اپنا ایک ایک آدمی بھی تعینات کیا ہوا تھا۔

دوسروں کی آمدنی میں وہ جو حصے دار بنے ہوئے تھے تو یہ بہت خوری نہیں تھی۔ یہ درحقیقت وہ ان لوگوں کو تھکاؤ فراہم کرنے کا محاذ خد لے رہے تھے۔ جان نور پور اور الکھن ہی درحقیقت انہیں پولیس، دوسرے حکموں اور ”غیر منصفانہ“ بد معاشوں سے بچاتے تھے کیونکہ سسر و شہر کی انتظامیہ ان کی جیب میں تھی۔

جب کسی شہر میں کرپشن اور بدعنوانی حد سے زیادہ ہونے لگتی ہے تو پھر اصلاح کا شور بھی بلند ہوتا ہے۔ پہلے دہلی آوازیں اٹھتی ہیں کہ اصلاح احوال ہونی چاہئے۔ پھر غلط سائنہ ہوتا ہے۔ انتظامیہ ہی کے موقع پر عوام کو یہ امید نظر آتی ہے کہ اگر وہ اچھی شہرت کے حامل اور دیانتدار لوگوں کو مختلف عہدوں کیلئے منتخب کریں تو شاید انہیں جرائم اور خوف و ہراس کی فضا سے نجات مل جائے۔

چنانچہ کاؤنٹی کے مختلف عہدوں کے لئے جب 1924ء کے الیکشن ہونے لگے تو چند دیانتدار اور پاکردار لوگ بھی ہمت کر کے میدان میں اترے۔ لوگ انہیں سپرد کر رہے تھے۔ الکھن کی زمانہ شناس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ اگر وہ لوگ انتظامیہ میں کامیاب ہو کر آگے تو اس کے دھندے ٹھپ ہو جائیں گے۔

یہ صرف اسی کا نہیں بلکہ اس جیسے دوسرے لوگوں کی بقاء کا بھی مسئلہ تھا لیکن صرف الکھن نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو ان کا تختہ الٹ جائے گا۔ اس نے یہ بات برٹین اور ڈول جیسے بد معاشوں کو بھی سمجھائی۔ وہ اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیلئے فوراً آمیار ہو گئے۔ ویسے بھی اب وہ اس کے پانچو تھے۔

چنانچہ الیکشن والے دن صورت حال یہ تھی کہ مسلح آدمیوں سے بھری ہوئی بارہ بڑی گاڑیاں گلی کوچوں میں گشت کر رہی تھیں۔ زیادہ تر ڈروژکو ڈرا دھماکا کر بھگا دیا گیا تھا۔ باقی کو پکڑ کر اندر لے جا کر ان سے اپنے من پسند امیدواروں کے ناموں پر مہریں لگوائی جا رہی تھیں۔ میز کے عہدے کیلئے کھڑے ہوئے والا اصلاح پسند امیدوار خواہو چکا تھا اور اس کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

جب الیکشن ختم ہو گیا تو وہ بے چارہ ہانپتا کا پتہ واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ مسلح افراد اس کی آنکھوں پر پتلی باندھ کر نہ جانے کہاں لے گئے تھے۔ وہاں اسے بند کر دیا گیا اور پھر اسی طرح نہ جانے کون لوگ شام کو اسے واپس چھوڑ گئے..... بلکہ چھوڑ گیا، ایک سڑک پر پھینک گئے۔

اس طرح وہی لوگ منتخب ہو گئے جو پہلے سے ان عہدوں پر موجود تھے اور الکھن ان جیسے لوگوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ تاہم انہیں نہیں تھا کہ الیکشن کے دوران ہونے والی دھاندلی کو روکنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ شہریوں کی طرف سے شکایات کا ڈسٹیکٹنگ بیجنس۔ بیج نے شکا کوکے میزڈیور سے مشورہ کیا۔ قانونی طور پر میزڈیور، سسر وکے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے انجینئر بیجنس کے طور پر کچھ پولیس والے سادہ لباس اور سادہ گاڑیوں میں اس صورتحال کو کنٹرول کرنے کے لئے بھیجے کیونکہ مقامی پولیس نے اگر مسلح افراد کو روکنے کی کوشش کی تھی تو انہوں نے پولیس والوں کو بھی مار مار کر لٹا دیا تھا۔

سادہ گاڑیوں میں آنے والے پولیس والوں کا سامنا مسلح افراد کی ایک ٹولی سے ہوا جس کی قیادت الکھن کا بڑا بھائی فریک کر رہا تھا۔ ان میں تصادم ہو گیا اور فریک مارا گیا۔ بعد میں ہونے والی تحقیقات میں پولیس نے دعویٰ کیا کہ فریک نے فائر کرنے میں پہل کی تھی۔ اس نے فریک کی گن بھی پیش کی جس میں تین گولیاں کم تھیں۔

اب یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ گولیاں خود سادہ لباس والے پولیس کے آدمیوں نے کم کی تھیں یا بیج نے فریک نے گولی چلانے میں پہل کی تھی۔ عین ممکن ہے یہ جعلی ”پولیس مقابلہ“ رہا ہو اور یہ امکان بھی تھا کہ فریک نے انجینیئر بیجنس کے آدمیوں کو سادہ لباس اور سادہ گاڑی میں دیکھ کر، دشمن سمجھ کر بیج گولی چلانے میں پہل کر دی ہو۔

جب یہ واقعہ رونما ہوا، شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ جب فریک سینے پر گولی کھا کر گرفتاری لوگ قاتل کر کے ہوتے بھاگ کھڑے ہوئے

اور شام کے منجھے اندھیرے میں ادھر ادھر غائب ہو گئے۔ ایک افواہ یہ بھی سننے میں آئی کہ ان لوگوں میں خود الکھن کا بھی شامل تھا تاہم بعد میں اس افواہ کی تردید ہو گئی۔

اطالویوں کے رواج کے مطابق الکھن نے فریک کی تدفین تک شیونیں بنایا۔ فریک کی قبر پر تیس ہزار ڈالر کے پھول ڈالے گئے جو برٹین کی پھولوں کی دکان سے آئے تھے۔ برٹین یوں تو دوسرے دھندوں میں الکھن کا پانچو تھا اور گروہ میں شامل تھا لیکن اس نے ایک شریفانہ کاروبار بھی شروع کر لیا تھا یعنی پھولوں کی دکان کھول لی تھی۔ عام لوگ تو اس دکان سے پھول خریدتے ہی ہوں گے لیکن گروہ کے تمام لوگوں کیلئے بھی وہ پھولوں کا گویا ”ایڈیشنل سپلائی“ تھا۔

الکھن نے فریک کیلئے تابوت بھی نہایت خوبصورت اور قیمتی بنوایا تھا۔ فریک کی نگاہیں موت کے بعد تو یہی طریقے رہ گئے تھے جن سے وہ اپنی والدہناہت محبت کا اظہار کر سکتا تھا۔ اس کا گھر تعزیت کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ فریک کی تدفین کے موقع پر سسر وکے گھٹنے کے لئے تمام سیلون اور شراب خانے بند رہے۔ سسر وکے شریوں کی زندگی کے شاید یہ بدترین ترین گھٹنے تھے جب وہ شراب سے محروم رہے۔

جلدی ہی اس المانک واقعے کا رزم بھر گیا اور زندگی معمول پر آ گئی۔ سسر وکے میز کا نام کلین تھا جو دوسری مرتبہ منتخب ہوا تھا۔ وہ الکھن کا زرخیز آدمی تھا اور دوسری مرتبہ اس کا انتخاب خاص طور پر صرف الکھن کے گروہ کی وجہ سے ہی ممکن ہوا تھا..... بلکہ دیکھا جائے تو اسے منتخب کرانے کے لئے الکھن نے اپنے گئے بھائی کی قربانی دی تھی۔

مگر کچھ عرصے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ کلین پر بھی اصلاح کا ”دورہ“ پڑا۔ نہ جانے اس کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا یا اس پر کسی طرف سے دباؤ پڑا تھا یا پھر کسی اور وجہ سے اس کے خیالات میں تبدیلی آ گئی تھی۔ بہر حال، اس نے ارادہ کیا کہ شہر کو بد معاشوں کے گروہوں سے پاک کیا جائے۔ وہ بھول گیا تھا کہ شہر میں بد معاشوں کے گروہوں کو مضبوط کرنے والوں میں وہ خود بھی شامل تھا۔ اسے شاید یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جو ایک بار بد معاشوں اور زیر زمین دنیا کے لوگوں کے ہاتھ بک جائے، اس کے پاس واپسی کا راستہ نہیں رہتا۔

کلین نے الکھن کے احکام ماننا اور اس کے آدمیوں کو رعایتیں دینا ترک کر دیا۔ اسے شاید صحیح طور پر یہ اندازہ بھی نہیں رہا تھا کہ اب الکھن کتنا طاقتور ہو چکا ہے۔ الکھن نے کچھ دن تو اس کے طور طریقوں میں تبدیلی کا یہ قماش دیکھا پھر ایک روز وہ سنی ہال جا پہنچا۔ اس نے کلین کو باہر بلا لیا۔

کلین باہر آیا تو ایک پولیس مین اسکے ساتھ تھا۔ الکھن نے میز چوں پر اس کا منتظر تھا۔ وہ قدم دوڑا اس کی گاڑی کھڑی تھی جس میں چند مسخ افراد موجود تھے مگر انہوں نے اترنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ تاہم وہ ایک نلک میز چوں ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کلین جو نبی الکھن کے قریب آیا، الکھن نے اس کے چہرے پر تعجبوں کی بارش کر دی۔ الکھن کا چہرہ غصے سے لال سمجھو کا ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں قہر برساری تھیں۔ کلین میز چوں پر گر پڑا۔ وہ اپنے ساتھ جس پولیس مین کو قاتلاً اپنی حفاظت کے خیال سے لایا تھا، وہ دم دبا کر ایک طرف کوہ گیا۔

الکھن آخر میں کلین کو ایک شوکر رسید کر کے اور چند گولیوں سے نواز کر رخصت ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ شہر کے میز کو اس کے اپنے دفتر کے سامنے، ایک بارون شاہراہ کے کنارے، تعجب مار مار کر میز چوں پر گر دیا گیا تھا۔ جلد ہی اس سلسلے میں کا کارروائی کیلئے سنی کونسل کی میٹنگ بلائی گئی۔

ابھی سنی کونسل کا اجلاس شروع ہی ہوا تھا کہ ہال میں دس بارہ مسلح افراد گھس آئے۔ وہ کچھ اس طرح دھناتے ہوئے اور چہرے پر خوف کا تاثرات لئے ہوئے اندر آئے تھے کہ سنی کونسل کے ارکان کی میٹنگ کو بھول کر جائیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ایک رکن مسلح آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ اسے کھینچے ہوئے باہر لے آئے اور پشتوں کے دستوں سے مار مار کر بولہبان کر دیا۔

اس واقعے پر بھی کوئی الکھن ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اس کا حوصلہ اور بے خوفی بڑھ گئی۔ ایک اخبار نویس سے اسکے کافی حد تک دوستانہ تعلقات تھے۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے الکھن نے کہا۔ ”جن لوگوں کو میں خرید چکا ہوں، انہیں میں اتنی آزادی نہیں دے سکتا کہ وہ میرے خلاف ہی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ابھی تو میں نے انہیں ہلکا سا سبق سکھایا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ انہیں زیادہ سبق سکھانے کے لئے مجھے کسی ایک آدھ بڑے انتظامی عہدے دار کو قتل کرانا پڑے گا۔ تب یہ لوگ سیدھے ہوں گے۔“

تاہم کلین اس سے پہلے ہی ”سیدھا“ ہو گیا۔ اس نے الکھن کی طاقت دیکھ لی تو پہلے والی روش پر لوٹ آیا۔ جب الکھن نے اسے پہلے سے بھی زیادہ نوازنا شروع کر دیا۔ اس نے ہر شے میں اس کی رشوت اتنی بڑھادی کہ اگر وہ اپنی خفیہ دولت ظاہر کر دیتا تو وفاقی حکومت کا ٹکس وصول کرنے والا حکمہ پکڑا جاتا۔ اس کا شمار بلاشبہ شہر کے چیدہ چیدہ دولت مندوں میں ہو سکتا تھا۔ یہی حال پولیس چیف اور شہر کے دوسرے بڑے عہدیداروں کا تھا۔

ناؤن کونسل اور سنی کونسل بھی سیدھی ہو چکی تھی۔ جواباً الکھن نے بھی اپنے طور طریقوں میں کچھ تبدیلی کی تاکہ سنی کونسل کے ارکان اور دوسرے عہدیدار زیادہ بدنام نہ ہوں اور ان پر زیادہ تنقید نہ ہو۔ الکھن نے فحاشی کے اڈوں کو مزید ایسے علاقوں میں پھیلانے کا پروگرام ترک کر دیا جو ابھی تک ان سے بچے ہوئے تھے۔

اس نے کوشش کی کہ جوئے کے اڈے بھی زیادہ تر ایسے علاقوں تک ہی محدود رہیں جو پہلے ہی بدنام ہو چکے تھے۔ اس نے گویا انتظامیہ پر رحم کھاتے ہوئے کچھ علاقوں کو شریفانہ ہی رہنے دیا اور ان کی شہرت کو داغدار ہونے سے بچانے میں انتظامیہ کی مدد کی۔

اس نے گلی کوچوں میں ہونے والے عوامی جرائم کی سطح بھی رکھنے میں بھی انتظامیہ کی مدد کی۔ اس کے اپنے آدمی ویسے بھی اسٹریٹ کرانچر میں کم ہی ملوث ہوتے تھے۔ ان میں بدنامی اور خطرات زیادہ ہوتے تھے۔ مالی فائدہ کم ہی ہوتا تھا۔ الکھن اور اسکے گروہ کا مقصد تو جرائم کو اونچے درجے کے کاروباروں کی طرح منظم کرنا تھا۔

انہوں نے اپنی زیادہ توجہ ناجائز شراب کے دھندے کو پھیلانے پر ہی مرکوز کر رکھی تھی۔ الکھن اور جان نور پور کے پاس اسی سے دولت کے انبار جمع ہوتے جا رہے تھے۔ دیگر اڈے پہلے ہی سے چل رہے تھے، ان کی کمائی اس کے علاوہ تھی۔

اسٹریٹ کرانچر کے اعداد و شمار کم رکھنے کا پولیس نے ایک طریقہ یہ بھی ایجاد کر رکھا تھا کہ وہ تمام جرائم کی رپورٹ سامنے آنے نہیں دیتے تھے۔ وہ بہت سے جرائم کا باقاعدہ ایف آئی آر ہی درج نہیں کرتے تھے بلکہ پہلے بالائی ہالا انہیں نمٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ ان معاملات میں بد معاشوں کی مدد بھی لیتے تھے۔ یہ بد معاش الکھن یا کسی اور گروہ کے بھی ہو سکتے تھے۔

اس سحائے میں یادداشت کے لئے پولیس والے سادہ کاغذوں پر ہی اندراجات کر لیتے تھے جو ان کے اپنے پاس ہی رہتے تھے۔ انہیں ایک طرح کی ”کچی ایف آئی آر“ کہا جاسکتا تھا۔ اس طریقہ کار کی وجہ سے ریکارڈ کی حد تک جرائم کم ہی نظر آتے تھے۔ یعنی ریاست الی ٹوانے کے پانچویں بڑے شہر میں عالم یہ تھا کہ پولیس فورس تین ششوں میں کام کرتی تھی اور ہر شفت میں کل سترہ پولیس والے ہوتے تھے۔ ریکارڈ کی حد تک شہر میں ایک مینیج میں ہزنی کی طرف تین اور لقب زنی یا چوری کی سات آٹھ وارداتیں ہوتی تھیں۔

الکھن نے اب اپنا ہیڈ کوارٹر بھی اسی ہوئی کی ایک منزل پر بنالیا۔ وہ





پولیس کی مدد کر رہا تھا۔ چنانچہ کلین بڑے فخر سے دعویٰ کرنے لگا تھا کہ اس کے شہر کو امریکا کے پراس تین شہروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ خود الکھون پر بھی اگر اس کے مخصوص غیظ و غضب کا دورہ نہیں پڑا ہوتا تھا تو وہ مسئلے کو مار دھاڑ یا خون خرابے سے حل کرنے کے بجائے پیسہ خرچ کر کے اصول کو بایا نہ طور طریقوں سے نشانے کی کوشش کرتا تھا۔ خاص طور پر اخبار والوں کے معاملات میں وہ سختی نہیں برتتا تھا اور اپنے بیسٹ بک فیسے کو قاپوس رکھتا تھا بلکہ اگر اخبار نویسوں کے معاملے میں اس کا کوئی آدمی سختی یا تشدد کر چکا ہوتا تھا تو وہ اسے بھی ڈانٹ پلاتا تھا۔ اس کی ایک مثال رابرٹ جان والا واقعہ تھا۔

رابرٹ جان نے 1922ء میں سیرو سے ایک اخبار ”فریون“ نکالا تھا۔ اس نے شروع سے ہی شہر کی کرپٹ انتظامیہ اور الکھون کو بدف بنایا تھا۔ وہ اپنے اخبار کے آغاز سے ہی ان کے خلاف لکھ رہا تھا۔ سرکاری افسروں کے بارے میں اندر کی خبریں نکال کر لاتا تھا۔ کس نے کون سا ٹھیکہ دینے کے سلسلے میں کتنی رشوت لی۔ کس نے کس بدقماش اور بدعاش کو کون سی رعایت دینے کے عوض کتنی رقم وصول کی۔

وہ فاشی کے اڈوں کے بارے میں بھی لکھتا تھا کہ کس اڈے کے پیچھے الکھون کا ہاتھ ہے اور کس کے پیچھے اس کے پارٹنر جان نور یو یا کسی دوسرے بدعاش کا۔ ہاتھیں بچ ہوتی تھیں اور جان رابرٹ ہر بات خصوصاً حوالے کے ساتھ لکھتا تھا۔

ظاہر ہے ایسے اخبار نویس اور ایسے اخبار کرپٹ لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتے ہیں خصوصاً جبکہ انہیں رام کرنے یا سیدھا کرنے کے سلسلے میں کوئی جھکنڈہ بھی کامیاب نہ ہوتا ہو۔ جان رابرٹ اسی قسم کے صحافیوں میں سے تھا جو اپنی جہن کے بکے اور سخت اصول پرست ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی جھکا سکتا ہے اور نہ خرید سکتا ہے۔ وہ کسی دھونس، دباؤ، لالچ یا دھمکی سے متاثر نہیں ہوتے اور جس راستے کو صحیح سمجھتے ہیں، زندگی کی آخری سانس تک اسی پر ثابت قدم رہتے ہیں۔

الکھون اور کلین نے پہلے تو جان رابرٹ کا معاشی طور پر گلا گھونٹنے کے لئے تمام جھکنڈے استعمال کئے۔ اس کے اخبار کے تمام سرکاری اشتہارات بند کر دیے گئے اور اس کے مقابلے میں ایک دوسرے اخبار ”لائف“ کی سرپرستی شروع کر دی گئی جو پہلے ہی ”فریون“ کا حریف تھا۔

صرف یہی نہیں، عام تاجروں اور دکانداروں کو بھی منع کر دیا گیا کہ وہ ”فریون“ کو اشتہار نہ دیں ورنہ ان کے ٹیکس کے معاملات کی نئے سرے سے چھان بین شروع کر دی جائے گی اور ان پر نئے ٹیکس عائد کر دیے جائیں گے۔ اس ہدایت کی خلاف ورزی کرنے والے دکانداروں کی دکانوں وغیرہ کے سامنے پہلے تو سرکاری طور پر ”نوپارنگ“ کے بورڈ نصب کر دیے جاتے تاکہ گاہکوں کو گڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ نہ ملے اور دکانداری متاثر ہو۔

جو کوئی اس ”ابتدائی سمیہ“ سے باز نہ آتا، اس کے خلاف مرحلہ وار انتقامی کارروائیاں آگے بڑھنے لگتیں۔ کسی کے ٹیکس کے معاملات الجھ جاتے، کسی پر جرمانے عائد ہونے لگتے۔ یہ جھکنڈے کسی بھی اخبار کی کمر توڑنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ تاہم جان رابرٹ نے اپنی ہتھ کی جنگ جاری رکھی۔

اس دوران اخبار کو خریدنے کی کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ جان رابرٹ کے اخبار کے دولاڑ میں اس کے پارٹنر بھی تھے۔ جان اور اس کے پارٹنرز سے بار بار پوچھا جاتا رہا کہ وہ اخبار کتنے میں بیچیں گے؟ انہیں بھاری منافع کی پیشکش کی جاتی رہی۔ دوسری طرف اخبار کی اشاعت کو مشکل سے مشکل تر بنانے کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ یہ دوطرفہ دباؤ تھا جس کا مقابلہ کرنا آج کے دور کے بڑے بڑے اخباروں کے لئے بھی بہت مشکل ہوتا ہے مگر جان رابرٹ اس زمانے میں بھی اپنے محدود وسائل کے ساتھ اپنے چھوٹے سے مقامی اخبار کو سینے سے لگائے اس کی ہتھ کی جنگ لڑتا رہا۔

آخر کار الکھون کے بارے میں ایک خبر کی اشاعت کے بعد اس کے بھائی رالف کھون کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے ایک قاصد کی زبانی جان رابرٹ کو صرف اتنا پیغام بھیجا۔ ”تمہاری حرکتیں اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔“

جان رابرٹ نے جواب میں کھلا بھیجا۔ ”میرے لئے تو تم لوگوں کی حرکتیں نہ جانے کب سے ناقابل برداشت ہیں لیکن افسوس، کہ میں انہیں برداشت کرنے پر مجبور ہوں۔“

یہ جواب سن کر رالف کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ دوسرے روز جان رابرٹ اپنے دفتر کے سامنے پہنچ کر سڑک عبور کرنے ہی لگا تھا کہ بڑی سی ایک کار ٹائروں کی چرچاہٹ کے ساتھ اس کے قریب آ کر رکی۔ نہ جانے کیوں کار کو دیکھ کر ہی احساس ہو رہا تھا کہ وہ بدعاشوں کے استعمال میں رہتی ہوگی۔

اس میں سے جو چار افراد کو دکر اترے وہ واقعی بدعاش ہی تھے۔ ان میں سے ایک رالف تھا اور باقی تین اس کے گرے۔ تینوں بدعاشوں نے لاتوں، گھونسوں اور پتھروں کے دتے سے جان رابرٹ کو مارنا پینٹا شروع کر دیا جبکہ رالف اطمینان سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔

جان رابرٹ کو مارنے کیلئے بدعاش ایک اور چیز استعمال کر رہے تھے جو بھیاڑ تو نہیں تھی لیکن سخت تکلیف دہ اور ضرر رساں تھی۔ یہ اس طرح کے بدعاشوں کی اپنی ایجاد تھی۔ وہ لمبی سی ایک جراب میں صابن کی تکیہ ڈال لیتے تھے اور جراب کا ایک سرا پکڑ کر، گھما گھما کر اس سے اپنے ہتھکڑ کو ضربیں لگاتے تھے۔ اس سے انسان کے جسم سے خون تو نہیں نکلتا تھا لیکن جویش اسی طرح آتی تھیں جیسے ہتھوڑے سے ضربیں لگائی جا رہی ہوں۔

جان رابرٹ ہتھکڑ پر گر پڑا اور دونوں بازوؤں سے اپنے سر کے گرد حلقہ بنا کر سر کو چھوٹوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ بدعاشوں کے گھیرے میں آنے سے پہلے اس نے کچھ فاصلے پر دو پولیس والوں کو کھڑے دیکھا تھا لیکن وہ اس کی مدد کو آنے کے بجائے منہ پھیر کر دوسری طرف کوچل دیے۔ وہ ٹھنڈا اور تجر بے کار تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کس معاملے میں دخل دینا چاہئے اور کس میں نہیں۔ جان رابرٹ آخر کار بے ہوش ہو گیا۔

اسکی آنکھ اسپتال میں کھلی۔ دو چار دن اسپتال میں رہنے کے بعد جب اسے گھر جانے کی اجازت ملی اور وہ اپنے علاج معالجے کا مکمل ادا کرنے کے لئے کیشیر کے پاس رکاوٹ کیشیر نے بتایا کہ اس کا مکمل ادا کیا جا چکا ہے۔



میرے والی ٹائی پن گویا الکھون کی پہچان تھی۔ اس کی ہر ٹائی پن میں ہیرا لگا ہوتا تھا۔

جان رابرٹ انگڑا ہوا اسپتال سے پولیس اسٹیشن پہنچا۔ پولیس چیف نیڈو را سے بہت اچھی طرح جانتا تھا بلکہ جان رابرٹ تو اسے اپنے دوستوں میں شمار کرتا تھا۔ جان کو یقین تھا کہ سارا واقعہ نیڈو کے علم میں ہوگا۔ پھر بھی اس نے ضابطے کی کارروائی کے طور پر ساری بات اسے بتائی اور مطالبہ کیا کہ اس کے حلیف بیان کی بنیاد پر رالف اور اس کے تین بدعاشوں کے وارنٹ جاری کئے جائیں۔ ان میں سے ایک کو تو وہ جانتا تھا۔ اس نے اس کا نام بھی بتا دیا۔ اسے یقین تھا کہ دو افراد کی شناخت متعین ہونے کے بعد باقی دو کو بھی پولیس آسانی سے تلاش کر لے گی۔ نیڈو نے اس کی بات تحمل سے سنی پھر اس کی درخواست پر عمل کرنے کے بجائے الٹا اسے سمجھانے لگا۔ ”میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ اس پکڑ میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

”کیوں فائدہ نہیں ہوگا؟“ جان رابرٹ نے حیرت سے پوچھا۔ ”جو اثرات تم رالف پر لگا رہے ہو، اگر وہ ثابت ہو جائیں تو اس کی باقی زندگی جیل میں گزر سکتی ہے۔ لیکن کیا تمہارے خیال میں الکھون ایسا ہونے دے گا؟ وہ اپنے کارندوں تک کو کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتا اور انہیں بچانے کیلئے نہ جانے کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ کیا اس سے تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اپنے کئے بھائی کے لئے وہ کیا کچھ کر گزرتا ہے؟“ نیڈو نے کہا پھر کسی ہمدرد بزرگ کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں مانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے جان۔ لیکن کبھی کبھی انسان کو ایسی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ اپنی مرضی کے خلاف سمجھوتے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ لوگ کتنے بدعاش ہیں اور کتنے منظم ہیں۔ تمہیں ان قانونی کارروائیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ جو ہو چکا ہے، اس پر صبر کرو اور بات کو مزید نہ بڑھاؤ۔“

”تم پولیس آفسر ہو کر یہ بات کر رہے ہو؟“ جان رابرٹ نے حیرت اور بے یقینی سے کہا۔ ”جب پولیس ہی فنڈوں بدعاشوں اور دہشت گردوں کی سرکوبی کرنے کے بجائے شریف شہریوں کو ان سے مار کھانے کے بعد صبر کر کے بیٹھ جانے کا سبق دے گی تو اس شہر کا..... اور معاشرے کا انجام کیا ہوگا؟“

نیڈو نے اس سے مزید بحث نہیں کی اور افسردہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔

جب جان رابرٹ نے قانونی کارروائی کرنے پر بہت ہی زیادہ اصرار کیا تو نیڈو نے اس سے کہا۔ ”اچھا، تم کل صبح میرے پاس آنا، پھر بات کریں گے۔“

جان دوسرے روز پھر اس کے پاس پہنچ گیا۔

”تم ذرا اوپر میرے دوسرے کمرے میں بیٹھ کر تھوڑی دیر انتظار کرو۔ میں کارروائی کرتا ہوں۔“ نیڈو نے کہا اور ایک کانشیل کے ساتھ اسے اوپر دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

چند منٹ بعد اس کمرے کا دروازہ کھلا اور پیش قیامت نیلے سوٹ میں ایک دراز قلمچس مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ الکھون تھا۔ جان رابرٹ نے تیس سال بعد اس ملاقات کا احوال لکھا۔

الکھون نے اندر آ کر اس سے گرجوٹی سے مصافحہ کیا اور بلا تہمید کہا۔ ”تم نے خواہ مخواہ ہی اپنے دل میں میرے خلاف عناد بٹھالیا ہے جان رابرٹ! میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھتے ہو۔ ٹھیک ہے، میرے کچھ ناجائز دھندے ہیں لیکن یقین کرو، اس دنیا میں ہر شخص کچھ نہ کچھ ناجائز ضرور کر رہا ہے۔ کم از کم میں بلا وجہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، بلا سبب کسی کو ٹیکس مروا تا۔ خاص طور پر تم صحافیوں اور اخبار نویسوں کے ساتھ تو میں بہت ہی اچھی طرح پیش آتا ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں لکھنے پڑھنے والے لوگوں کی قدر کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی ایک خاص وجہ ہے۔ جانتے ہو وہ کیا ہے؟“

جان رابرٹ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

الکھون خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”اس لئے کہ تم لوگوں کی وجہ سے مجھے یا میرے کاروبار کو مفت میں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ مفت کی اس پیشکش کیلئے میں دل ہی دل میں تم لوگوں کا شکریہ ادا کرتا رہتا ہوں۔ مثال کے طور پر میرا وہ نائٹ کلب جس کا نام ”شب“ ہے، بہت بڑا نائٹ کلب ہے۔ اسے چلانا اور اس سے خاطر خواہ منافع حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور دوسری سیکڑوں اجینیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ اگر تم لوگوں کا تعاون شامل حال نہ ہو تو شاید میرا وہ نائٹ کلب نقصان میں جانے لگے۔“

اس کی یہ بات سن کر جان رابرٹ کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہو گئی۔ جب الکھون نے وضاحت کی۔ ”تم جیسے صحافی اپنی دانست میں اس کے خلاف خبریں لگاتے ہیں کہ وہاں یہ ہوتا ہے..... وہ ہوتا ہے..... تم لوگ سمجھتے ہو کہ اس سے میرا کلب بند ہو جائے گا، اس کا بیڑا غرق ہو جائے گا، اس پر تالا پڑ جائے گا، لیکن درحقیقت ایسی خبروں کی وجہ سے وہاں گاہکوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ میں اگر اس کلب کا اشتہار دیتا چاہوں تو تم جیسا کوئی مالک اسے اپنے اخبار میں نہیں چھاپے گا..... لیکن ایسی خبروں کی صورت میں مفت میں میرا اشتہار چھپتا رہتا ہے اور میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے سے بھی بچ جاتا ہوں۔ یہ ہے میری وہ خدمت جو تم لوگ نادانگی میں مفت انجام دیتے جا رہے ہو۔ اس لئے میں تم جیسے لوگوں کی زیادہ قدر کرتا ہوں۔ میں بھلا تم لوگوں سے ناراض کیوں ہوگا؟“

اس نے سگریٹ سلگائی اور اگلے سے اپنی پتلون کو جھاڑا حالانکہ اس پر کچھ لگا ہوا نہیں تھا۔ اس کی پتلون کی کرپرتواری دھار جیسی تھی۔ اس کی ٹائی میں گلی ہوئی ہیرے کی پن چمک رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ”مجھے بہت افسوس ہے کہ رالف اور اس کے آدمیوں نے تمہارے ساتھ مار پیٹ کی۔ میں نے انہیں ایسی کوئی ہدایت نہ کر سکی تھی۔ میرا بھائی دماغ کا ذرا تیز ہے۔ وہ میرے بارے میں کسی کی کوئی اونچی نیچی بات برداشت نہیں کر پاتا۔ اس رات وہ بے بسی ہو کر اس کے ساتھ ہی بہت زیادہ پیٹے پلاتے رہے تھے جس سے اگلی صبح انہوں نے آ کر تمہارے ساتھ جھگڑا کیا۔ اس رات ہی وہ تمہارے بارے میں بڑے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ صحافیوں اور ایڈیٹروں..... یا اس طرح کے دوسرے دانشور یا لکھنے پڑھنے والے لوگوں کے بارے میں کوئی سخت قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں..... مگر شراب ان کے دماغوں کو چڑھ رہی تھی۔ میں

نے اس کے بارے میں بھی انہیں سمجھایا کہ ہم شراب تیار ضرور کرتے ہیں اور پیٹے بھی ہیں لیکن ہمیں خود پینی نہیں چاہئے..... اور اگر پنی بھی لیں تو نشے میں آپے سے باہر نہیں ہونا چاہئے۔ میرا خیال تھا کہ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہوگی اور میرے کہے کا ان پر اثر ہو گیا ہوگا مگر افسوس.....“

الکھون نے جملہ احوال چھوڑ کر ٹھنڈی سانس لی اور مغموم لہجے میں بولا۔ ”ان پر کوئی اثر نہیں ہوا بڑے ہی موٹے دماغ کے لوگ ہیں۔ میری کچھ نہیں آتا کہ ان کا کیا علاج کروں۔ غلطیاں یہ کرتے ہیں اور میں ان کے اثرات دور کرتا پھرتا ہوں۔ یقین کرو، میں بے وقوف لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتا لیکن کیا کروں..... رالف میرا بھائی ہے۔ اب میں اسے مار تو نہیں سکتا..... اور نہ ہی اپنے سے الگ کر سکتا ہوں.....“

یہ کہہ کر اس نے ٹوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اور اس میں سے چند ٹوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ”رقم سے ہر چیز کی حلائی تو نہیں ہوتی لیکن کچھ نہ کچھ ایک شے کو شنی ضرور ہو جاتی ہے۔ تمہیں چند دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ تمہارا اور تمہارے اخبار کا کافی نقصان ہوا ہوگا۔ یہ رقم اس کی کچھ نہ کچھ حلائی کرے گی۔ تمہارا اسپتال کا بل ادا کیا جا چکا ہے لیکن تمہارے پیڑے بھی بسنے ہوں گے یا خراب ہوئے ہوں گے۔ یہ رقم ان کے سلسلے میں ہے..... یہ کہہ کر اس نے مزید چند ٹوٹ جان رابرٹ کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔

اس کے بعد بھی اس نے گڈی سے ٹوٹ نکالنے کا سلسلہ ختم نہیں کیا۔ اس نے مزید چند ٹوٹ نکال کر میز پر رکھے اور بولا۔ ”ہوسکتا ہے کچھ نقصانات میری نظر سے اوجھل ہوں..... یا میں ان کا ذکر کرنا بھول گیا ہوں، یہ رقم ان کی حلائی کیلئے ہے.....“

جان رابرٹ کے اندازے کے مطابق اس کے سامنے کم از کم تین ہزار ڈالر تو رکھے جا چکے تھے۔ وہ اب بھی خاموش تھا۔

اس نے تیس سال بعد اعتراف سے اس انداز میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اپنی یادداشتوں میں لکھا۔ ”میں اس وقت خاموش تھا لیکن درحقیقت میرے اندر خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ میں ایک کشش میں گرفتار تھا۔ میرے ذہن میں الکھون کے یہ الفاظ بار بار گونج رہے تھے میں بے وقوفوں کو برداشت نہیں کر سکتا..... میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید میں بیوقوف ہی تھا۔ شاید مجھے جیسے سارے لوگ ہی بیوقوف ہوتے ہیں شاید الکھون جیسے لوگ ہی ٹھنڈا اور ذہین ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں..... لیکن پھر میں کیا ایک اس کشش سے نکل آیا۔ میں نے اپنے ان خیالات پر بحث بھیجی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ حالانکہ میرے جسم کے بعض حصوں میں ابھی تک درد کی لہریں دوڑ رہی تھیں جو یکدم حرکت کرنے کی وجہ سے کچھ تیز ہو گئیں لیکن میں نے ان کی پروا نہیں کی اور نہایت باوقار انداز میں..... بلکہ تقریباً آکر تباہواروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹوٹ میز پر ہی رکھے رہ گئے۔ میں اپنی کشش سے نکل آیا تھا اور مجھے خوشی تھی کہ میں اپنے نظریات پر قائم رہا تھا۔ میرے پائے استقلال میں لغزش آنے کی گئی مگر میں فوراً ہی تسخیل گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر الکھون کے تاثرات بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور کمرے سے باہر آ گیا.....“

جان رابرٹ کو اپنے نظریات پر ثابت قدم رہنے کی خوشی سے لطف اندوز ہونے کا کچھ زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ چند دن بعد وہ دفتر پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ اس کے پاس اخبار کی پالیسی کے سلسلے میں فیصلے کرنے کا اختیار ہی نہیں رہا۔

ہوا یہ تھا کہ جان رابرٹ نے جب اخبار نکالا تو اس کے پاس خاطر خواہ وسائل نہیں تھے لیکن وہ ایک نظریاتی اور جنوبی قسم کا صحافی تھا۔ اخبار نکالنا اس کا خواب تھا چنانچہ اس نے کارپوریٹ بنیادوں پر اخبار نکالا۔ شہر کے کارپوریٹ قوانین کے مطابق اس طرح کوئی کاروبار شروع کرنے کے لئے اس میں کم از کم تین پارٹنرز کا ہونا ضروری تھا۔

جان رابرٹ نے دو دوستوں کو اخبار میں شامل کیا جنہوں نے رقم بھی لگائی اور اس کے ساتھ کام بھی کرنے لگے تاہم جان رابرٹ کے پاس چونکہ اخبار کے زیادہ شیئرز تھے اس لئے پالیسی کے سلسلے میں فیصلوں کا اختیار اس کے پاس تھا..... مگر اس روز وہ افسس پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ اس کے دونوں ساتھی اپنے شیئرز فروخت کر چکے ہیں اور اب شیئرز کا توازن کچھ ایسا بن گیا ہے کہ زیادہ شیئرز کسی اور کے پاس چلے گئے ہیں اور یوں اخبار کی پالیسی کے بارے میں فیصلوں کا اختیار بھی اس کے پاس چلا گیا ہے۔

..... اور وہ آدمی الکھون تھا!

جان نور یو جب اٹلی سے واپس آیا تو اس کیلئے گویا دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ تاہم اسکی عدم موجودگی میں جو تبدیلیاں آئی تھیں وہ اس کے لئے بے پناہ خوش کن تھیں۔ الکھون نے ”کاروبار“ کو ٹیکس سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ جان نور یو بہت طویل عرصے کے بعد واپس آیا تھا۔ الکھون نے اس دوران نہ صرف اس کے مفادات کی حفاظت بہترین طریقے سے کی تھی بلکہ دھندوں کو پھیلانے کے سلسلے میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار بھی کیا تھا۔

گو کہ کاروبار کو پھیلانے میں اس کا اپنا بھی فائدہ تھا کیونکہ وہ اس میں فننی فننی کا پارٹنر تھا لیکن بعض پارٹنر اپنے اس مفاد کا بھی خیال نہیں رکھ پاتے اور نہ ہی ان میں اپنے طور پر کاروبار کو وسعت دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے پارٹنر کی غیر موجودگی میں کاروبار کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں یا پھر خوب کھلے کرتے ہیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ الکھون نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔

جان نور یو بہت خوش ہوا اور اس نے الکھون پر پہلے سے بھی زیادہ اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ الکھون کاروبار سے ڈسٹن سے چلا تا تھا اور ڈسٹن کے معاملے میں وہ بڑا سخت گیر تھا۔ غلطی کرنے والے کو وہ دونوں کانوں سے پکڑ کر اٹھاتا اور دیوار پر دے مارتا تھا۔ وہ صرف اسی پر بس نہیں کرتا تھا بلکہ جب بڑے عیب خاص شخص دیوار سے ٹکرا کر دھب سے فرش پر گرتا تو وہ اس کی پیلیوں پر ایک آدھ ٹھوک بھی رسید کرتا۔

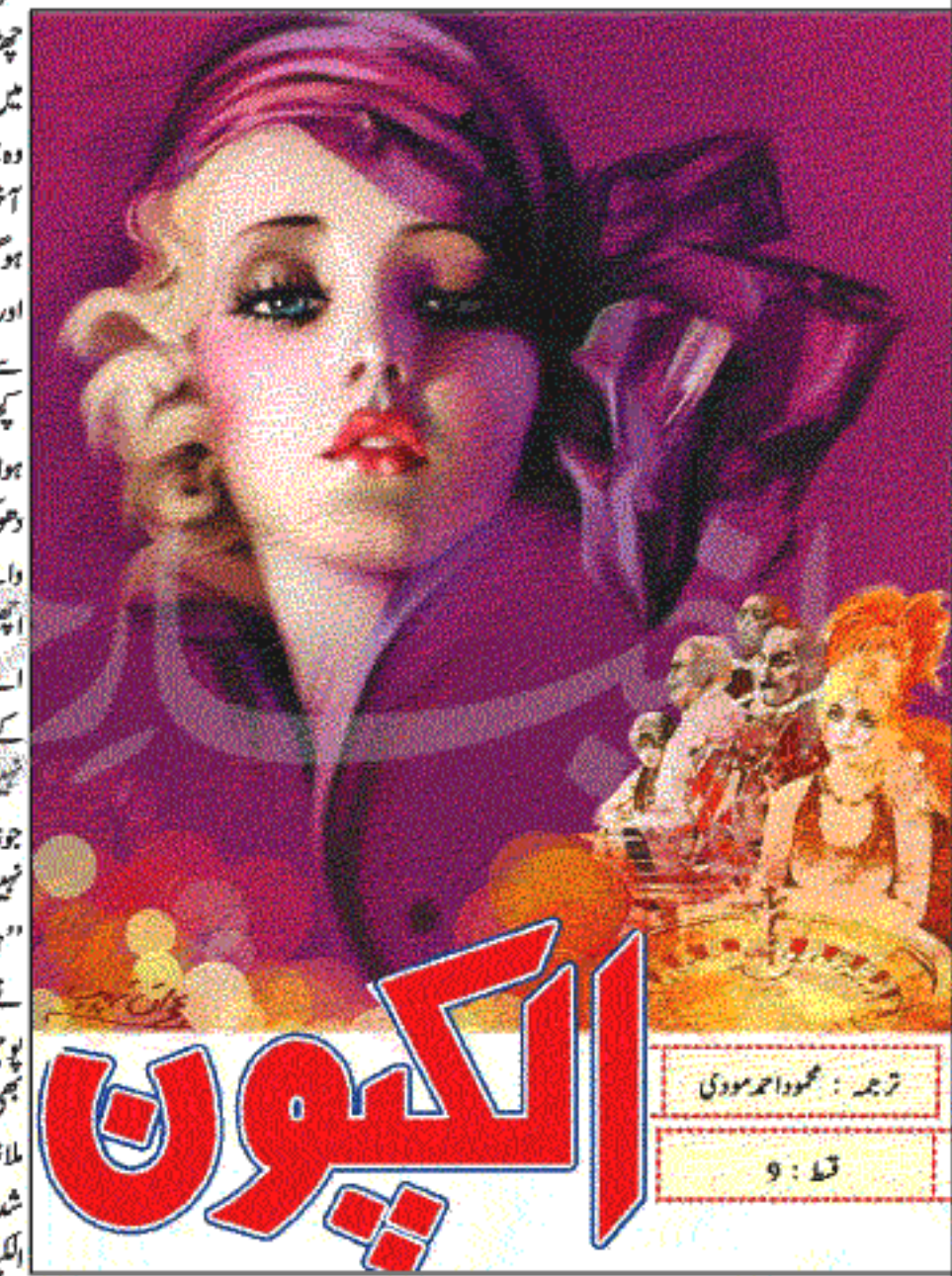
دوسری طرف وہ مہربان صفت اور فراخ دل بھی بہت تھا۔ اچھا کام کرنے والوں کو خوب نوازتا تھا۔ اپنے ٹپلے درجے کے ملازموں اور کارندوں کا خاص طور پر بہت خیال رکھتا تھا جن کی تنخواہیں یا آمدنی کے ذرائع معمولی ہوتے تھے۔ ایسے لوگوں کو وہ اکثر بلا سبب ہی نوازتا رہتا تھا۔

اس کا ڈرائیور ایک بار اپنے دوست اور کسی دوسرے آدمی کے ڈرائیور کو بتا رہا تھا۔ ”میں کل پاس کورس کورس پہنچانے گیا تو پاس نے گاڑی سے اترتے وقت پوچھا ’لوکلن! تمہارے پاس کل کتنی رقم ہے؟‘ میں نے جواب دیا ’سراپچا ڈالر!‘ اس نے چھ سو ڈالر نکال کر مجھے دیئے اور کہا ’یہ رکھ لو..... اور ہاں..... شام کو چھ بجے مجھے یہاں سے واپس لے جانے کے لئے آ جانا۔‘ میں حیران رہ گیا کہ انہوں نے اچانک مجھے یہ رقم کیوں دے دی؟ جبکہ میں نے ان سے کچھ مانگا تھا اور نہ ہی کسی ضرورت کا اظہار کیا تھا لیکن انہیں بہر حال یہ معلوم تھا کہ ہم جیسے کم تنخواہ والے لوگ اکثر ہی ضرورت مند رہتے ہیں۔“

(جاری ہے)



الکھون صرف اپنے ڈرامیور کے ساتھ ہی نہیں اپنے دوسرے ملازموں کے ساتھ بھی مہربانی کا سلوک کرتا رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کے وفادار اور جاگیر تھے۔ بعض اوقات تو الکھون ان کیلئے اس حد



ترجمہ: محمود احمد سودی  
قسط: 9

# الکھون

تک چلا جاتا تھا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اس نے جان رابرٹ کا اخبار ”ٹریبون“ جس طرح خریدا، اس میں رابٹلے کا ذریعہ ایک اخبار فروش بنا تھا جو فٹ پاتھ پر چھوٹا سا ایک تیزو ایشینڈ چلاتا تھا، اس کا نام لوئس تھا۔ اس نے چونکہ اپنا کام نہایت عمدگی سے انجام دیا تھا اور الکھون کو اس کے مقصد میں کامیاب کرانے میں خاصا اہم کردار ادا کیا تھا جس کے نتیجے میں الکھون اس اخبار پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا جو اس سے پہلے کسی طرح اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا چنانچہ لوئس پر الکھون اس قدر مہربان ہوا کہ اس نے اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر ایک شاندار دفتر میں بٹھادیا۔

دراصل اس نے لوئس کو ”ہائڈرین“ بنادیا تھا۔ ہائڈرین وہ آدی ہوتا تھا جو طرموں کی خفانت کرانے کیلئے ہائڈرین پمپنگ بھر کر جمع کرنا تھا مثلاً کسی طرم کی خفانت پچاس ہزار ڈالر میں ہوتی ہے تو وہ پچاس ہزار کا خفانت نامہ بھر کر عدالت میں جمع کر دیتا تھا لیکن اس کیلئے اس کا خود صاحب حیثیت اور صاحب جائداد ہونا ضروری تھا چنانچہ الکھون نے اس کے نام پر پانچ لاکھ ڈالر مالیت کی ایک بلڈنگ خرید دی تھی۔

اس میں الکھون کی نوازش کے علاوہ اس کی ایک صحت اور مفاد بھی تھا۔ لوئس کو درحقیقت دوسروں کیلئے بعد میں اور الکھون کے آدمیوں کیلئے پہلے ہائڈرین کے فرائض انجام دینے تھے۔ ہر بڑا گروہ اپنا ایک خاص ہائڈرین ضرور رکھتا تھا جس کا کام سب سے پہلے اپنے گروہ کے آدمیوں کی خفانتیں کرنا ہوتا تھا، دوسروں کی طرف وہ بعد میں دیکھتا تھا۔ یوں لوئس بھی اس حسن سلوک کے نتیجے میں اس کا گروہ یہ بلکہ عمر بھر کیلئے گویا زرخیز غلام ہو کر رہ گیا تھا۔

الکھون اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا کرتا تھا۔ ”انڈر ورلڈ بھی درحقیقت اوپر والی یا عام دنیا کی طرح ہوتی ہے، زیر زمین دنیا میں کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہوتی جو عام دنیا میں نہ ہوتی ہو، عام دنیا میں بھی خوب سازشیں ہوتی ہیں اور سب اپنے اپنے مفاد کیلئے جیتے ہیں، زیر زمین دنیا کے لوگ بھی یہی سمجھتے کرتے ہیں، عام دنیا میں بھی آپ کسی کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرتے ہیں، اس کیلئے حد سے گزر جاتے ہیں تو وہ آپ کا وفادار ہو جاتا ہے، زیر زمین دنیا میں بھی یہی ہوتا ہے، کوئی بھی بڑی چٹنی یا ادارہ اپنے ملازمین کا خیال رکھتا ہے، آڑے وقت میں ان کے کام آتا ہے، ان کی بہتری اور خوشحالی کیلئے کوششیں کرتا رہتا ہے تو ملازمین اس کے وفادار ہوتے ہیں۔ زیر زمین دنیا میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں اپنے آدمیوں کیلئے غلوں دل سے بہت کچھ کرتا ہوں اور ان کیلئے کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں اس لئے وہ بھی میری خاطر جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔“

اپنے آدمیوں کیلئے کسی بھی حد سے گزر جانے کا ثبوت الکھون نے ایک مرتبہ اس انداز میں دیا کہ سب حیران رہ گئے۔

گوزک نامی ایک شخص اس کا معمولی ملازم تھا۔ اس نے اسے اپنے ایک اڈے کا منیجر بنادیا تھا۔ وہ پانچ فٹ کا ایک عجیب گول منول اور پیلپا سا آدی تھا گروہ بڑا خوش مزاج تھا۔ اکثر ہنس مٹا کرتا تھا دکھائی دیتا تھا۔ الکھون کی اچھی خاصی رقم بھی اس کی تحویل میں رہتی تھی اور اسے ضرورت مندوں کو سود پر رقم دینے کا اختیار بھی حاصل تھا لیکن اسے یہ کام بہت دیکھ بھال کر کرنا ہوتا تھا کیونکہ رقم کی واپسی بھی اس کی ذمہ داری تھی چنانچہ اسے یہ دیکھنا ہوتا تھا کہ وہ اس انداز میں یا کسی ایسے آدی کو رقم نہ دے بیٹھے کہ وہ ڈوب جائے اور اس کی واپسی کی امید نہ رہے۔ گو کہ اسے رقم کی وصولی کیلئے بد معاشوں کی مکمل مدد بھی حاصل رہتی تھی اس کے باوجود یہ خاصی ذمہ داری کا کام تھا۔ بعض لوگوں کو تو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ الکھون نے گوزک جیسے آدی کے سپرد یہ کام کر رکھا تھا اور اسے اپنے ایک اڈے کا منیجر بھی بنا رکھا تھا۔ یہ شخص بھی الکھون کا نہایت وفادار اور جاگیر تھا۔

ایک روز وہ اس عالم میں گرتا پڑتا اور دہلے دہلے الکھون کے سامنے پہنچا کہ اس کا گول منول اور پیلپا سا چہرہ خون میں تر تھا اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔

”کس نے کیا ہے تمہارا یہ حال؟“ الکھون نے فوراً پوچھا۔ اس کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

”جوزف ہاورڈ نے!“ گوزک نے روتے ہوئے جواب دیا۔

الکھون نے یہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ بات کیا تھی۔ یہ فوری کیوں آئی تھی کہ جوزف ہاورڈ نے مار مار کر گوزک کو لہو بہان کر دیا۔ اس نے کسی قسم کی تفصیلات جاننے میں وقت ضائع نہیں کیا اور فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

جوزف ہاورڈ اوسط درجے کا ایک بد معاش تھا لیکن اسے اپنے آپ پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ ڈراما اور فکھ اور مضبوط جسم کا مالک تھا، کچھ خود پسند بھی تھا، بہت جلد غصے میں آ جاتا تھا۔ اکثر خوشخوار سہائی دکھائی دیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ بھی سننے میں آتا تھا کہ وہ تین گول کرچکا تھا جن کے سلسلے میں اسے حراست میں بھی لیا گیا تھا مگر کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے تینوں مرتبہ پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس نے گوزک کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کے بارے میں بعد میں مختلف باتیں سننے میں آئیں۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اس نے گوزک سے کچھ رقم قرض کے طور پر مانگی تھی۔ گوزک نے اسے قرض دینے سے انکار کر دیا تھا جس پر وہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ گوزک نے جوزف ہاورڈ کی ایک گرل فرینڈ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔

بعض لوگوں نے جوزف ہاورڈ کے ہاتھوں گوزک کی پٹائی کا منظر بھی دیکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان دونوں کے درمیان نچی آوازوں میں چند منٹ گفتگو ہوئی تھی پھر اچانک جوزف ہاورڈ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا اور اس نے گوزک کو گریبان سے پکڑے اس کے چہرے پر زوردار تحیر برسانے شروع کر دیے تھے پھر اس نے گوزک کے چہرے پر ہی دو تین گھونٹے بھی رسید کئے، وہ اس وقت تک اسے مارتا رہا جب تک اس کا چہرہ بری طرح خون میں نہا نہیں گیا۔

گوزک اس دوران روتا رہا، چیخا رہا اور نرم کی جھبک مانتا رہا لیکن جوزف ہاورڈ نے گویا اس کی آواز ہی نہیں سنی۔ وہ لوگ اس وقت جب تک کے بار میں تھے، وہاں دو چار دوسرے افراد بھی موجود تھے، وہ سب خوفزدہ انداز میں یہ منظر دیکھتے رہے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ آکر گوزک کو مشتعل جوزف ہاورڈ سے چھڑاتا، سب اس سے عام حالت میں بھی ڈرتے تھے جبکہ اس وقت تو وہ غصے میں تھا۔

آخر کار جب گوزک بے سدھ سا ہو گیا جب جوزف نے اسے چھوڑا اور وہ گرتا پڑتا، سسکیاں سی لیتا وہاں سے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد الکھون بار میں داخل ہوا۔ اس وقت تک جوزف ہاتھ منہ دھو کر پرسکون ہو چکا تھا اور سگڑوں والے کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔ گوزک کی اچھی طرح پٹائی لگانے کے بعد اسے گویا قرار آ گیا تھا اور اب اس کے چہرے پر ذرا بھی غصے کے آثار نہیں تھے۔ بار میں اس وقت جوزف اور ہارڈنیز کے سوا کوئی نہیں تھا۔

”ہیلو الکھون! کیسے ہو؟“ جوزف نے اسے دیکھ کر خوش مزاجی سے پوچھا۔ شاید اس کے دم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنے ایک معمولی ملازم کے پیٹے جانے پر الکھون شدید غصے میں بھی ہو سکتا ہے۔

”ہیلو الکھون! کیسے ہو؟“ جوزف نے اسے دیکھ کر خوش مزاجی سے پوچھا۔ شاید اس کے دم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنے ایک معمولی ملازم کے پیٹے جانے پر الکھون شدید غصے میں بھی ہو سکتا ہے۔

غصے کا اظہار بھی نہیں ہو رہا تھا۔

الکھون کاؤنٹر کے قریب آیا اور جوزف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں معلوم ہے نا گوزک میرا آدی ہے؟“

”مجھے کیا پورے شہر کو معلوم ہے۔“ جوزف برا سنا منہ بتاتے ہوئے بولا۔ اے گویا گوزک کا نام سننا بھی ناگوار کر رہا تھا۔

”اس کے باوجود تم نے اسے اس بری طرح مارا؟ تمہیں انکی جرأت کیسے ہوئی؟“ الکھون دھماکا سا ساتھ ہی اس نے جوزف کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

جوزف بھی انڈر ورلڈ کا آدی تھا اور الکھون کی اصل حیثیت سے بے خبر نہیں تھا لیکن اس وقت شاید اس پر بیکار اور خود پسندی کا کچھ زیادہ شدید دورہ پڑا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے الکھون کے اس ہاتھ کو دیکھا جس میں اس کا گریبان تڑم کر چھٹا ہوا تھا۔ الکھون کی طرح اس کے تاثرات بھی یکدم متبدل ہو گئے تھے۔

”تمہیں میرا گریبان پکڑنے کی جرأت کیسے ہوئی، عورتوں کے پیو پاری؟“ اس نے بھی الکھون ہی کے سے انداز میں گرجنے کی کوشش کی لیکن گریبان الکھون کی اتنی گرفت میں ہونے کی وجہ سے اس کا گھبراہٹ ہوا تھا۔ زیادہ بلند آواز آمد نہیں ہوئی تاہم اس نے انہی الفاظ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید بولا۔ ”جاؤ جا کر اپنا اصل دھندلا کرو۔۔۔۔۔ زیادہ بڑے بد معاش بننے کی کوشش نہ کرو۔“

دوسرے ہی لمحے الکھون نے اس اچھے خاصے قد اور مضبوط آدی کو ایک ہی ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑے پکڑے فرش سے اونچا اٹھالیا اور پھر کاؤنٹر کے اوپر سے کھینچے ہوئے باہر نکال لیا صرف یہی نہیں بلکہ اس دوران وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی ہپ پکٹ سے سے ریوا اور بھی نکال چکا تھا۔

جوزف کا سانس رک رہا تھا، اس نے ذرا بہتر طور پر سانس لینے کیلئے منہ کھولا ہوا تھا، الکھون نے اس کے منہ میں ریوا اور کی نال گھسیڑتے ہوئے ٹرنگو دبا دیا۔

جوزف کا تقریباً ایک طرف کا جبڑا اور رخسار ہی آگیا شاید وہ قہر آبی مر گیا تھا لیکن الکھون نے اس کا گریبان چھوڑنے اور فرش پر اس کے گرنے کے بعد بھی مزید پانچ گویاں اس کے جسم میں اتار دیں پھر وہ مڑا اور جس طرح آیا تھا، اسی طرح وہاں سے چلا گیا۔

حسب سابق پولیس کو اس واقعے کا کوئی گواہ میسر نہیں آیا جس سے اسے اس کیس کو مکمل کرنے میں کوئی مدد مل سکتی۔ ہارڈنیز تک کا بیان یہی تھا کہ وہ کوئی اجنبی تھا جو آیا اور جوزف پر اپنا ریوا اور خالی کر کے چلا گیا، اس نے اس سے پہلے بھی کسی شہر میں ایسی شخص کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

تاہم الکھون اس دوران احتیاطاً شہر سے غائب ہو گیا۔ پولیس نے بہر حال اس دوران اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہی تھی لیکن اسے بتایا گیا کہ وہ کچھ شہروں کے تقریبی دورے پر نکلا ہوا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس وقت کہاں ہوگا۔

ایک ماہ بعد جب اس کے آدمیوں نے اسے گرین سٹنل دے دیا کہ مطلع صاف ہے تو وہ واپس آ گیا اور خود ہی اسٹنٹ ڈسٹرکٹ انارنی کے آفس میں چلا گیا جو پچیس چھیس سال کا ایک نوجوان تھا، اسے یہ عہدہ سنبھالنے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

”سنا ہے آپ لوگ مجھے تلاش کر رہے تھے؟“ الکھون نے نہایت مصصیت سے کہا۔ ”میں ذرا اپنے اعصاب کو آرام دینے کیلئے تقریبی دورے پر گیا ہوا تھا، آپ لوگوں کو مجھ سے کیا کام تھا؟“

اس سے کچھ دیر پوچھ گچھ کی گئی لیکن اس کا کہنا یہی تھا کہ اسے جوزف ہاورڈ کے قتل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، وہ تو قوسے کے روز شہر میں بھی نہیں تھا۔ اس نے ریلوے، بحری جہاز کے ٹکٹ اور ہوٹلوں کے ایسے بل پیش کر دیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ قوسے سے ایک روز پہلے ہی شہر سے رخصت ہو چکا تھا۔

کوئی کچھ بھی نہ کر سکا اور یہ کیس یونہی رہا۔ کبھی مل نہیں ہو سکا۔ اس واقعے سے الکھون کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس کے ساتھیوں اور کارندوں کا اس پر اعتماد بڑھ گیا، انہیں اندازہ ہو گیا کہ الکھون ان کیلئے کس حد تک جاسکتا ہے۔ یہ احساس ہونے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ اس کے وفادار اور جاگیر ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

شراب کے دھندے میں الکھون کے پارٹنر برنمین نے ایک مرتبہ اندازہ ظاہر کیا تھا کہ شکاگو میں ہر ماہ تیس ملین ڈالر کی شراب فروخت ہوتی ہے جس پر ٹیکس ادا نہیں کیا جاتا۔ اس کے بجائے تیس ملین ڈالر کی اس رقم میں سے ایک ملین ڈالر پولیس والوں، ایف بی آئی کے ایجنٹوں اور انتظامیہ میں عہدے حاصل کر لینے والے سیاستدانوں میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔

خاندانی کیلئے حکومت کو تھوڑے بہت ٹیکس ادا کئے جاتے تھے لیکن اس رقم کا عشر عشر بھی نہیں ہوتے تھے جو حکومت کو درحقیقت ملنی چاہئے تھی۔ شراب پر عائد ٹیکس چرانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ متعلقہ افراد اور اداروں کی کرپشن نے الکھون جیسے لوگوں کا کام بہت آسان کر دیا تھا۔

وہ ایسے لیبل چھپوا لیتے تھے جو بریوری سے نکلنے والی شراب کی بوتلوں اور بیئر کے برل وغیرہ پر چسپاں کر دیے جاتے تھے اور ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان بوتلوں یا بریل پر ٹیکس ادا کر دیے گئے ہیں۔ درحقیقت ٹیکس ادا کرنے کے بجائے کبھی کبھار چیکنگ کیلئے آنے والے ایجنٹوں کی خدمت میں طے شدہ نمبر اندیش کر دیا جاتا تھا یوں صرف ٹیکس چرا کر ہی الکھون اور اس کے پارٹنر جیسے لوگ کروڑ پتی بن رہے تھے جبکہ شراب کے علاوہ بھی ان کے بہت سے دھندے تھے۔ اس زمانے میں کروڑ پتی ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

الکھون کا پارٹنر برنمین ایک دلچسپ کردار تھا۔ اس کی ذات تضادات کا مجموعہ تھی، وہ نمایاں قد کا شخص کا آدی تو نہیں تھا لیکن بہر حال مضبوط جسم کا مالک تھا۔ گو کہ وہ ایک اچھا خاصا بد معاش تھا لیکن بد معاش سے زیادہ دکاندار نظر آتا تھا۔ دکاندار تو وہ واقعی تھا، اس نے پھولوں کی دکان

کھول رکھی تھی۔ انڈر ورلڈ کا آدی ہونے کے باوجود اسے کسی شخص اور صاحب ذوق انسان کی طرح پھولوں سے بڑی محبت تھی، وہ اکثر دکان میں کئی ملازموں کی موجودگی میں بھی خود اپنے ہاتھوں سے پھولوں کی تراش فراش اور گلہ سٹوں کی سجاوٹ میں لگا رہتا تھا۔

سگریٹ وہ نہیں پیتا تھا۔ شراب بھی بہت کم پیتا تھا، شام کو سیدھا گھر جاتا تھا۔ اس کی بیوی کا کہنا یہی تھا کہ وہ محبت کرنے والا، نرم مزاج اور بہترین شوہر تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کا ذکر بھی بڑی محبت سے کرتا تھا۔ جسے سخت ناپسند کرتا تھا، اس کے بارے میں بھی عاجزانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کرتا تھا۔ ”بہت اچھا آدی ہے۔ اس کی کیا بات ہے۔۔۔!“

مگر یہی برنمین جب غصے میں آتا تھا تو گلے لگتا تھا کہ وہ ساری دنیا کو اپنے غصے کی آگ سے جلا کر بھسم کر دے گا۔ اس کے دل میں اگر اچانک کوئی خیال آتا تھا تو وہ اس پر عمل کر گزرتا تھا۔

ایک روز وہ اپنی بریوری سے نکلا تو اس نے کچھ دور دو پولیس والوں کو کچھ مشکوک سے انداز میں کھڑے دیکھا۔ اس روز گری بہت تھی اور پولیس والے پیسے میں ڈر ہو رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی بریوری کی ”خفیہ“ نگرانی کرنے کیلئے آئے تھے۔

برنمین کو انہیں پیسے میں خرد کچھ کر بڑا ترس آیا، وہ انہیں بریوری کے اندر لے آیا حالانکہ اس وقت وہ کسی کام سے جا رہا تھا مگر وہ گویا اپنا کام بھول گیا اور پولیس والوں کی آؤ بھگت میں لگ گیا۔ انہیں شخصی بیئر پلائی، بڑی محبت سے ان کے ساتھ باتیں کیں۔ پولیس والے انکی بریوری میں وارنٹ کے بغیر گھسنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ خود انہیں اپنے ساتھ اندر لے آیا تھا۔

صرف یہی نہیں بلکہ جب وہ ان کی خاطر عدالت سے فارغ ہو گیا تو اس نے انہیں بڑی فراخ دلی سے دعوت دی کہ وہ چاہیں تو پوری بریوری میں اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھ لیں، جو بھی چیز چیک کرنا چاہیں، اطمینان سے چیک کر لیں۔ پولیس والے اس کے طریقہ عمل پر حیران پریشان ہوتے رہے۔

پولیس والوں کو وہ کئی بار حیران کر چکا تھا۔ جس زمانے میں وہ نقب زن ہوا کرتا تھا۔ ایک بار گلیوں میں گشت کرنے والے پولیس والوں نے رات کے پچھلے پہر برنمین کو دیکھا۔ وہ ایک لیٹر باکس پر چڑھ کر بیٹھا ہوا تھا اور ویران گلی میں رات کے سنانے میں گلا بھاڑ بھاڑ کر ایک گانا گاتا رہا تھا جبکہ اس کا نقب زنی کے اوزاروں کا تھیلا اس کے پیروں کے قریب رکھا ہوا تھا۔ کوئی کبھی اللہ داغ نقب زن ایسی حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گویا چیخ چیخ کر پولیس والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانی تھی۔

ایک بار اس نے بازار میں گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ وہ کسی مال گاڑی پر سوار ہو کر نہ جانے کس پتھر میں شہر آگئی تھی اور مصائب کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے جسم پر ناکافی لباس تھا اور وہ بھی جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا، بچاری خت ہراساں اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ دو چار بادشاہ اور لٹفے قسم کے لڑکے اسے تنگ بھی کر رہے تھے۔

برنمین نے سب سے پہلے تو ادبش اور لٹفے لڑکوں کو گھونٹے تھپڑ اور لاتیں رسید کر کے وہاں سے بھگایا پھر لڑکی سے اس کا احوال پوچھا۔ اتفاق سے اس وقت برنمین کی جیب میں نقد رقم نہیں تھی، اس نے وہیں بازار میں کھڑے ہو کر اپنا ہیٹ بھکاریوں والے انداز میں ہاتھ میں لے کر لڑکی کیلئے باعزت لباس خریدنے کی غرض سے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار اس نے لڑکی کو باعزت لباس پہنا کر اور کچھ نقد رقم دے کر رہی رخصت کیا۔

وہ جب اپنی پھولوں کی دکان میں ہوتا تھا تو خوش اخلاقی کا بیکر ہوتا تھا۔ گاہک کے قدموں میں بچھا جاتا تھا۔ گاہکوں سے چیک بھی قبول کر لیتا تھا۔ بعض لوگ اسے بوگس چیک بھی دے کر ملے جاتے تھے لیکن وہ بعد میں ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی کسی قسم کی برہمی کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

ایک رپورٹر نے تو ایک بار باربا میں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا بھی تھا کہ الکھون نہ جانے اس قسم کے پانڈے کے ساتھ کیسے گزارا کر رہا تھا جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کس وقت کیا کر گزے۔

اس کا پھولوں کی دکان والا فون ٹیپ ہوتا تھا اور یہ بات برنمین کو معلوم بھی تھی۔ عام حالات میں تو وہ بات چیت کرنے میں ذرا احتیاط کر بھی لیتا تھا لیکن غصے میں سب کچھ بھول جاتا تھا۔

ایک بار اس کے شراب کے ایک ٹرک کو دو پولیس والوں نے مشکوک قرار دے کر ٹیکس راستے میں روک لیا۔ کبھی کو معلوم تھا کہ زیادہ تر ٹرکوں میں ایسی ہی شراب جاری ہوتی تھی جس پر ٹیکس ادا نہیں کئے گئے ہوتے تھے خواہ ان پر لیبل کیسی لگا ہوتا۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ یہ تمام سلسلہ پولیس اور دوسرے لوگوں کی ملی بھگت سے چل رہا تھا۔

لیکن بعض ایسے پولیس والے جن کے حصے میں اوپر کی آمدنی میں سے کچھ نہیں آتا تھا، راستے میں شراب کے کسی ٹرک کو مشکوک قرار دے کر روک لیتے تھے اور سووے بازی کے بعد تھوڑا بہت ”چائے پانی“ انہیں بھی مل جاتا تھا۔

اسی پتھر میں برنمین کے ٹرک کو بھی روکا گیا تھا۔ برنمین کے کارندے نے فون پر اسے اطلاع دی تو اس کا لہجہ ذرا تشویش زدہ تھا۔ ”دو پولیس والوں نے ٹرک روک لیا ہے اور کچھ زیادہ ہی سختی دکھا رہے ہیں۔ میں نے انہیں ڈھائی سو ڈالر تک کی پیشکش کر دی ہے لیکن وہ تین سو ڈالر مانگ رہے ہیں۔“

”تین سو ڈالر.....؟“ برنمین ایک دم غصے سے پھٹ پڑا۔ ”ان کا دماغ تو ٹھیک ہے؟ اس سے آدمی رقم میں تو میں ان کا پتہ صاف کر سکتا ہوں۔“

جولوگ ٹیلیفون ٹیپ کرنے کی ڈیوٹی پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ برنمین کی غیظ و غضب سے بھری آواز میں یہ سن کر ڈر گئے۔ انہیں اندیشہ محسوس ہوا کہ برنمین کہیں موقع پر ہی پولیس والوں کا کام تمام نہ کر دے۔ انہوں نے فوراً متعلقہ پولیس انٹیشن کو اطلاع دی کہ برنمین کے منہ سے یہ بات سننے میں آئی ہے۔ چنانچہ ان دو پولیس والوں کے پاس ملک کے طور پر مزید پولیس فورس روانہ کی جائے۔

یہ دوسری بات تھی کہ مزید پولیس فورس کے پہنچنے سے پہلے ڈھائی سو ڈالر پر ہی سودا طے پا گیا اور کچھ دیر بعد برنمین کے کارندے نے اطلاع دی کہ وہ ٹرک لے کر آگے روانہ ہو گیا ہے۔ بات صرف پچاس ڈالر کی تھی لیکن برنمین کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کس بات پر غصے سے اکھڑ جائے اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آئے۔

اپنے اسی غصے کے باعث برنمین لین دین کے کسی جھگڑے میں ڈنی نامی ایک آدی کو گولی مار کر ہلاک کر بیٹھا تھا۔ اس کے بعد تناؤ کشیدگی اور کشمکش کی عیسب سی صورتحال پیدا ہو گئی۔ ڈنی دراصل بچہ فنی کا کارندہ تھا۔





ڈاکہ گو کا جو علاقہ ”طلل اٹلی“ کہلاتا تھا، جتنا فیملی کا اس پر راج تھا۔ جتنا فیملی کو شکا گو کی ابتدائی مافیاضی میں سے ایک کہا جاسکتا تھا۔ یہ کوئی خاص بڑی فیملی نہیں تھی۔ اس کی ساری طاقت و حقیقت صرف دو بھائیوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ دونوں ہی بڑے خوشخوار تھے۔ زیادتی کی ابتداء انہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ انہوں نے ان علاقوں میں بھی اپنی شراب فروخت کیلئے بیعتی شروع کر دی تھی جو پہلے برٹین کیلئے مخصوص کئے جاتے تھے۔

ظاہر ہے یہ بات برٹین کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ برٹین کے ہاتھوں جتنا فیملی کا آدمی ڈنی اسی پکر میں مارا گیا تھا مگر یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس طرح گویا جتنا فیملی اور برٹین کے درمیان دشمنی کا آغاز ہو گیا۔ ادھر چونکہ برٹین کے ساتھ الگھن اور جان نور یو کا اتحاد تھا اس لئے جتنا فیملی نے ان کا نام بھی خواہ مخواہ ہی اپنے دشمنوں کی فہرست میں لکھ لیا جبکہ اس سے پہلے ان کے درمیان ایسے خاصے خوشگوار تعلقات تھے۔

جان نور یو کافی حد تک امن پسند آدمی تھا۔ وہ خواہ مخواہ کی مصیبتیں مول لینے اور اپنے لئے بلاوجہ مسائل کھڑے کرنے کا قائل نہیں تھا، اس کے اور الگھن کیلئے یہی کافی تھا کہ وہ برٹین جیسے مشتعل مزاج آدمی کو برداشت کر رہے تھے جو اکثر کوئی نہ کوئی بڑا مسئلہ کھڑا کر دیتا تھا۔ وہ دونوں اب جتنا فیملی کے دو خوشخوار بھائیوں سے محض برٹین کی خاطر دشمنی مول لے کر گروہوں کے درمیان ایک خونریز جنگ شروع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

جنگ تو شاید شروع ہوئی چکی ہوئی مگر نفیست سے یہاں ان دونوں جتنا فیملی سے تعلق رکھنے والے دونوں بھائی اپنے خاندان کے ایک شخص مائیک مرو کو اپنے بزرگ اور سرپرست کا درجہ دینے ہوئے تھے۔ وہ نہایت سرکش اور متوجہ مزاج ہونے کے باوجود مائیک مرو کا حکم مانتے تھے اور مائیک مرو نے فی الحال انہیں برٹین کو قتل کرنے سے روک دیا تھا۔ مائیک کو بھی اندازہ تھا کہ برٹین کو قتل کرنے سے گروہوں کے درمیان خونریزی شروع ہو جائے گی۔

برٹین کے خلاف جب جتنا فیملی کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہوئی تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ جتنا برادرز اس سے مرعوب ہیں اور اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر پارے۔ اس خوش فہمی کے تحت وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گیا، اس نے جتنا فیملی کا شراب کا ایک ٹرک لوٹ لیا۔

یہ واردات خاصے فلمی انداز میں ہوئی۔ ایک سیاہ کار نے شراب کی بوتلوں سے بھرے ٹرک کا تعاقب کیا۔ ٹرک نے شہر سے باہر کار رخ کیا اور رفتار بڑھا کر نکل جانا چاہا مگر کار نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور فلمی انداز میں چیزنگ جاری رکھی۔

آخر کار شہر سے باہر جا کر کار نے ٹرک کو پیچھے چھوڑا اور کچھ دور جا کر سنسان سڑک پر اس طرح ترجیحی ہو کر گئی کہ ٹرک کیلئے لکھنا ناممکن نہ رہا۔ ٹرک کا فی بڑا تھا۔ کار سے چار آدمی شاٹ گھنیں لئے اترے۔ ٹرک پر تین افراد موجود تھے، وہ بھی مسلح تھے لیکن انہوں نے فائر کرنے میں مکمل نہیں کی۔ انہیں شاید گمان بھی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگر معاملہ صرف شراب ہی ہوتا تو شاید وہ مزاحمت بھی نہ کرتے۔

وہ شاید اس خیال سے بھی تعاقب کرنے والی کار پر فائر کرنے سے باز رہے کہ اس میں خفیہ پولیس یا ایف بی آئی کے آدمی نہ ہوں۔ انہیں کچھ جاننے کی مہلت نہیں مل سکی۔ وہ جو بھی ٹرک سے اترے، پے در پے دھماکوں سے دیانے کی فضا مرقش ہو گئی، ان میں سے دو کی تو آدمی آدمی کھوپڑی اڑ گئی، ایک کارنرے کے جسم میں پانچ گولیاں پیوست ہو گئیں اور اس کا پاؤں ٹرک کے پائیدان میں ہی پھنسا رہ گیا، وہ کچھ اس طرح ترچھا لگا ہوا تھا کہ اس کا سر ٹرک پر تھا اور پاؤں اوپر تھے۔

ایک ہندوق برادر نے اسے کھینچ کر سڑک پر پھینکا مگر وہ ہندوق برادر ٹرک میں سوار ہوئے اور اسے لے کر واپس شہر کی طرف چل دیئے، مزید دو ہندوق برادر اس کی حفاظت کیلئے سیاہ گاڑی میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے جبکہ پانچواں ڈرائیور کر رہا تھا۔

انڈر ورلڈ کے لوگوں کے معلومات کے اپنے ہی ذرائع ہوتے ہیں۔ پولیس اور خفیہ اداروں کو ان کے بعض معاملات کے بارے میں شاید کچھ معلوم نہ ہو لیکن انہیں ایک دوسرے کی سرگرمیوں اور حرکتوں کے بارے میں جلد یا بدیر سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے، خواہ موقع کا کوئی گواہ موجود ہو یا نہ ہو۔

جتنا برادرز کیلئے بھی یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ ان کے تین آدمیوں کو قتل کرنے اور شراب کا ٹرک لوٹنے والے کون تھے اور انہوں نے کس کے حکم پر ایسا کیا تھا۔ اسکے بعد ایک طوفان برپا ہو سکتا تھا لیکن جتنا برادرز کی طرف بدستور ایک سکوت طاری رہا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں بھائی ان دنوں مائیک مرو کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے جو کینسر سے مر رہا تھا۔ اسکی زندگی کے آخری دن چل رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گا۔ جتنا برادرز پوری طرح اس کی خبر گیری کر رہے تھے اور باقی ہر بات گویا بھولے ہوئے تھے۔

مائیک مرو ایک بڑھا لکھا، نہایت شاکست، نفس اور خوش لباس آدمی تھا۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگتی تھی کہ وہ ایک مافیاضی کا سرپرست تھا اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ جتنا برادرز جیسے وحشی و جانور اس کا احترام کرتے تھے۔ وہ کچھ ایسا عمر رسیدہ بھی نہیں تھا۔ کینسر جیسے موذی مرض نے اسے موت کے منہ میں پینچا دیا تھا ورنہ بظاہر تو ابھی اس کی مرنے کی عمر نہیں تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جتنا برادرز اب خود پر ضبط کئے اس کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے شاید سوچ لیا تھا کہ اب انہیں جو کچھ بھی کرنا ہے، اس کے مرنے کے بعد ہی کرنا ہے۔

الگھن اور جان نور یو بھی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ برٹین کے آدمیوں نے جتنا برادرز کے تین آدمیوں کو قتل کر کے شراب کا ایک ٹرک لوٹا ہے۔ یہ حرکت ان کی نظر میں بھی قطعی اچھی نہیں تھی، انہیں معلوم تھا کہ برٹین چونکہ ان کا ”اتحادی“ ہے اس لئے بات ان پر بھی آئے گی، کوئی یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ برٹین نے اتنا بڑا اقدام ان کی پسلی کے بغیر اٹھایا ہوگا۔

الگھن اور جان نور یو دونوں ہی محسوس کر رہے تھے کہ برٹین کا ساتھ ان کیلئے ایک بوجھ بننا چاہا رہا تھا اور بے مقصد طور پر انہیں بڑے بڑے خطرات کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اسی دوران دو تین اور بڑے واقعات ایسے ہوئے جنہوں نے ان دونوں کو برٹین کی طرف سے بالکل ہی بدگن کر دیا۔

ایک واقعہ تو کچھ یوں تھا کہ جان نور یو نے اپنی ایک بریوری بڑھ لاکھ ڈالر میں برٹین کے ہاتھ فروخت کی۔ برٹین نے اس کیلئے بیعانہ دے دیا مگر ضررہ تاریخ پر ادا لگئی نہیں کی۔ صحیح معنوں میں انڈر ورلڈ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اخلاقیات بعض معاملات میں عام ایماندار اور شریف شہریوں سے بھی بلند ہوتی ہیں، وعدہ خلافی ان کے ہاں بہت ہی سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔

تاہم جان نور یو نے اس سلسلے میں فوری طور پر کوئی سخت رد عمل ظاہر نہیں کیا اور برٹین سے رقم کا تھا خا کرتا رہا۔ برٹین نال مول کر تاربا، وہ اس دوران اپنے گروہ کے ذریعے دوسروں کی شراب کے ٹرک لوٹنے میں لگا ہوا تھا اور خود اس کی اپنی بریوریاں بھی پیداوار دے رہی تھیں شاید اس لئے وہ جان نور یو کی بریوری کی کچھ زیادہ ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا لیکن انڈر ورلڈ میں وعدہ بہر حال وعدہ ہوتا ہے، اگر محض زبانی بھی کسی سے کوئی وعدہ کیا جائے تو اسے بھی پورا کرنے کیلئے جان لڑا دی جاتی ہے جبکہ یہ سودا تو باقاعدہ کاغذات پر طے ہوا تھا۔ اسی دوران ایک مزید بڑی بات یہ ہوئی کہ ٹیکس چوری کے سلسلے میں اس بریوری پر چھاپہ پڑ گیا اور اس پر تالا ڈال دیا گیا۔ نئے پولیس چیف کولنز پر بہت دباؤ تھا اور وہ بدعاشوں کے خلاف کچھ کارکردگی دکھانا چاہتا تھا۔

اب جان نور یو اور برٹین کے درمیان تلخی اور بڑھ گئی۔ جان کا موقف تھا کہ اگر برٹین اسے صحیح وقت پر ادا لگتی کر چکا ہوتا تو اب تک بریوری اس کی ملکیت ہوتی اور چھاپے کے مسائل اسے بھگتنا پڑتے جبکہ برٹین اپنی جگہ خوش تھا کہ وہ ایک مصیبت سے بچ گیا، اگر وہ ادا لگتی کر چکا ہوتا تو رقم جاتی اور بریوری پر بھی تالا بڑا ہوتا۔ وہ اپنی اس خوشی کا باقاعدہ اظہار بھی کرتا تھا جو الگھن اور جان نور یو دونوں ہی کو برا لگتا تھا۔

بات پھر وہی آجاتی تھی کہ وعدہ بہر حال وعدہ تھا۔ برٹین کو اب بھی ادا لگتی کر کے بریوری اپنی ملکیت میں لگنی چاہئے تھی۔ برٹین یہ بات سن کر استعزائے انداز میں ہنسنے ہوئے الگھن اور جان نور یو سے کہتا تھا۔ ”کیا تم دونوں مجھے بالکل ہی پاگل سمجھتے ہو؟ ایک بریوری جس پر چھاپہ پڑ چکا ہے اور جس پر تالا بڑا ہوا ہے میں اس کیلئے تمہیں ادا لگتی کروں؟ کیا یہی کافی نہیں ہے کہ میں تم لوگوں سے اپنا بیعانہ واپس نہیں مانگ رہا؟ اخلاقی اور اصولی طور پر تو تمہیں میرا بیعانہ واپس کر دینا چاہئے مگر تم لوگوں میں اخلاقیات اور اصول پسندی کہاں؟“

الگھن کے مقابلے میں جان نور یو زیادہ سچ جواد اور امن پسند آدمی تھا۔ وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن تم نے تحریری طور پر ادا لگتی کی جو تاریخ دی تھی، اسکے بعد بھی کافی دنوں تک بریوری پر چھاپہ نہیں پڑا تھا، وہ کھلی تھی اور اس میں پروڈکشن ہو رہی تھی۔“

”یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ برٹین بے پرواہی سے بولا۔ ”میں تو اس وقت کی صورتحال دیکھوں گا جب تم مجھ سے رقم کا تھا خا کر رہے ہو۔“

”یہ سنگین قسم کی وعدہ خلافی ہے، بات رقم کی نہیں اصول کی ہے۔“ الگھن کے لہجے میں یہی سی صبیحہ تھی۔ ”ہم نے آپس میں اتحاد ایک دوسرے کے کاروبار کو بڑھاوا دینے اور ایک دوسرے کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کیلئے کیا تھا، جب ہم اتحادی ہی ایک دوسرے سے کئے ہوئے وعدے پورے نہیں کریں گے تو ہم دوسروں سے اپنے کسی ساجھی کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟“

”یہ اچھا اتحاد ہے کہ تم لوگ اپنے ساجھی کو ہی لوٹنے پر تلتے ہوئے ہو۔“ برٹین براسمانہ بنا کر بولا۔

جان نور یو اب بھی جھل سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ”میں بریوری میں کام شروع کر دیتا ہوں، میری متعلقہ پولیس اسٹیشن کے انچارج سے بات ہوگئی ہے جو پہلے مجھے ہمارے ہاتھوں بکا ہوا تھا لیکن بڑے افسروں کے دباؤ کی وجہ سے وہ آپریشن کے دوران ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکا، اب معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا ہے، اب ایسا بندوبست ہو سکتا ہے کہ بریوری پر بدستور تالا پڑا رہے گا اور باہر دو پولیس والے اسی طرح پہرہ دیتے رہیں گے جس طرح اس وقت دے رہے ہیں لیکن اندر پروڈکشن شروع ہو جائے گی، ڈراڈھکے جیسے انداز میں پچھلے گیٹ سے ٹرک آتے جاتے رہیں گے۔“

”آخر تم لوگ وہ بریوری میرے ہی سر کیوں منڈھنے پر تلتے ہوئے ہو؟“ برٹین گویا سخت بد مزہ ہوتے ہوئے بولا۔

”اس میں سر منڈھنے والی تو کوئی بات نہیں۔“ جان نور یو اب گویا ڈراما برامتنا تے ہوئے بولا۔ ”تم نے خواہ اسرار کر کے خریدی تھی اور ہم نے بھی اس لئے بیچ دی تھی کہ وہ ان علاقوں کے بالکل قریب ہے جہاں تمہارا مال جاتا ہے تمہارے لئے اس کو خریدنے میں، بہت فائدہ تھا بھی تو تمہاری اس پر مال پختی تھی، ہمارے لئے اس کو چلانے میں سلائی کے مسائل کی وجہ سے اخراجات بھی زیادہ ہیں اور خطرات بھی..... ہمیں زیادہ پولیس والوں اور دوسرے افسروں کو بھیجے دینے پڑتے ہیں کیونکہ ہمارا مال وہاں سے زیادہ دور جاتا ہے۔“

”کچھ بھی ہو، بہر حال میں اب اس بریوری کو خریدنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ میرے بیعانے کی رقم کو تم میری طرف سے تحفہ کچھ کرکھ سکتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ شانہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ الگھن اور جان نور یو کو کوئی بڑی رقم خیرات کے طور پر دے رہا ہو۔

الگھن نے خاموشی سے مگر نہایت خوفناک نظروں سے برٹین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں موت رقصاں تھی لیکن برٹین اپنے زعم میں رہنے والا آدمی تھا، وہ ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔

بات ختم ہوگئی۔ جان نور یو نے بہر حال اپنی بریوری میں اپنے ارادے کے مطابق پروڈکشن شروع کر لی۔ مین گیٹ پر بدستور تالا پڑا رہا اور باہر دو پولیس والے بھی تعینات رہے لیکن اندر کام شروع ہو گیا۔ رات کے اندھیرے میں پچھلے گیٹ سے ٹرک آتے اور مال لے جاتے، متعلقہ پولیس اسٹیشن اور دیگر افراد کے علاوہ باہر ڈیوٹی دینے والے اہلکاروں کو بھی ان کا طے شدہ حصہ لگے لگا اور کچھ دنوں کے قتل کے بعد کاروبار دوبارہ چل پڑا۔

مگر جان نور یو کے ستارے ان دنوں گردش میں تھے۔ یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلا سکا، نیا پولیس چیف کولنز ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر تھا۔ شہر کی حالت پر اس کا دل کڑتا تھا۔ جہاں تک اس کا بس چل رہا تھا، وہ سخت کارروائیاں کر رہا تھا، اس نے فاشی کے بہت سے اڈے، کئی بریور بڑاؤ بہت سے سیلون بند کرادیئے تھے۔

جتنا برادرز بھی اس کی کارروائیوں سے نہیں بچ سکے تھے۔ شراب کے کاروبار میں انہوں نے تو حد ہی کر دی تھی۔ شہر میں الکحل کی سب سے بڑی مقدار استعمال کرنے کے لائسنس ان کے پاس تھے جو انہوں نے نہ جانے کس طرح بہت پہلے حاصل کر لئے تھے اور انہوں نے شراب کی تیاری کو بہت ہی چلتی سطح تک پہنچا دیا تھا۔

طلل اٹلی کے علاقے میں جس اطالوی کے گھر میں بھی کوئی خالی گیاراج یا قاتو کرہ تھا، انہوں نے اسے اپنے شراب کے کاروبار میں شریک کر لیا اور اس کے گیاراج یا خالی کمرے میں شراب کی بجلی لگوا دی۔ لعل اٹل کے بارے میں ان دنوں یہ مشہور تھا کہ اس کی بعض گلیوں سے تو محض گزرنے پر ہی نشہ ہو جاتا تھا۔ نیا پولیس چیف کولنز اس صورتحال پر بھی قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے جس پولیس فورس سے کام لینا تھا، اس میں سے بیشتر کرپٹ تھی۔ انتظامیہ اور زیادہ تر سرکاری اداروں کا یہی حال تھا۔

بہر حال جان نور یو کی بریوری پر ایک رات اچانک چھاپہ پڑ گیا گوکہ اس کے خبر اور وظیفہ خواہ ہر جگہ موجود تھے لیکن اس چھاپے کے بارے میں کوئی بھی اسے پیشگی خبردار نہیں کر سکا۔ کولنز خود اس چھاپے کی عمرانی کر رہا تھا۔ اسے سرکاری طور پر بند کی گئی ایک بریوری میں باقاعدہ پہلے ہی کی طرح شراب بننے دیکھ کر اتنا خفا آیا کہ اس نے باہر عمرانی پر کھڑے دونوں پولیس اہلکاروں کی پیشیاں اور بیچ خود کھینچ کر اتارے اور

انہیں دودھ چھڑک کر سیدھے اس نے متعلقہ پولیس اسٹیشن کے انچارج کو بھی اسی وقت معطل کر دیا اور اس کی جگہ اپنے ہی جیسے ایک دیا انتظار پولیس آفیسر کیپٹن مائیکل کو تعینات کیا۔

اس کارروائی میں الگھن اور جان نور یو بھی پکڑے گئے۔ جب وہ دونوں پولیس کی حراست میں ہیڈ کوارٹرز پہنچے تو انہوں نے برٹین کو بھی وہاں موجود پایا۔ پتہ چلا کہ وہ بھی پکڑا وھڑکی زد میں آ گیا تھا لیکن اسے محض پوچھ گچھ کیلئے لایا گیا تھا۔

وہ بے لکری سے بیٹھ جاتا ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا، اسکے ساتھ کوئی خاص سختی نہیں برتی جا رہی تھی۔ الگھن اور جان نور یو کے دل میں اسی وقت تلک بیٹھ گیا کہ جان کی بریوری کے بارے میں برٹین نے خبری کی تھی، وہ غداری کر رہا تھا اور دوست کے روپ میں دشمن تھا۔ وہ آستین کا ساٹب ثابت ہو رہا تھا۔

پولیس چیف کولنز اور کیپٹن مائیکل اس وقت وہاں نہیں تھے۔ برٹین نے اپنی جیب سے پیسے دے کر بہت سے پولیس والوں کیلئے باہر سے کھانا بھی منگوا دیا، وہ یوں مطمئن اور بے فکر دکھائی دے رہا تھا جیسے کچک پر آیا ہو۔ الگھن اور جان نور یو کو یقین ہو گیا کہ اسے محض دکھاوے کیلئے پکڑا گیا تھا۔

الگھن کی تو دوسرے روز ضمانت ہوگئی۔ اس پر کوئی خاص سنگین الزام نہیں تھا، برٹین کو یہی سمجھو دیا گیا لیکن جان نور یو کو ایک سال قید کی سزا ہوگئی۔

جان نور یو کا فیصلے سے برا حال تھا۔ وہ تو نفیست تھا کہ الگھن ان سارے کاروبار کو سنبھالنے کیلئے باہر موجود تھا ورنہ سب کچھ ٹھپ ہو جاتا۔ جان نور یو کے جرائم کے مقابلے میں ایک سال کی سزا کچھ بھی نہیں تھی لیکن کاروبار کی عمرانی کیلئے اگر ایک بھی سربراہ موجود نہ ہوتا تو کاروبار کے ٹھپ ہونے کیلئے ایک سال کافی تھا۔

الگھن نے جیل میں جان نور یو سے ملاقات کی۔ جیل میں بھی انہیں سر جوڑ کر مشورہ کرنے کا موقع مل گیا، واپس آ کر الگھن نے ایک بار پھر نیویارک سے تیل کو بلا بھیجا۔ ایک بار پھر اس کی ضرورت آن پڑی تھی۔ مقصد وہی تھا جس کیلئے اسے پہلے زحمت دی گئی تھی۔ اس وقت وہ بگ ہم کیلئے فریڈ اہل جل بن کر آتا تھا۔

اسی دوران جتنا برادرز کا سرپرست مائیک مرو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ کینسر نے آخر کار اس کی جان لے لی، اسکی آخری رسوم بڑی شان و شوکت سے انجام پائیں۔ ہزاروں افراد اس کے جنازے میں شریک ہوئے جن میں خاصے بڑے سیاستدان اور سرکاری عہدیدار بھی موجود تھے۔

الگھن بھی تدفین میں شریک ہوا۔ جان نور یو نے جیل ہی میں بیٹھے بیٹھے ہدایت دے کر اس کی قبر کیلئے ہزاروں ڈالر کے پھول بھجوائے۔ الگھن کی طرف سے بھی ہزاروں ڈالر کے پھول آئے تھے۔ مائیک مرو کا جنازہ دیکھ کر لگتا تھا کہ شہر کا کوئی بڑا آدمی مر گیا ہے۔ سیکڑوں گاڑیاں اسکے جنازے کے ساتھ چل رہی تھیں جبکہ اس زمانے میں گاڑیاں بہت کم لوگوں کے پاس ہوتی تھیں۔

تدفین ہو چکی اور پادری دعائیں پڑھ چکے تو جتنا برادرز مہمانوں کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے انہیں رخصت کرنے لگے۔ الگھن بھی رخصت ہونے کیلئے مصافحہ کرنے آیا تو جتنا برادرز نے اسے رکنے اور ایک طرف کھڑے ہونے کا اشارہ کر دیا۔ ان کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ الگھن سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام اسخو اور دوسرے کا مائیک تھا۔ جتنا ان کا خاندانی نام تھا۔ ویسے تو ان کا ایک تیسرا بھائی ٹونی بھی تھا لیکن وہ زیادہ تر پس منظر میں ہی رہتا تھا، فیملی میں اس کا نام اتنا نمایاں نہیں تھا۔

تمام مہمان رخصت ہو چکے تو اسخو نے الگھن کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہارے آدمی نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

وہ الگھن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ تینوں بھائیوں میں اسخو سب سے زیادہ خوشخوار اور غصہ ور تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے یہ بات کہنے کیلئے مائیک مرو کے قبر میں اترنے کا انتظار تھا۔

الگھن نے بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے پلکیں جھپکائے بغیر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ اب ہمارا آدمی نہیں رہا۔“

اسخو کو گویا خفیف سا دھچکا لگا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی کی جگہ ہلکی سی حیرت جھلک آئی۔

”تمہارا مطلب ہے کہ اگر اسے سزا دی گئی تو تم اور جان نور یو اسے بچانے یا اس کی موت کا بدلہ لینے کی کوشش نہیں کرو گے؟“ اسخو نے تصدیق چاہی۔

”ہرگز نہیں!..... جان نور یو تو شاید خود ہی کی وجہ سے جیل میں ہے، ہم تو خود برٹین کے بارے میں ایک اہم فیصلہ کر چکے ہیں۔“ الگھن نے تقریباً صاف طور پر اسے بتا دیا۔ اسخو اس کا مطلب آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔

”ہم ہر کارروائی میں تمہارے شانہ بٹانہ ہیں۔“ اسخو نے دوبارہ اس سے یوں ہاتھ ملا دیا جیسے ان کے درمیان کوئی معاہدہ طے پارا ہو۔

”اس کا گروہ خاصا بڑا ہے۔ اس میں بہت سے قاتل اور گن مین ہیں۔ ہمیں رول مل کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہنا پڑے گا۔“ الگھن نے احساس دلایا۔

”اگر تم نے اور جان نور یو نے اس کی سرپرستی ترک کر دی ہے تو پھر ہم اس کے سارے گینگ کو ڈن کر سکتے ہیں۔“ اسخو کے لہجے میں اسکی مخصوص فحاشی جھلک آئی۔

الگھن نے مدبرانہ سے انداز میں سر ہلایا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر واپس روانہ ہو گیا۔

10 نومبر 1924ء کو پیر کے دن ساڑھے گیارہ بجے برٹین اپنی فلاور شاپ میں موجود تھا۔ وہ ایک خاصی بڑی دکان تھی جس میں گاؤنٹرز اور شوٹیکوں میں سیلفے اور قرینے سے طرح طرح کے پھول مختلف انداز میں سجے ہوئے تھے۔

ایک تنگ سارا ست دکان کے پچھلے حصے کی طرف جاتا تھا جو ایک طرح کا ورک روم تھا، وہاں پھولوں اور ٹینوں کی کاٹ چھانٹ اور گلہ ستوں وغیرہ کی تیاری کا کام ہوتا تھا، وہیں سے تنگ سا مائیک مل کھاتا زینا اوپر جا رہا تھا، اوپر چھوٹا سا آفس تھا جس میں دکان کا منیجر بیٹھا تھا جو اکاؤنٹینٹ کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

برٹین اس وقت ورک روم میں تھا اور بڑی محبت اور انہماک سے کچھ پھولدار ٹینوں کی کاٹ چھانٹ اپنے ہاتھ سے کر رہا تھا۔ ایک سیاہ فام ملازم دکان کے فرش کی صفائی کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ تین آدمی دروازہ کھول کر اندر آئے۔ ان میں سے ایک دراز قد اور کٹن شیو تھا، دو ڈرا چھوٹے قد کے تھے لیکن کرحت صورت اور سخت جان معلوم ہوتے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر برٹین خود ہی سامنے والے حصے میں آ گیا اور حسب عادت اس نے انہیں اس سے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس کے دوسرے ہاتھ میں بڑی سی پیٹنی اور کچھ پھول تھے۔ دراز قد ابھی سہیل تھا۔ اس نے برٹین کا صرف ہاتھ ہی نہیں بلکہ بازو بھی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسرے دو، جتنا برادرز کے آدمی تھے، ان کے نام جون اور البرٹ تھے۔ برٹین انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ انہوں نے پھرتی سے اپنے رویو اور نکال لئے۔

دوسرے ہی لمحے اندر موجود ملازم نے پے در پے پانچ قانون کی آواز سنئی۔ دو گولیاں برٹین کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ دو گردن سے گزر گئیں اور پانچویں نے اس کا بجز ایک طرف سے آڑوا، ایک لمحے کے توقف کے بعد جیسے فائر کا دھماکا بھی گونجا۔ برٹین کی موت کو یقینی بنانے کیلئے یہ گولی اس کی کھوپڑی میں ماری گئی تھی۔ (جاری ہے)



دکان کے پچھلے حصے میں اس وقت تین اور ملازمین بھی موجود تھے لیکن وہ فائرنگ کی آواز سنتے ہی پچھلا دروازہ کھول کر بھاگ گئے۔ صرف صفائی کرنے والے سیاہ قام ملازم نے درمیانی دروازہ کھول کر ڈرتے ڈرتے دکان کے اگلے حصے میں بھاگا۔ اس نے برہنہ کوخون میں لت پت، فرش پر پڑے دیکھا۔ اسی لمحے تین آدمی دکان سے باہر جا رہے تھے

# الکھون

ترجمہ: محمود احمد مودودی

قسط: 10

جرائم کے بادشاہ کی انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز پہلی کہانی  
ماہی کا ایک کڈا جو کسی نہ کسی روپ میں جنم لیتا رہتا ہے

اندازہ لگایا ہے۔ ان کے خیال میں برہنہ کے گروہ کے کوڑھ مفر اور خر دماغ لوگ قیامت تک بھی اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ لیکن یہ ان کے اندازہ کی غلطی تھی۔

برہنہ کے گروہ نے الکھون اور جان نور یو کو قتل کرنے کی ٹھان لی تھی۔ جان نور یو تو اس لئے قتل کیا کہ وہ بیرون ملک دورے پر نکل گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے شہر میں موت اسے



ذمہ داری بھری ہے۔

جنوری 1925ء میں مریج الکھون کی گاڑی ایک سڑک سے گزر رہی تھی کہ عقب سے ایک بڑی سی کار تیزی سے آئی اور الکھون کی گاڑی کے آگے آ کر اس طرح تڑجی ہو کر رک گئی کہ الکھون کے ڈرائیور کو گاڑی

فٹ پاتھ کے قریب کر کے روکنی پڑی۔ جس گاڑی نے انہیں رکنے پر مجبور کیا تھا، اس کی کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور نمبر پلٹ کو کسی چیز سے چھپا دیا گیا تھا۔ اس گاڑی سے گلیوں کی بو چھڑا ہونے لگی۔ الکھون کی گاڑی کے شیشے پکنا چور ہو گئے اور گاڑی میں متعدد سوراخ ہو گئے۔

الکھون اس لئے قتل کیا کہ وہ اس گاڑی میں تھا ہی نہیں۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چند منٹ پہلے ہی راستے میں گاڑی رکوا کر اپنے ایک ریٹائرمنٹ کا معائنہ کرنے کے لئے اتر گیا تھا اور اس نے گاڑی کو آگے روانہ کر دیا تھا۔

گاڑی میں بچھلی سیٹوں پر اس کے دو کزن اور آگے ڈرائیور تھا۔ اسکے کزن بھی مجروحان طور پر بالکل محفوظ رہے۔ انہیں خراش تک نہیں آئی۔ پہلے فائر کی آواز سنتے ہی وہ سیٹوں سے نیچے گر کر فرش سے چپک گئے تھے۔

ڈرائیور نے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس لئے ایک گولی اس کی پیٹھ میں لگ گئی۔ اس کے فوراً بعد ہی وہ گاڑی کی اوٹ میں اوندھا لیٹ گیا تھا۔ اس لئے مزید کوئی گولی کھانے سے قتل نہیں۔ گاڑی کی حالت دیکھنے کے بعد پولیس کو بھی الکھون کے کزنوں کے قتل جانے پر حیرت ہوئی تھی۔

اس واقعے میں الکھون کا کچھ بگڑا تو نہیں۔ لیکن وہ اندر سے ہل کر رہ گیا۔ اس سے پہلے نہ جانے کیوں وہ کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا شکار ہو گیا تھا اور محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کی یہ خوش فہمی رعب ہو گئی۔

فوراً ہی اس نے خصوصی آرڈر پر ایک غیر معمولی کیڈلک تیار کرائی۔ اس کی تیاری میں خاص اسٹیل اور پلٹ پروف شیشہ استعمال کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے الکھون کے پاس جو کیڈلک سیڈن تھی، اس کا وزن دو ٹن اور قیمت سات ہزار ڈالر تھی مگر اب اس نے اپنے لئے جو خاص پلٹ پروف گاڑی تیار کرائی تھی، اس کا وزن سات ٹن اور قیمت بیس ہزار ڈالر تھی۔

یہ اس کی زندگی کی پہلی پلٹ پروف گاڑی تھی۔ اس کے بعد اس نے زندگی بھر پلٹ پروف گاڑیوں میں ہی سفر کیا۔ اس واقعے نے جان نور یو کو بھی قدرے ہوشیار ہونے پر مجبور کر دیا لیکن اتنا نہیں جتنا اسے ہونا چاہئے تھا۔

تقریباً دو ہفتے بعد وہ اپنی ٹکن میں بیوی کے ساتھ گھر واپس آ رہا تھا۔ پچھلے دو تین ہفتوں کے دوران اس نے اپنے کچھ ضروری کام منٹائے تھے جبکہ اس کی بیوی نے اس دوران بہت سی شاپنگ کر لی تھی۔ پھر وہ اسٹے گھر کی طرف واپس روانہ ہوئے تھے۔

جان نور یو ایک وسیع اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ اس کی گاڑی گلی میں داخل ہوئی تو اسے اندازہ نہیں ہوسکا کہ کوئے پر، اس کے اپارٹمنٹ کی سیدھ میں ایک طرف کو ایک کیڈلک کس مقصد سے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کیڈلک ایک محفے سے وہاں اسی طرح خنجر سے انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔

گاڑی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے رکی تو اس کی بیوی اینا نے شوہر کے اترنے کا انتظار نہیں کیا اور مختلف چیزوں کے کئی ڈبے دونوں بازوؤں پر اٹھائے عمارت کی لابی کی طرف چل دی۔ ان کا اپارٹمنٹ سامنے ہی چند میز بیچوں کی بلندی پر تھا۔

عمارت کی لابی میں پہنچ کر اینا نے گوم کر دیکھا، اس کا شوہر بھی گاڑی سے اتر چکا تھا اور اس کے بازوؤں پر بھی بہت سے ڈبے تھے۔ ان میں بھی اینا ہی کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ جان نور یو پاؤں سے گاڑی کا دروازہ بند کر چکا تھا اور اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا جب اینا نے دور سے دیکھا کہ کوئے پر کھڑی ہوئی سرخی کیڈلک سے دو آدمی تیزی سے اترے تھے۔

ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں شاٹ گن تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں اعشاریہ چار پانچ کا بھاری ریواور۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے جان نور یو کے پوری طرح کھلی جگہ میں آئے کا انتظار نہیں کیا اور فوراً ہی فائرنگ شروع کر دی۔

جان نور یو کی گاڑی اسکی ڈھال بن گئی۔ فوری طور پر اسے تو کوئی گولی نہیں لگی لیکن گلی میں آتے جاتے، پاس پڑوں کے دو افراد گولیوں کی زد میں آ گئے۔ اینا ڈرا دور سے یہ منظر دیکھ رہی تھی اور دہشت سے اپنی جگہ بت بین کر رہی تھی۔ اس کا منہ پیچھے کے لئے کھلا تھا لیکن پیچ برآمد نہیں ہو سکی تھی۔

جان نور یو نے فوری طور پر سارے پکٹ اور ڈبے وچیں پیچھے اور تیزی سے گھر کی طرف دوڑا۔ اس کی ٹانگیں چھوٹی تھیں مگر موت کے خوف نے اسے برق رفتاری سے دوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ صرف چھ قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ کھلی جگہ میں پہنچ گیا یعنی صاف طور پر نشانے پر آ گیا۔

برہنہ کے گروہ کے جس آدمی کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی اس کا نام ویس تھا۔ ریواور والا مورمان تھا۔ ڈینی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے بیٹھا تھا۔ مورمان کے ریواور سے لگی ہوئی گولی جان نور یو کے بازو میں لگی جس نے اسے گھما دیا۔ اب وہ لٹے قدموں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی گن نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن اسی دوران ویس کی شاٹ گن سے پورے چار قاتل ہوئے، ایک گولی جان نور یو کے جڑے اور گردن کا کچھ حصہ اڑاتی ہوئی گزری۔ تین گولیاں اس کے سینے اور پیٹ میں لگیں۔ مجموعی طور پر اسے پانچ گولیاں لگیں۔ وہ سڑک پر گر گیا۔

مورمان دوڑ کر آیا اور اس نے اپنے ریواور کی ٹال اس کے سر پر رکھ دی۔ بدمعاشوں اور دہشت گردوں کے گروہوں کے پیشہ ور، سفاک قاتل اور ماہر نشانہ باز جب کسی کو ہدف بناتے تھے تو اسے خواہ مخواہ ہی

لیکن وہ ان کے چہرے نہیں دیکھ سکا۔ یہی مسئلہ پولیس کو بعد میں بھی درپیش رہا۔ قاتلوں کو کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ برہنہ نے دیکھا تھا مگر وہ مر چکا تھا۔ قاتل جب پھولوں کی دکان سے نکلے تو فٹ پاتھ کے ساتھ لگی ہوئی ایک کار ان کی خنجر تھی جس کا انہیں اشارت تھا۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات یہ تھی کہ وہاں چھ اور کاریں موجود تھیں جن کے انہیں اشارت تھے۔

وہ کچھ اس طرح سڑک پر آ گئیں کہ ٹریفک رک گیا۔ جب تک قاتلوں کو لے جانے والی کار عائب نہیں ہو گئی تب تک ان چھ کاروں نے ٹریفک روک رکھا تھا کہ کوئی اس کار کا تعاقب نہ کر سکے۔ جب وہ کار عائب ہو گئی جس میں تین افراد دکان سے نکل کر بیٹھے تھے تو یہ چھ کاریں بھی سیدھی ہو گئیں اور ٹریفک میں شامل ہو کر چند لمحوں بعد ادھر ادھر ہو گئیں۔

کچپٹن ہل اس کیس کا انچارج مقرر ہوا۔ وہ ایک دیانتدار پولیس آفیسر تھا۔ اس نے تفتیش کے سلسلے میں کافی بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ جس پر اسے شک تھا، اس نے ان تمام لوگوں سے پوچھ چکھی لیکن ہر ایک معصوم اور انجان بنا ہوا تھا۔ کچپٹن ہل کے پاس انہیں جھوٹا ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

برہنہ کے گروہ کے لوگ سخت خفے میں تھے۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر خطرناک اور خوفناک آدمی شامل تھا۔ وہ قسمیں کھا رہے تھے کہ برہنہ کے قتل کا بدلہ لیں گے۔ خود برہنہ بھی کوئی کم خطرناک آدمی نہیں تھا۔ اخبارات تو اسکے بارے میں صاف طور پر لکھ چکے تھے کہ وہ غیر بری طور پر پرائز روڈ لڈکا بادشاہ تھا۔ مگر پرائز روڈ لڈکا یہ بادشاہ اس وقت تک نہیں و تدفین کرنے والے ایک ادارے میں، ایک قیمتی تابوت میں لیٹا ہوا تھا اور اپنے منہ پر سے کبھی بھی نہیں اڑا سکتا تھا۔

دیانتدار میئر ڈیور ہیچ وہاں کھڑا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل تھا کہ سارے بدمعاشوں، قاتلوں، دہشت گردوں اور گروہ بازوں کو جیل میں ڈال دے یا شہر سے نکال باہر کرے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ برائی جب پھیل جاتی ہے، خوب طاقتور ہو جاتی ہے تو ایک عفریت کی طرح ہو جاتی ہے جو دیانتداروں کے قابو میں بھی نہیں آتا۔ تفتیش کے سلسلے میں اس نے بڑے سخت احکام جاری کئے تھے اور کہا تھا کہ پوچھ گچھ کے سلسلے میں اگر پولیس کسی بدمعاش کو حراست میں لینے کے لئے جائے اور وہ حراست کرے تو اسے موقع پر ہی کوئی بارودی جائے۔

اس حکم کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کسی بدمعاش کو بھلا حراست کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ اطمینان سے پولیس کی تحویل میں جاتا تھا، پوچھ گچھ کے مراحل سے گزرتا تھا۔ اپنی بے گناہی کی جی یا جھوٹی شہادتیں پیش کرتا تھا اور اس کا وکیل چند ہفتوں کے اندر اندر اسے چھڑا کر لے جاتا تھا۔

آخر کار دیانتدار پولیس چیف کولنز کو بھی شکست خوردہ سے انداز میں کہنا پڑا۔ ”قاتل صرف اسی صورت میں پکڑے جاسکتے ہیں کہ قسمت ہم پر غیر معمولی حد تک مہربان ہو جائے یا پھر ہمیں غیر معمولی اختیارات حاصل ہو جائیں۔“

چونکہ اس طرح کا کوئی مجرّمہ ردفا نہیں ہوسکا اسلئے شہر کے حالات وہی رہے۔ شراب کھتی رہی، ٹیکس چوری کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا رہا، گولیاں چلتی رہیں، بدمعاش ایک دوسرے کو، یا پھر شریف شہریوں کو سبق سکھاتے رہے۔ کبھی کسی گندے نالے میں، کبھی کسی گندری گلی میں کوئی لاش ملتی رہی۔ سب کچھ جوں کا توں رہا۔ شہر کا نظام چل رہا۔ زندگی اسی حال میں رواں دواں رہی۔ وقت گزرتا رہا۔

☆.....☆.....☆

جان نور یو صرف تین ماہ جیل میں رہا۔ سزا کے طور پر یہ عرصہ چھ ماہ شمار ہوتا تھا۔ اس کی سزائیں تخفیف بھی ہو گئی تھی اور پھر بہت نرم شرائط پر وہ جیل پر رہا ہوا گیا۔

اس دوران ایک خاص واقعہ یہ رونما ہوا کہ پولیس نے ان کا کلب ”فورڈ یوسر“ مستقل بنیادوں پر بند کر دیا۔ پولیس کو کچھ ایسی شہادتیں مل گئی تھیں جن کی بنیاد پر وہ کلب کو بند کرانے میں کامیاب ہو گئی حالانکہ اب وہاں بیشتر معیوب دھندے بند ہو گئے تھے۔ وہ صرف الکھون اور جان نور یو کے ہیڈ آفس کا کام دے رہا تھا۔

اس کے بند ہونے سے الکھون کے لئے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے وہاں سے صرف دو بلاک کے فاصلے پر ایک عمارت کرائے پر لی۔ اس پر جو بورڈ آویزاں کیا گیا اس پر لکھا تھا:

ڈاکٹر اسے براؤن، ایم ڈی

اس کے اندر ہیچ کرسی لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے ڈاکٹر کا آفس ہے۔ ایک بڑا سا وینٹک روم تھا جس میں انتظار کرنے والوں کیلئے بہت سی کرسیاں اور ریپشیشنسٹ کی میز بھی تھی۔ ایک تپانی پر پانے کے رسالے بھی رکھے تھے۔ ڈاکٹر کے کمرے میں، محافے کے آلات کے علاوہ دیوار پر فریم شدہ ڈگری بھی آویزاں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہاں کوئی ڈاکٹر مریضوں کو دیکھنے نہیں آتا تھا۔ وہ درحقیقت الکھون اور جان نور یو کا ہیڈ آفس تھا۔

تمام ضروری کام وہیں ہوتے تھے۔ نئے پرانے گاؤں سے میل ملاقات، سووے بازیاں، حساب کتاب، مال کے نمونوں کی چیکنگ، سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ گوڈک اس آفس کا مختصر تھا۔ جان نور یو نے ایک بار پھر اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ الکھون نے اس کی غیر موجودگی میں سب کچھ سنبھالے رکھا۔ کام رکنے نہیں دیا، حتیٰ کہ ہیڈ آفس بند ہونے کے بعد اس کا متبادل بھی تیار کر لیا۔ اس نے صاف طور پر اعتراف کر لیا کہ اگر وہ جیل سے باہر ہوتا تو شاید یہ سب کچھ وہی نہ کر پاتا۔

جیل سے باہر آتے ہی وہ بیوی کو ساتھ لے کر بہت سے دور دراز تفریحی مقامات کی سیر کو نکل گیا۔ جیل میں گوڈک اس نے کوئی بے آزاری نہیں اٹھائی تھی لیکن اس کے لئے کچھ عرصے جیل میں رہنا ہی گویا بہت کوفت کی بات تھی چنانچہ اب وہ اس کی حلوائی کرنے لگن کھڑا ہوا تھا۔

اس دوران دوسری خاص بات یہ ہوئی تھی کہ برہنہ کے گروہ نے اندازہ لگ لیا تھا کہ برہنہ کو الکھون اور جان نور یو نے مروا دیا تھا۔ مگر الکھون اور جان اس بات سے خبر نہ تھے کہ برہنہ کے گروہ نے یہ

گولیاں لگ پائیں لیکن وہ اس کی موت کو سو فیصد یقینی بنانے کیلئے اسے سر پر گولی مارنے کی کوشش ضرور کرتے تھے جو عموماً آخری ہوتی تھی۔ اس وقت مورمان بھی گویا اپنا کام سو فیصد یقینی طور پر مکمل کرنے آیا تھا لیکن اس نے ٹھیکہ دیا تو اسے یہ چلا کہ اس کا ریواور خالی ہو چکا تھا۔ ویس کی شاٹ گن بھی خالی ہو چکی تھی۔

انہوں نے جلدی سے اپنی گنیں دوبارہ لوڈ کرنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران ایک وین ڈرائیوری سے موٹر کاٹ کر گلی میں داخل ہوئی۔ اسی لمحے ڈینی نے بھی جلالت آمیز سے انداز میں انہیں ہارن دیا۔ وہ کچھ تشویش کا شکار ہو گئے اور گنیں دوبارہ لوڈ کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے گاڑی کی طرف واپس بھاگے۔

جان نور یو اپنے اپارٹمنٹ کی طرف محفے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ چہرہ بگڑا ہوا اور خون میں اتھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ ویس اور مورمان پھرتی سے گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔

اینا اس وقت بھی دہشت زدہ سے انداز میں منہ کھولے اپنی جگہ کھڑی، پچھلی آٹھنوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ گلی میں داخل ہونے والی وین والٹر کی تھی۔ وہ ایک لاٹری شاپ کا مالک تھا اور اس وقت اپنی لاٹری وین میں ہی آ رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا اور کافی حد تک صورتحال کو سمجھ گیا۔

وہ ایک دلیر آدمی تھا۔ اس نے جائے وقوعہ سے تیزی سے روانہ ہونے والی کیڈلک کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے اور اس پر کوئی نمبر پلٹ نہیں تھی۔

وہ زیادہ دیر گاڑی کا تعاقب جاری نہیں رکھ سکا۔ گاڑی بہت تیز رفتار تھی۔ بہت جلد اسے پیچھے چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ اس کی وین بڑی تھی۔ وہ کئی جگہ چند لمحوں کے لئے پھنس گیا اور پھر اس کی وین رفتار میں بھی کیڈلک کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

اسی دوران اپنا نور یو گویا کسی دہشت ناک خواب سے چوکی اور اپنے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے ڈبے وغیرہ پھینک کر دوڑ کر اپنے شوہر کے پاس آئی۔ وہ اس کی بگلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹتی ہوئی عمارت کی لابی میں لے گئی جو اس وقت باہر کے مقابلے میں بالکل محفوظ جگہ معلوم ہو رہی تھی۔

کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔ جلد ہی دو پولیس والے اور ایک ایسی پولیس آن پہنچی۔ جان نور یو کو جلدی سے اسپتال پہنچایا گیا۔ کسی نے الکھون کو بھی جان نور یو کے شدید زخمی ہونے کی اطلاع دے دی۔ وہ سخت دہشت زدگی کے سے عالم میں اسپتال پہنچا۔

وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ ”یہ گینگ کی حرکت ہے۔۔۔۔۔ یہ گینگ کی حرکت ہے۔۔۔۔۔“

اسپتال میں اسسٹنٹ انسٹیٹ انارنی بھی موجود تھا۔ اس کا نام جون سبارو تھا۔ سرکاری عہدیدار ہونے کے ساتھ ساتھ فنی حیثیت میں وہ تحقیق و تدقیق کرنے والا ایک ادارہ بھی چلاتا تھا۔ گروہوں کی آپس کی لڑائیوں میں مرنے والے زیادہ تر کارندوں کی تصفیحات اور تدفین اسی کا ادارہ کرتا تھا۔

اس نے الکھون کی بڑبڑاہٹ سن لی اور پوچھا۔ ”تمہارا اشارہ کس گینگ کی طرف ہے؟“

تب الکھون کو احساس ہوا کہ اس سے بے احتیاطی سرزد ہو گئی ہے۔ یہ چیز گروہوں کے ڈسپلن یا ان کی ”اخلاقیات“ کے خلاف تھی۔ وہ لوگ اپنے اوپر حملہ کرنے والوں کے بارے میں کبھی کوئی خیال ظاہر نہیں کرتے تھے۔ وہ اگر حملہ آوروں کو پہچان لیتے تھے تب بھی ان کا نام نہیں لیتے تھے اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی اشارہ دیتے تھے۔ وہ اپنے جھگڑے خود ہی منٹاتے تھے۔ اپنے حساب خود ہی بے باق کرتے تھے۔

اپنے ایسے معاملات میں پولیس کو ملوث کرنا وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ جون سبارو کے پوچھنے پر الکھون کا چہرہ فوراً سیاہ ہو گیا اور وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو کسی گینگ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ تم کسی گینگ کی بات کر رہے ہو؟“

اس کے بعد جون سبارو نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ جان نور یو کی حالت خراب تھی۔ اس کے پیچھے کی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال ڈاکٹر اینی ہی کوشش کر رہے تھے۔ جرائم پیشہ گروہوں کے قاتل اور نشانے باز زیادہ تر سسلی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بارے میں ایک بات یہ بھی مشہور تھی کہ وہ اپنی ٹکنوں میں جو گولیاں استعمال کرتے تھے انہیں پہلے بیاز اور لہسن کے عرق میں ڈبو کر خشک کر لیتے تھے۔ اس طرح ان میں یہ خاصیت پیدا ہو جاتی تھی کہ اگر گولی کھانے والا شخص فوری طور پر نہیں مرتا تھا تب بھی اس کے زخموں میں انٹیکشن ہو جاتی تھی اور زخموں کے جگڑنے کی وجہ سے اس کے مرنے کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔

شروع میں ڈاکٹر بھی اس خیال سے متفق تھے لیکن بعد جب طب نے ترقی کی تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فیضول ہاتھ نہیں۔ اگر گولیوں پر بیاز اور لہسن کا عرق لگایا بھی جاتا تو فائز کرتے وقت رگڑے اس کے اثرات خالص ہو جاتے تھے اور اگر اثرات باقی رہتے تب بھی ان سے انٹیکشن ہونے کا اتنا ہی خطرہ تھا جتنا دوسری چیزوں سے تھا۔

جان نور یو ہوش میں تھا اور سخت اذیت میں تھا۔ پانچ گولیاں کھا کر بھی وہ مرا نہیں تھا۔ اسے بھی ٹیکر ستار تھی کہ اس کے زخموں میں زہر پھیل جائے گا۔ وہ ڈاکٹروں سے استعفا کر رہا تھا کہ سسلی میں استعمال ہونے والے طریقے کے مطابق اس کے زخموں کو چھتے ہوئے لال لوہے سے داغ دیا جائے۔ کہا جاتا تھا کہ جن زخموں کو داغ دیا جائے ان میں زہر نہیں پھیلتا اور وہ ہیکٹرین کا سبب نہیں بنتے۔ تاہم ڈاکٹروں نے اپنے طریقے پر علاج جاری رکھا۔

پولیس حملہ آوروں کو پکڑنے کیلئے بڑی بھاگ دوڑ کر رہی تھی تاہم جان نور یو اور اس کی بیوی نے اس سلسلے میں کچھ بتانے، کسی کو پچھانے یا کسی پر خشک شے کا اظہار کرنے سے انکار کر دیا۔

پولیس نے جان نور یو کی گلی میں زخمی ہونے والے راہ گیروں اور پڑوسیوں کے بیانات کی روشنی میں مورمان، ویس اور ڈینی کو حراست میں بھی لے لیا لیکن جب جان نور یو اور اس کی بیوی نے خود کھد دیا کہ وہ انہیں نہیں پہچانتے، تب پولیس کو انہیں چھوڑنا پڑا۔ اس دوران زخمی گواہوں کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ ان لوگوں کو شناخت کر کے ایک نہایت خطرناک معاملے میں ملوث ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی ڈوناؤڈول ہو گئے اور شناخت پر پڑے کے موقع پر انہوں نے بے یقینی کا اظہار کر دیا۔ یوں پولیس کی ساری بھاگ دوڑ اور مستعدی ا کا رت تھی۔

اسی رات دو بجے کے قریب دو گاڑیوں میں چدرہ افرا ہسپتال آن پہنچے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جان نور یو کے دوست ہیں اور اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ نرسوں کی سپرنٹنڈنٹ نے انہیں جان نور یو کے پاس جانے کی اجازت نہیں دی۔

اس نے انہیں بتایا کہ جان نور یو کی بیوی نے الکھون کے سوا کسی کو بھی جان نور یو کے پاس بھیجے سے منع کیا ہے۔ اس کے علاوہ جان سے ملنے کے لئے پولیس چیف کی اجازت بھی ضروری ہے۔ نرسوں کی سپرنٹنڈنٹ نے ان لوگوں کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ پولیس والے جان کے کمرے کے دروازے پر تعینات ہیں، اسکے علاوہ داخلے کے ہر دروازے پر پولیس والے موجود ہیں اور بہت سے پولیس والے راہداریوں میں یا ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ لوگ کچھ مایوس نظر آنے لگے اور واپس لوٹ گئے۔



دوسری صبح الیکھن کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ خود اسپتال میں رہنے کے لئے آیا۔ اس کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ جان نوری کی جان کے دشمنوں نے جب یہ سنا کہ وہ پانچ گولیاں کھا کر بھی زندہ تھا، تو وہ اسے ٹھکانے لگانے کی ایک اور کوشش کرنے آئے تھے مگر نرسوں کی سپرنٹنڈنٹ کی سختی کی وجہ سے ان کی یہ کوشش ناکام رہی تھی۔

برادر کا راج تھا۔ شکاگو کی اس پہلی مافیا ٹاپ جس میں یوں تو پانچ بھائی تھے لیکن دو بھائیوں، مائیک اور اسٹیلو کی وراثت زیادہ تھی۔ باقی بھائی عام طور پر پس منظر میں ہی رہتے تھے۔ کبھی کبھار کسی حوالے سے ان میں سے بھی کسی بھائی کا نام زیادہ نمایاں طور پر سامنے آ جاتا تھا اور کچھ عرصے بعد دوبارہ پس منظر میں چلا جاتا تھا۔

مائیک اور اسٹیلو قتل اور عورتوں کے ساتھ بہت برے سلوک کے کئی



جان نوری کے لئے اسپتال میں ایک سوئٹ مخصوص کیا گیا تھا جو تین کمروں پر مشتمل تھا۔ سچ کے کمرے میں وہ خود تھا۔ برابر کے کمرے میں اس کی بیوی تھی۔ دوسری طرف والے کمرے میں آکر الیکھن نے پروا ڈال لیا۔ وہ اپنے سابق باپ، پائزر اور دوست کی جان کی حفاظت خود کرنا چاہتا تھا۔ گو کہ اس مقصد کے لئے ان کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں تھی لیکن الیکھن کو احساس تھا کہ دو بتی بھانے اور اپنی جذباتی وابستگی ظاہر کرنے کا اس سے زیادہ خاص موقع کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

اسپتال میں جان نوری کا تین کمروں کا سوئٹ، پولیس کی بھاری نظری، طبی عملے کی مستعدی اور بھاگ دوڑ وغیرہ دیکھ کر کچھ ایسا لگتا گزرتا تھا جیسے ریاست کے گورنر کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا تھا اور وہ اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔

جان نوری نے جیل بھی اسی شان و شوکت اور ٹھانٹ باٹ سے کاٹی تھی۔ وہاں بھی اسے ایک وسیع کمرہ ملا تھا جس کے سامنے چھوٹا سا برآمدہ بھی تھا، جس میں جھولا جھولنے والی دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ہاتھ روم کمرے سے ملحق تھا۔ کمرے میں مختصر فرنیچر موجود تھا۔

کھڑکیوں میں موٹی سلاخیں تو موجود تھیں لیکن جان نوری کو اپنے خراج پرلوے کی بلٹ پروف جالیاں لگوانے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کا کھانا گھر سے آتا تھا اور اس کی بیوی کو تھانی میں بھی اس سے ملنے کی اجازت تھی۔ اس نے اپنے نجی گاڑی کے طور پر دو رینارڈ ڈپٹی شیرفوں کی خدمات حاصل کی تھیں جو سچ حالت میں باری باری جیل میں اس کے کمرے پر چہرہ دیتے تھے۔ جیل کا عملداس کے آرام اور تحفظ کا جتنا خیال رکھتا تھا، وہ ان تمام انتظامات کے علاوہ تھا۔

اسپتال میں تیسرے روز سے جان نوری کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ اس کے بعد روز بروز اس کی حالت بہتر ہوتی گئی۔

تین ہفتے بعد الیکھن اور ایاز برڈتی جان نوری کو گھر لے گئے۔ ڈاکٹر تو ابھی اسے اسپتال سے ڈسچارج کرنے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن الیکھن کا کہنا تھا کہ باقی علاج گھر پر ہوتا رہے گا۔ ڈاکٹر کافی بیز ہوئے لیکن آخر انہیں خاموش ہونا پڑا۔ الیکھن کا خیال تھا کہ جان نوری کی اسپتال میں موجودگی کی وجہ سے کبھی تاؤ کا شکار تھے۔ اب اس کی حالت اس قابل تھی کہ اسے گھر پر رکھا جاسکتا تھا۔

گھر پر بھی جان نوری کی حفاظت کیلئے بہت سے انتظامات کرنا پڑے لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ تین ماہ بعد وہ عمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔ جیڑے اور گردن پر گولی لگنے کی وجہ سے اس کا چہرہ قدرے نیڑھا ہو گیا تھا اور کچھ پٹھے کھینچ کر رہ گئے تھے۔ تاہم مجموعی طور پر اس کی صحت تسلی بخش تھی۔ اس دوران جان نوری کو الیکھن پر مزید کوئی حملہ نہیں ہوا۔

پھر ایک روز جان نوری نے فون کر کے الیکھن کو گھر بلایا۔ الیکھن جب اس کے ہاں پہنچا تو اس کے وسیع ڈرائنگ روم میں اس کے وکیل بھی موجود تھے۔ بہت سی فائلیں اور کاغذات وغیرہ پتلی پر رکھے تھے۔

ری باتوں کے بعد جان بولا: ”میرے دوست! میں نے ایک اہم فیصلہ کیا ہے۔ میں سب کچھ تمہارے سپرد کر کے اٹلی واپس جا رہا ہوں۔ میری جتنی بھی زندگی باقی رہ گئی ہے، وہ میں وہیں گزاروں گا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ الیکھن بری طرح چونک اٹھا۔ جان کا یہ فیصلہ اس کے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور میں تمہیں اسکی مخالفت کی اجازت نہیں دوں گا۔“ جان نوری نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ اس کے قدرے مگرے ہوئے چہرے پر گہری آنچیدی گئی جس میں ہلکی سی افسردگی کی بھی آمیزش تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”میں نے زندگی میں بہت خون خرابہ دیکھ لیا۔ اب میری عمر بھی کچھ ایسی جوانی کی نہیں رہی۔ میں نے گولیاں چلانے کے احکام تو بہت دیئے ہیں اور بہت سے لوگوں کو اپنی عمرانی میں مروایا ہے۔ لیکن خود پانچ گولیاں کھانے کے بعد میں اندر سے مل کر رہ گیا ہوں۔“

وہ خاموش ہوا تو الیکھن جلدی سے بولا۔ ”ضروری نہیں کہ آئندہ بھی ایسا ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ایسا نہ ہو۔“ جان نوری بڑی سے بولا۔ ”ایک بات بہر حال طے ہے کہ کاروباری حالات روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوں گے۔ کاروبار میں پریشانیاں اور پیچیدگیاں آتی رہیں گی۔ میرے اعصاب اب ان مشکلات کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہے۔ ایسی دولت کمانے کا کیا فائدہ جس سے ہم لطف اندوز ہی نہ ہو سکیں۔“

اس بار وہ گہرا سانس لینے کے لئے خاموش ہوا تو الیکھن کچھ نہ بولا۔ جان نوری سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کاروبار میں سرفرٹی لینا خود اسی لئے قائم کیا تھا کہ زیادہ افراد اور زیادہ طاقت یکجا ہوگی تو ہم مشکلات اور خطرات کا مقابلہ زیادہ آسانی سے کر سکیں گے۔ میرا ارادہ اس اتحاد کو اور بھی وسعت دینے کا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم بہت سے لوگ مل کر بہت بڑی کاروباری سلطنت قائم کریں گے لیکن بہت جلد مجھے تجربہ ہو گیا کہ ہر پرائیمر جیسے انہیں ہو سکتا۔ اچھے دوست، اچھے پائزر اور اچھی بیوی قسمت سے ملتی ہے۔“

الیکھن نے ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”یہ بتاؤ، میرے لئے تمہاری ہدایات کیا ہیں؟“

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے جان نوری کے فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔ شاید جان نوری کے لہجے نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

”میں چاہوں گا کہ آئندہ دس سال تک تم مجھے تمام کاروبار کے مواقع میں سے بچیں فیصلہ اٹلی بھجواتے رہو۔“ جان نوری بولا۔ ”دس سال بعد اگر میں زندہ ہوا تو اس وقت کی صورت حال کے مطابق ہم اس معاہدے پر نظر ثانی کریں گے۔“

”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ تمہارا مطالبہ معقول ہے۔“ الیکھن نے بلاتل کہا۔

چنانچہ معاہدہ طے پا گیا۔ جان نوری کے وکیلوں نے کاغذات پہلے ہی تیار کر رکھے تھے۔ دونوں نے ان پر دستخط کر دیے۔ الیکھن کو اب جان نوری کو کوئی منافع نہیں تھا۔ فیصلہ تو پہنچا تھا لیکن عملی طور پر اب وہ کاروبار کا ایسا ہی مالک و مختار رہ گیا تھا۔

چند دن بعد جان نوری پولیو جیلا گیا۔ الیکھن نے اسے پندرہ مسلح افراد کے قافلے کے ساتھ روانہ کیا جنہیں جو کچھ کھنے نہایت مستعدی سے جان نوری کی حفاظت کرتا تھی اور اسے مکمل تحفظ کے ساتھ اس کے گھر تک چھوڑ کر آتا تھا۔

☆.....☆.....☆

گروہوں کے مابین حالات خراب ہونے کے بارے میں جان نوری کے اندازے درست تھے۔ ہر گزرتے ہوئے سال کے ساتھ شکاگو میں قتل و غارتگری بڑھتی جا رہی تھی۔ شکاگو کے علاقے لفل اٹلی پر جتنا

مقدموں میں ملوث ہوئے مگر ہر بار کسی نہ کسی طرح بچ گئے یا معمولی سزائے قید کاٹ کر باہر آ گئے۔ تقریباً پورے شکاگو کی پولیس گویا ان کی جیب میں تھی۔

الیکھن کے ساتھ مائیک اور اسٹیلو کے مراسم کا معاملہ عجیب تھا۔ وہ دونوں بھائی بہ ظاہر الیکھن کی مخالفت میں کوئی خاص قدم نہیں اٹھاتے تھے لیکن الیکھن کو بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ بہر حال اس کے دوست بھی نہیں تھے۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی قسم کا موقع ملنے پر اس پر پیچھے سے وار کر سکتے تھے۔ اس بات کا الیکھن کو یقین تھا۔

امریکا میں اٹلی اور سسلی کے باشندوں کا ایک باقاعدہ اتحاد قائم تھا اور اس اتحاد کی بادشاہت جتا فلی کے ہاتھ میں تھی۔ اس اتحاد کا باقاعدہ ایک صدر منتخب ہوتا تھا لیکن اس انتخاب کے لئے اٹلی اور سسلی کے خاص خاص اور سرخیل قسم کے لوگ ووٹ ڈالتے تھے۔ صدر کو یا ایک طرح کی چھوٹی سی متوازی حکومت کا سربراہ ہوتا تھا۔

الیکھن کے لئے یہ عہدہ بڑی کشش رکھتا تھا۔ یہ ایک ذہنی چھپی طاقت اور اختیارات کی علامت تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ کرنی الحال وہ صدر نہیں بن سکتا۔ ایک تو ابھی اس کی شخصیت اتنی قد آور نہیں تھی۔ دوسرے وہ خالص سسلی کا باشندہ نہیں تھا۔ وہ تو پیدا ہی امریکا میں ہوا تھا اور اس کے آباؤ اجداد بھی درحقیقت سسلی سے کچھ فاصلے پر رہا کرتے تھے۔ صدر کے انتخاب میں ”خالص“ سسلی کا باشندہ ہونا بھی اہم کردار ادا کرتا تھا۔

الیکھن نے دل ہی دل میں اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ کرنی الحال وہ اٹالین اور سسلیین باشندوں کی مافیا کی تنظیم کا صدر نہیں بن سکتا لیکن اس کی خواہش تھی کہ مائیک مرو کے انتقال کے بعد جو نیا صدر منتخب ہو وہ صحیح معنوں میں اس کا دوست اور حامی ہو۔ اس سے بھی بڑا فرق پڑ سکتا تھا اور اسے بڑی طاقت میسر آ سکتی تھی۔

اس نے جتا برادرز کے سامنے اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا اور جتا برادرز نے اسے اس ضمن میں اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اٹلی اور سسلی کے باشندوں کا اتحاد ”یونین“ کہلاتا تھا۔ یہ لفظ درحقیقت مافیا کا متبادل تھا۔ مافیا کے مقابلے میں یہ لفظ ذرا باعزت اور قانونی سا معلوم ہوتا تھا۔

الیکھن اپنے جس دوست کو ”یونین“ کا صدر بنوانا چاہتا تھا، اس کا نام انتھونی لمبارڈو تھا۔ وہ بظاہر بغیر کا تا جڑ اور بہت سی چیزوں کا کیشن ایکٹ تھا۔ یہ اس کے جائز اور قانونی کاروبار تھے۔ وہ خاصی حد تک ایک معزز آدمی تھا۔ سائڈ بزنس کے طور پر اس کا غیر قانونی شراب وغیرہ کا دھندہ بھی چل رہا تھا۔ تمام گروہوں پر اس کا اچھا اثر رسوخ تھا۔

اگر وہ یونین کا صدر منتخب ہو جاتا تو الیکھن کو اطمینان ہو جاتا کہ اب کوئی طاقت کا توازن اپنے حق میں کرنے اور اپنا پلڑا بھاری کرنے کے لئے یونین کو استعمال نہیں کر سکے گا اور نہ ہی یونین الیکھن کے دشمنوں کی ظاہری یا پس پردہ سرپرستی کر سکتی گی۔

انتھونی لمبارڈو کے انتخاب کے سلسلے میں الیکھن کا کافی پرامید تھا۔ تمام گروہ اس کی کافی عزت کرتے تھے لیکن وہ یہ سن کر حیران رہ گیا کہ جتا فلی ”اسٹیلو کو یونین کا صدر بنوانا چاہ رہی تھی۔“

یہ جان کر الیکھن کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسٹیلو کے صدر منتخب ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ایک انتہائی طاقتور دشمن ہمیشہ اس کی پیٹھ کے پیچھے موجود رہے گا۔ اب گویا دونوں گروہوں کے مفادات بالکل ہی متصادم ہو گئے۔

جان نوری پر قاتلانہ حملے سے چند ہی روز پہلے اسٹیلو جتا نے ایک اٹھارہ سالہ لڑکی لوسی سے شادی کی تھی۔ وہ خود اس وقت اٹھائیس سال کا تھا۔ لوسی ایک خوبصورت، چلبلی اور زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ وہ ایک اچھے خاصے دولت مند اور معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

اس کا بھائی بھری ایک وکیل تھا۔ یہ خیال سب سے پہلے اسی نے ظاہر کیا تھا کہ شراب کی غیر قانونی تیاری اور ٹیکس چوری میں لوگ بہت دولت کمائیں گے۔ بھری کے اوپر اس کے اونچے درجے کے فنکاروں سے بھی قریبی مراسم تھے جو اس زمانے میں کچھ اسی طرح سمجھا جاتا تھا جیسے آج کے دور میں کسی کے فلم انڈسٹری کے سپرا ستارز سے مراسم ہوں۔

لوسی کے گھر والے اسٹیلو سے اس کی شادی پر کچھ زیادہ خوش نہیں تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نوخیز لڑکی سچے افسانوی سے انداز میں اسٹیلو سے محبت کرنے لگی تھی اور دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسٹیلو جیسے لوگ جب کسی سے کچھ مانگتے تھے تو اس کے لئے انکار کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ اس نے جب لوسی کا رشتہ مانگا تو اس کے گھر میں کسی کو انکار کرنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔

یہ شادی اس اعتبار سے منفرد تھی کہ اس میں دعوت دے کر جن لوگوں کو باقاعدہ بلایا گیا تھا، وہ تو اپنی جگہ تھے لیکن اخبار میں ایک اشتہار بھی چھپا تھا کہ شادی میں جس کا کٹی چاہے، آ سکتا ہے۔ چنانچہ نہایت شاندار انداز میں چرچ میں شادی کی رسوم انجام پانے کے بعد ایک بڑے میدان میں، بڑے بڑے شامیوں کے نیچے جو مہمان جمع ہوئے ان کی تعداد کم از کم تین ہزار تھی۔

شادی کا کیک جمادوڑ نہیں بلکہ سچے سچ ایک سن وزنی تھا۔ اس کی اونچائی بارہ فٹ تھی اور اس کے اوپر ایک مکان کا ماڈل بنا ہوا تھا جس کی بالکونی میں کریم سے بنے ہوئے چھوٹے سے دولہا و دلہن کھڑے ہوئے تھے۔ پیچھے لکھا تھا ”ہوم سوئٹ ہوم۔“

کئی اقسام کے نہایت پر تکلف کھانوں سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ شادی کی رات کے لئے دولہا و دلہن کا قیام ایک مہنگے علاقے کے شاندار ہوٹل میں، ایک خصوصی سوئٹ میں تھا۔

اپنی شادی سے لوسی اور اسٹیلو، دونوں ہی بہت خوش تھے لیکن شادی کے بعد بھی اسٹیلو کے مزاج کی خوشخبری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اسی طرح اس کے بھائی کے مزاج میں دولت اور طاقت کی جو ہوس تھی وہ بھی قطعی کم ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ الیکھن اس کا مطلب یہی لیتا تھا کہ اسے مستقل طور پر ایک مسئلہ کا سامنا تھا۔

ادھر جان نوری پر جھلے اور اس کے سچے کرکل جانے کے بعد سے برین کے گروہ نے کوئی چار چاند کارروائی تو نہیں کی تھی لیکن ان لوگوں کی طرف سے دھڑکا بہر حال لگا رہتا تھا۔ برین کے گروہ کے لوگ ”نا تھ سائڈرز“ کہلاتے تھے۔ فی الحال تو وہ خاموش تھے لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اندر ہی اندر ان میں کیا بھجوری پک رہی ہو۔

الیکھن کو نہ جانے کس کس طرف سے ہوشیار اور چوکنار ہونا پڑتا تھا۔ مستقبل میں بھی جو چیزیں مکنتات میں سے ہو سکتی تھیں، اسے ان کے بارے میں بھی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اندازے لگانے پڑتے تھے۔

ایک بات کا اس نے بہر حال فیصلہ کر لیا کہ اسے جتا برادرز کے شر کا خطرہ اپنے سر سے ٹالنا ہوگا لیکن کچھ اس طرح، کہ گروہوں کے درمیان باقاعدہ جنگ نہ چھڑ جائے۔

ادھر الیکھن اس فیصلے پر پہنچا، ادھر اس کے ہیڈ آفس پر چھاپہ پڑ گیا جو وہ ڈاکٹر اسے براؤن کی آڑ میں کھولے بیٹھا تھا۔ یہ چھاپہ میگزین پورکی ہدایت پر مارا گیا تھا اور اس کی تیاریاں اتنی خفیہ رکھی گئی تھیں کہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں موجود، الیکھن کے خبر بھی اسے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہ دے سکے۔

آفس کا تمام ریکارڈ قبضے میں لے لیا گیا۔ چھاپہ ماریم کی قیادت سرخراں سارجنٹ ایڈورڈ کر رہا تھا۔ آفس کے کمرے اور منیجر کوڑک نے اسے پانچ ہزار ڈالر رشوت کی پیشکش کی اور درخواست کی کہ وہ ایک گھنٹے بعد چھاپہ مارنے آ جائے لیکن ایڈورڈ بہت دیاقتدار تھا یا پھر اس کی بھی کڑی نگرانی ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے اس نے کوئی پیشکش قبول نہیں کی۔

تاہم الیکھن کی رسائی تو اس سے کہیں اوپر کی سطح تک تھی۔ اسسٹنٹ اسٹیٹ انٹارنی نے یہ کہہ کر الیکھن کے ریکارڈ سے کوئی تفصیل باہر نہیں جانے دی کہ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور ایک غیر قانونی حرکت ہو گئی۔

ادھر ایک میونسپل جج نے انتہائی خاموشی اور زارداری سے مقدمے کی سماعت کی اور سارا ریکارڈ الیکھن کے وکیل کو واپس کر دیا۔ اس نے اسٹیٹ انٹارنی یا ریاست سے کسی اور اٹلی عہدیدار کو اس بارے میں مطلع کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اس پر میگزین پور اور پولیس چیف کو لٹر بری طرح تھملا کر رہ گئے۔

پولیس چیف کو لٹر اور کچھ نہیں کر سکا تو اس نے ایک روز گشت کے دوران الیکھن کو گاڑی میں جاتے دیکھ کر روک لیا اور جیڑ رکاری کے الزام میں اس پر جرمانہ عائد کر دیا۔ ظاہر ہے یہ الیکھن کیلئے کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اس واقعے میں خاص بات یہ بھی کہ الیکھن کے ساتھ اسکیل کا اس کے ساتھ ہونا سخت حیرت کا باعث ہو سکتا تھا کیونکہ اسکیل درحقیقت جتا برادرز کے دو خطرناک ترین قاتلوں میں سے ایک تھا۔

دوسرے خطرناک قاتل کا نام افضل تھا۔ خود جرائم پیشہ لوگوں کا کہنا تھا کہ جتا برادرز کے صرف یہ دو آدمی ہی قاتلوں کی ایک چٹن کے برابر تھے۔ چٹن بین لوگ اندازہ لگا سکتے تھے کہ الیکھن نے جتا برادرز کے قلعے میں لقب لگا لیا تھی۔ اس نے ان کے خطرناک ترین قاتلوں کو دانہ ڈال دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

25 مئی 1925ء کی صبح اسٹیلو اپنی چھ ہزار ڈالر مالیت کی اسپورٹس کار میں بیٹھ کر گھر سے روانہ ہوا۔ اس کی جیب میں گیارہ ہزار ڈالر نقد رقم موجود تھی۔ وہ اوک پارک کے علاقے میں ایک مکان خریدنے جا رہا تھا جو اس نے اور اس کی نو بیویا بیوی لوسی نے دیکھ کر پسند کر لیا تھا۔ انہوں نے اسے سچا سنوار کر اس میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اوک پارک وہ مضائقہ علاقہ تھا جس میں شہرہ آفاق مصنف ارنسٹ ہمنگو نے بھی رہا کرتا تھا۔

اسٹیلو ابھی اوگڈن ہائی وے پر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ بڑی سی ایک سیاہ گاڑی نے اسے اور ٹیک کرنے کی کوشش کی جو چاروں طرف سے بندھ گئی۔ باہر سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں کم از کم چار آدمی موجود تھے۔

وہ اسٹیلو کی گاڑی کو اور ٹیک کرنے لگی تو شاٹ گنوں کے دھماکے سنائی دیے۔ اسٹیلو نے ایک جھگے سے ایکسپلر پٹر پر دباؤ بڑھایا۔ گاڑی لہرا کر یکدم تیزی سے آگے بڑھی۔ ساتھ ہی اسٹیلو نے اپنی ہیلت میں لگے ہوئے ہولسٹر سے گن نکال کر سیاہ سیڈان پر فائر کیا۔ اس کی ہیلت میں دو گینیں، ہولسٹر میں موجود رہتی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ ڈیکل سنبھالے ہوئے تھا اور اس کی گاڑی اس وقت اوگڈن ہائی وے پر کم از کم ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی۔

سیاہ سیڈان کا انجن بہت طاقتور تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسٹیلو کی گاڑی کو آگیا، شاٹ گینیں ایک بار پھر گر گئیں۔ اسٹیلو کی گاڑی کھلی گئی۔ کئی گولیاں اس کے قریب سے گزریں مگر وہ بچ گیا۔ اس نے اپنا ریوالور خالی کر دیا مگر اس کی بھی کوئی گولی سیاہ کار میں موجود افراد میں سے کسی کو نہ لگ سکی۔

ہڈن ایوینیو کے چوراہے پر اس نے گاڑی یکدم گھما کر یوٹرن لینا چاہا تھا تا کہ سیاہ سیڈان سے نیچے کی کوشش کر سکے لیکن گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو گئی اور ایک جھبے سے جا کر ٹکی۔ سیاہ سیڈان ایک بار پھر اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتی ہوئی گزری۔ کئی گولیاں اسے گلیں جن میں سے ایک اس کی ریڑھ کی ہڈی میں گھس گئی تھی۔

مدد کے لئے آنے والوں نے اسے اس حال میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے دیکھا کہ ایک خالی ریوالور اس کے برابر والی سیٹ پر پڑا تھا اور اس کے ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہولسٹر پر یوں ہوئے ہوئے جھگے لینے کے سے انداز میں حرکت کر رہی تھیں جیسے وہ ریوالور ہولسٹر سے نکالنا چاہ رہا ہو مگر اس کا ہاتھ اس کے ارادے کی تکمیل میں اس کا ساتھ نہ دے رہا ہو۔

اس کی آنکھیں خالی خالی اور ساکت تھیں۔ چہرہ مردے سے مشابہہ تھا مگر وہ زندہ تھا۔ اسپتال پہنچ کر وہ صرف اتنی دیر زندہ رہا کہ جب پولیس کے ایک سرخراں نے اس سے پوچھا کہ حملہ آور کون تھے تو اس نے آہستگی سے کندھے اچکانے کی کوشش کی۔ اسی دوران اس کی بیوی لوسی بھی روتی ہوئی اسپتال پہنچ گئی اور ”سوئٹ ہارٹ۔۔۔۔۔ سوئٹ ہارٹ“ کہتے ہوئے اس کے بیڈ سے چٹ گئی۔

اس وقت صرف ایک لمحے کیلئے اسکی آنکھوں میں زندگی کی چمک ابھری مگر پھر اس کی آنکھیں سیاہ ہو گئیں۔ وہ مر چکا تھا! اس کا بھائی سام بھی اسپتال پہنچ گیا تھا مگر وہ بھی اسی قاتلوں کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔

پولیس نے کسی خاص تفتیش کے بغیر ہی خیال ظاہر کر دیا کہ فرار ہو جانے والی سیاہ سیڈان میں ویس، موران اور ڈینی تھے۔ چوتھے آدمی کے بارے میں وہ اندازہ نہ لگا رہے تھے۔ یہ لوگ برین کے گروہ کے آدمی تھے اور پولیس نے اس مفروضے کے تحت ان کا نام لیا تھا کہ نارڈھ سائڈرز نے برین کے قتل کا بدلہ لینے کی کوشش کی تھی۔

اس امکان کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا کہ وہ درحقیقت الیکھن کے آدمی تھے! جتا فلی نے پولیس کی اس تجویز کو درست تسلیم کر لیا۔ انہوں نے اسٹیلو کی آخری روم نہایت شان و شوکت سے ادا کیں۔ اس کیلئے جو تابوت بنوایا گیا تھا، اس کی مالیت اس تابوت سے ایک ہزار ڈالر زیادہ تھی جو برین کے لئے بنوایا گیا تھا۔ اس کی میت اور قبر پر منوں پھول ڈالے گئے۔ جس گاڑی میں اس کا تابوت رکھ کر لے جایا گیا، اس کے پیچھے پیچھے زنجیر سے منسلک وہ گاڑی بھی چل رہی تھی جس میں اسٹیلو مرتے وقت سفر کر رہا تھا، اور جو گولیوں سے چھلنی تھی۔

اس پر ایک اخبار نے طنزیہ اور متأسفانہ انداز میں یہ تبصرہ کیا تھا۔ ”اب ہمارے شہر میں جنازے اس طرح اٹھا کر بن گئے۔“

اسٹیلو کی تدفین سے فارغ ہوتے ہی جتا فلی کے آدمی نارڈھ سائڈرز کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

(جاری ہے)



# الکھون



ایک روز جتنا برادرز میں سے ایک بھائی مائیک اور اس کے چار ساتھی

ایک سڑک کے کنارے تاریکی میں موران اور ڈینی کے انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ برنین کے گروہ کے آدمی ہاتھ سائیز رکھلاتے تھے اور موران اور ڈینی ان میں ہی شمار ہوتے تھے۔ دونوں پیشہ ور قاتل اور نہایت خطرناک آدمی تھے۔ جولوگ ان کے انتظار میں گھات لگا کر

بیٹھے تھے، ان میں مائیک کے علاوہ اسکیل اور ہنسل شامل تھے۔ ان لوگوں نے ہی کچھ ایسا چکر چلایا تھا جس کی وجہ سے انہیں یقین تھا کہ موران اور ڈینی اصر سے ضرور گزر رہے تھے۔

ان کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ کچھ دیر بعد موران اور ڈینی اپنی کار میں اصر سے گزرے۔ اندھیرے میں چھپے ہوئے مائیک جتنا اور اس کے ساتھیوں نے اس گاڑی پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی، موران اور ڈینی نے بھی جواباً گولیاں چلائیں اور جان بچا کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

ان کی گاڑی گولیوں سے اس طرح چھٹی ہو گئی تھی کہ انہوں نے اس میں زیادہ دیر تک سفر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ موران نے اسے گھر لے جا کر پارک کر دیا تاہم ایک پولیس والے کی توجہ اس گاڑی کی طرف چلی گئی اور اس نے موران سے اس کے بارے میں پوچھا۔

اس نے جانتا مل جواب دیا۔ ”یہ کچھ دیر پہلے چوری ہو گئی تھی، چند منٹ پہلے ہی ملی ہے مگر اس حالت میں ملی ہے۔“

گھات لگانے والوں کو چونکہ معلوم نہیں تھا کہ موران اور ڈینی گھر چلے گئے ہیں چنانچہ وہ انہیں سڑکوں پر تلاش کرتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد یہ لوگ یعنی مائیک، اسکیل اور ہنسل اسی طرح سڑکوں کا جائزہ لیتے پھر رہے تھے اور ان کا ایک آدمی گاڑی چلا رہا تھا کہ سڑک کے دوسری طرف سے پولیس کے سرافرساں کی ایک کار گزری۔

پولیس کی وہ اسکوڈ کار سادہ تھی اور سرافرساں بھی سادہ لباسوں میں تھے۔ اس اسکوڈ کار سربراہ اس وقت کا نوے نامی ایک پولیس آفیسر تھا۔ اس نے دوسری گاڑی میں موجود مائیک جتنا کو پہچان لیا، اسے ان لوگوں کی گاڑی کا انداز مشکوک لگا۔

اس نے اپنی گاڑی چلانے والے کو حکم دیا کہ اس گاڑی کا پیچھا کرے جس میں مائیک موجود تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید مائیک اور اس کے ساتھی اس وقت اپنی ناجائز شراب کے دھندے کے سلسلے میں کسی بہم پر لپکے ہوں یا پھر کسی اور واردات کے چکر میں ہوں۔ اسے امید نظر آتی تھی کہ شاید اس وقت ان کا تعاقب کر کے وہ کسی معاملے میں انہیں رسکے ہاتھوں پکڑ سکے۔

ادھر مائیک اور اس کے ساتھیوں نے بڑی سی ایک سیاہ کار کو یوٹرن لے کر اپنے تعاقب میں آتے دیکھا تو وہ سمجھے کہ برنین کے آدمی ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ انہیں گمان بھی نہیں گزرا کہ اس طرح کی بغیر نشان والی کار میں پولیس آفیسرز بھی ہو سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

کچھ دیر بعد لوگوں نے دیکھا کہ دو کاریں بالکل فلمی انداز میں لہراتی، نہایت تیز رفتاری سے آگے پیچھے دوڑتی جا رہی ہیں، ان کی رفتار ستر میل فی گھنٹہ سے کم نہیں تھی۔ ٹریفک کے درمیان جہاں بھی رستہ مل رہا تھا، وہ ہشکل دوسری گاڑیوں سے بچتی بچاتی اور لہراتی چلی جا رہی تھیں۔ اس صبح کافی بارش ہوئی تھی۔ سڑکوں پر نمی تھی اور ٹرام کی پٹریاں ابھی تک بہت چمکی نظر آ رہی تھیں۔ بعض دوسری جگہوں پر بھی پھسلن تھی۔

اس صورتحال میں ایک ٹک اچانک ایک طرف سے نکل کر چوراہے پر آن پہنچا۔ مائیک جتنا والی گاڑی کے ڈرائیور نے اس سے بچنے کیلئے پوری طاقت سے بریک لگایا تو گاڑی گھوم گئی، اس کی گاڑی کا پیچھا حصہ ایک سبے سے ٹکرا کر پھٹ گیا۔

پولیس کار کے ڈرائیور نے بھی ٹکڑے بچنے کیلئے بریک لگایا تھا، یہ کار بھی لہراتی ہوئی اور پھسلتی ہوئی اس طرح رکی کہ اس نے مائیک جتنا کی گاڑی کا راستہ روک لیا۔ جب دونوں گاڑیوں سے لوگ چھلانگیں لگا کر اترے تو بد معاش اس لحاظ سے فائدے میں تھے کہ انہیں اپنی گاڑی کی آڑ میں تھی جبکہ پولیس والے صاف طور پر ان کی گولیوں کی زد میں آ گئے تھے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ فائرنگ میں پہل کس نے کی تاہم بعد میں پولیس کی گاڑی کی جو حالت دیکھی گئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہل بد معاشوں نے ہی کی ہوگی کیونکہ پولیس کی گاڑی میں گولیوں کے ستر سوراخ پائے گئے۔

پولیس کی گاڑی سے سب سے پہلے ڈرائیور نے اترنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا نام اولسن تھا، ابھی اس کا ایک پاؤں گاڑی میں ہی تھا کہ ایک گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔

گاڑی سے اترنے کی کوشش کرنے والا دوسرا آدمی آفیسر واٹس تھا۔ اسے بھی گولی لگی اور وہ بھی سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ کا نوے اور سوئی نامی دو آفیسرز کار میں رہتے ہوئے جھک کر فائر کر رہے تھے مگر ایک گولی کا نوے کے سینے میں لگ گئی، وہ بعد میں جانبر ہو گیا لیکن سروسٹ اس کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ رک گیا۔

سوئی نامی آفیسر نہایت دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی سے چھلانگ لگا کر اتر اور فائرنگ کرنے لگا مگر اس کی کوئی گولی جرموں کو نہیں لگی البتہ ایک آدھ گولی ان کی کار کو ضرور لگی۔ جتنا برادرز کی کار ڈرائیو کرنے والا تو فائرنگ شروع ہوتے ہی گاڑی سے اتر کر بھاگ گیا تھا۔

اب باقی تین آدمیوں نے بھی رفر افر ایتھاریٹی۔ ان میں سے ایک نے اپنی شاٹ گن ایک خالی پلاٹ پر پھینک دی کیونکہ وہ خالی ہو چکی تھی۔ پولیس آفیسر سوئی نے اپنے دو ساتھیوں کی تحسین اٹھائیں اور ان لوگوں کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

ایک میدان عبور کرنے کے بعد وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ اسکیل اور ہنسل تو اس دوران دو مکافوں کے درمیان کہیں غائب ہو گئے جبکہ مائیک جتنا بدستور بھاگ رہا تھا اور سوئی اس کے تعاقب میں تھا۔

آخر مائیک ایک جگہ رک کر سوئی کی طرف گھوم گیا۔ اس نے اپنی گن کا رخ سوئی کے سینے کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا مگر گن سے صرف کلک کی آواز برآمد ہوئی۔ اس کی گن خالی ہو چکی تھی، دوسرے ہی لمحے

سوئی نے فائر کر دیا، گولی مائیک کی ران میں لگی۔ اس کے باوجود مائیک دوڑ پڑا۔ وہ مکافوں کی دو قطاروں کے درمیان ایک پتلی سی گلی میں گھس گیا۔ اس کی حالت اس زخمی جانور کی سی تھی جس کے پیچھے کوئی درندہ لگا ہو اور وہ زخمی حالت میں پناہ کیلئے کوئی بھی کوئی کھدرا تلاش کر رہا ہو۔

اسے راستے میں ایک تہ خانے کی کھڑکی نظر آ گئی جو زمین کی سطح سے

تھوڑی ہی اونچائی پر تھی۔ اس نے اپنی خالی اور تار کار گن کے دھتے سے اس کا شیشہ توڑا اور کسی طرح اس راستے سے تہ خانے میں گھس گیا۔ اس کے بعد سوئی لگی کے سرے پر پہنچا۔ اس نے نگہ گلی میں دور تک نظر دوڑائی مگر مائیک کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ راستے ہی میں کہیں غائب ہوا ہے پھر اسے تہ خانے کی کھڑکی کا ٹونا ہوا شیشہ نظر آ گیا۔

اسی دوران دو اور پولیس والے اس سے آن ملے تھے۔ ان میں سے ایک تو اسٹریٹ کار میں بیٹھ کر گھر جا رہا تھا، اس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی، دوسرا وہ کہیں قریب ہی رہتا تھا، وہ بھی ڈیوٹی پر نہیں تھا مگر فائرنگ کی آوازیں سن کر اور گزربو محسوس کر کے وہ دونوں ہانپتے کا مچتے آن پہنچے تھے۔

ان تینوں نے مل کر تہ خانے کا دروازہ توڑا اور اندر پہنچ گئے۔ سامنے ہی ایک بڑے کمرے میں مائیک فرش پر لیٹا تھا، اس نے کہنیوں کے سہارے خود کو ڈرا اونچا کیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ایک ریو اور تھا۔

اس نے اندھا دھند گولی چلائی مگر اس کا ہاتھ لہرا رہا تھا۔ گولی نہ جانے کس طرف کو چلی گئی، اس کے بعد وہ جت ہو گیا، تینوں دوڑ کر اس کے قریب پہنچے۔ اس کی ران میں جہاں گولی لگی تھی، وہاں سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا اور اس کی حالت خراب تھی، اس کی آنکھیں بند تھیں۔

اس کے باوجود اس میں جتنا برادرز والی رواجی سرکشی باقی تھی۔ اس کا اندازہ پولیس آفیسر کو کچھ دیر بعد ہوا جب مائیک کو اٹھا کر ایوبولینس میں لٹایا گیا۔ اس وقت ایک لمحے کیلئے اسے کچھ ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے اوپر بچکے ہوئے انٹینٹ کولات مارنے کی کوشش کی اور اسے گالی بھی دی۔

اس کے اسپتال پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئی، چند منٹ بعد وہ مر گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف تیس سال تھی۔

اس دوران اسکیل اور ہنسل کچھ دور ٹھکے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن درحقیقت وہ اسی علاقے میں پکرا رہے تھے۔ اسی دوران انہیں ایک اسٹور کھلا نظر آیا تو وہ ہیٹ خریدنے کیلئے اس میں گھس گئے۔

دراصل اس زمانے میں گلی کوچوں میں کوئی شخص ہیٹ کے بغیر نظر نہیں آتا تھا۔ ہیٹ کے بغیر پھرنا مقبوح سمجھا جاتا تھا اور ایسے آدمی کی طرف فوراً نظر جاتی تھی جس کے سر پر ہیٹ نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہیٹ خریدنا ضروری سمجھا تھا کیونکہ ان کے ہیٹ مارو دھاڑا اور بھاگ دوڑ کے دوران گر گئے تھے۔

مگر وہ ہانپتے کاچیتے اسٹور میں داخل ہوئے تو اپنے انداز اور خراب طبعی کی وجہ سے وہ دکاندار کو مشکوک دکھائی دیے چنانچہ دکاندار نے انہیں ہیٹ دینے کے بجائے بھاگ دیا۔ وہ کچھ دور گزریں ہو گئے۔

وہ اسٹور سے نکلے تو بھاگنے لگے اسی دوران انہیں ایک ٹرام نظر آئی تو وہ اس میں چڑھ گئے۔ گاڑی میں نشست کرتے ہوئے کچھ پولیس والوں کی نظر ان پر پڑ چکی تھی اور انہیں وہ مشکوک دکھائی دیے تھے۔ علاقے میں گزربو اور فائرنگ کی اطلاع ان پولیس والوں کو مل چکی تھی، انہیں یہ بھی پتہ چلا تھا کہ کچھ پولیس والے مارے بھی گئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب دو مشکوک آدمیوں کو بدحواسی سے بھاگتے اور پھر ٹرام میں سوار ہوتے دیکھا تو وہ اس ٹرام کے پیچھے لگ گئے۔

اگلے اسٹاپ پر انہوں نے دونوں کو ٹرام سے اتار لیا۔ وہ چونکہ غیر مسلح ہو چکے تھے اس لئے آسانی سے قابو میں آ گئے۔ کافی دیر بعد جب وہ پولیس والوں کی تحویل میں پولیس اسٹیشن پہنچے تو ان کی حالت مزید خراب ہو چکی تھی کیونکہ راستے میں ان کی بہت اچھی طرح ٹھکانی ہو چکی تھی۔ پولیس والوں نے ان پر اچھی طرح دل کا غبار نکالا تھا اور اس قسم کی کارروائی کیلئے پولیس کے پاس بہترین جواز موجود ہوتا ہے اور وہ یہ کہ طرم گرفتاری نہیں دے رہے تھے، مقابلے پر اتر آئے تھے۔

مگر اسکیل اور ہنسل کو اپنے جرائم کی اتنی ہی سزا مل سکی کیونکہ عدالت نے بعد میں انہیں بری کر دیا تھا۔ ایک واقعہ حال نے کچھ عرصے بعد بتایا کہ مائیک جتنا کو بھر حال اس رات مرنا ہی تھا، موت اس کا مقدر ہو چکی تھی کیونکہ الگپن نے اسکیل اور ہنسل کو مکمل طور پر خرید لیا تھا اور مائیک کو کھانے لگانے کی ذمہ داری انہی دونوں کو سونپی گئی تھی۔

اس رات درحقیقت وہ دھوکے سے مائیک کو شہر سے باہر ویرانے میں لے جا کر قتل کرنے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔

اس کے بعد جتنا برادرز میں سے ایک اور بھائی انٹونی کی باری آئی۔ اسے کسی شناسانے ملاقات کیلئے ایک دکان کے قریب عقی گلی میں بلایا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو شناسا اس کا منتظر تھا لیکن اس نے انٹونی سے مصافحہ کرتے وقت اسکے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے، اسی لمحے انٹونی کے عقب سے دو آدمی نمودار ہوئے، ان کے ہاتھوں میں گھس گھس، انہوں نے پانچ گولیاں انٹونی کے جسم میں اتار دیں۔ چند لمحوں کے اندر اندر وہ لوگ اپنی کارروائی کر کے غائب ہو گئے اور انٹونی کی لاش وہاں پڑی رہ گئی۔

انٹونی کو الگپن نے جن دو آدمیوں سے قتل کرایا تھا۔ ان میں سے ایک ایسا تھا جو جتنا برادرز سے ویسے ہی سخت نفرت کرتا تھا لیکن اس میں اپنے بل بوتے پر جتنا برادرز کو چھیننے کی جرأت نہیں تھی۔ الگپن کی پشت پناہی میسر آئی تو اس نے اپنی نفرت کی تسکین بھی کر لی اور بھاری رقم بھی کمانی۔ بعد میں الگپن نے اسے ناجائز شراب کے دھندے میں شریک بھی کر لیا۔

جتنا برادرز میں سے اب قابل ذکر صرف ایک بھائی باقی رہ گیا تھا، اس کا نام جم تھا۔ وہ شاید ابھی تک اس لئے بچا ہوا تھا کہ وہ سسلی میں تھا۔ اسٹیلو اور مائیک اپنی فیملی کے ”فائر“ سمجھے جاتے تھے، گویا وہ فیملی کی طاقت تھے جبکہ انٹونی اور جم کو فیملی کا ”دماغ“ سمجھا جاتا تھا۔ ان میں

سے انٹونی بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ صرف 42 برسوں کے دوران تین جتنا برادرز مارے گئے تھے۔ فیملی کی کمرٹ گئی تھی، ویسے دو جتنا برادرز اور بھی تھے، ان کے نام سام اور پیٹر تھے لیکن وہ دونوں کسی شاد قطار میں نہیں تھے۔ تین بھائیوں کے قتل کے بعد وہ ڈر کسلی روانہ ہو گئے تھے جہاں جم پہلے سے موجود تھا۔

جم وہاں ایک واردات کے سلسلے میں دو سال کیلئے قتل چلا گیا۔ وہ پانچ سال سسلی میں گزارنے کے بعد واپس بھی آیا لیکن پھر اس نے کسی قسم کی مجرمانہ سرگرمی میں حصہ نہیں لیا، وہ شرافت سے پیٹر اور زیتون در آمد کر کے ایک معزز پرنس میں کی طرح زندگی گزارتا رہا۔

اسکیل اور ہنسل پولیس آفیسرز کے قتل کے جرم سے عدالت سے تو بچ نکلے لیکن دو سال بعد الگپن کے ہاتھوں مارے گئے۔ الگپن نے خود انہیں قتل کیے۔

ادھر جتنا برادرز کو قتل کرانے کے بعد الگپن کا راستہ مکمل طور پر صاف نہیں ہوا اور اسکی الجھنیں ختم نہیں ہوئیں۔ مافیا فیملی بہت بڑی تھی اور اس میں کئی دوسرے خطرناک اور خود مر آدمی بھی موجود تھے جو فیملی کا سربراہ بننے کی خواہش رکھتے تھے۔ لعل اٹلی کے علاقے پر درحقیقت مافیا فیملی کا سربراہ ہی حکومت کرتا تھا۔

جتنا برادرز کے بعد فیملی میں ایک شخص ایماٹ بھی تھا۔ بنیادی طور پر یہ شخص موسیقار تھا اور کبھی کبھی ایک نفیس آدمی کی طرح نہایت لطیف گفتگو کرتا تھا مگر اندرونی طور پر ایک سفاک آدمی تھا، اس کی نظر میں انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اس کا دھوپنی ملے کپڑے پہنے اور دھلے ہوئے کپڑے دینے کیلئے گھوڑا گاڑی میں آتا تھا۔ ایک بار وہ اس کی قمیض کا بٹن توڑ لایا۔ ایماٹ نے اس بات پر پشیمان نکال لیا اور دھوپنی کے سینے کا نشانہ لے لیا۔ عین آخری لمحے پر نہ جانے اس نے کس طرح اپنے غصے کا رخ موڑا اور دھوپنی کے بجائے اس کے گھوڑے کو گولی مار دی۔

وہ اسکیل کے ساتھ ایک کیفے میں سلیپنگ پارٹر تھا۔ دوسرے کئی دھندوں میں بھی اس کا پیچہ لگا ہوا تھا اور وہ بیٹھ کر کھاتا تھا۔ ایک روز اس نے دو ماہر نشانہ بازوں اور پیشہ ور قاتلوں کو ساتھ لیا اور مافیا فیملی کے ہیڈ کارٹر پہنچ گیا۔ وہاں اس نے کسی رمی کارروائی اور دو جنگ وغیرہ کے بغیر خود ہی اعلان کر دیا کہ اسٹیلو کی موت کے بعد وہ مافیا فیملی کا صدر ہے۔

الگپن نے جتنا برادرز کو مروانے اور دوسرے بہت سے کاموں کا ترڈ اس لئے نہیں کیا تھا کہ ایماٹ آرام سے جا کر فیملی کا صدر بن جائے۔ وہ اب بھی لمبا رڈ کو فیملی کا صدر بنوانے کا شدت سے خواہشمند تھا۔

10 نومبر 1925ء کو ایماٹ بال ترشوانے اور شیو بنوانے اپنی مخصوص بار برشاپ میں پہنچا۔ اسے اپنی مگتیر کے ساتھ اوپر ادا کیلئے جانا تھا۔ بال کنوا کر اور شیو بنوا کر وہ بار بری کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ دو آدمی دکان میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک چھوٹے قد کا تھا اور دوسرا دراز دراز قد تھا۔

دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ چھوٹے قد والے نے پہلے فائر کیا، اس کے بعد دراز قد نے گولی چلائی، دونوں نے چار چار فائر کئے، دراز قد کی کوئی گولی نشانے پر نہیں لگی لیکن پتہ قد کی چاروں گولیاں ایماٹ کے گلے۔ ایک گولی اس کی گردن میں لگی۔

دونوں آدمی چشم زدن میں فائرنگ کر کے فرار ہو گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہوا کیا ہے۔ ایماٹ کو اسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ تین دن زندہ رہا لیکن آخر کار زندگی کی بازی ہار گیا۔ 13 نومبر کو وہ صرف 26 سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اسی کے جنازے سے واپس آتے ہوئے اینڈر یونائی ایک شخص کو گولی لگی۔ یہ وہ شخص تھا جو ایماٹ کے ساتھ اس وقت ”بیملی“ کے ہیڈ کارٹر گیا تھا جب ایماٹ نے فیملی کی صدارت سنبھالنے کا اعلان کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی گیا تھا، وہ بھی بڑا پھرتیلا بدنوق باز اور قاتل تھا، وہ نجی کی عرفیت سے مشہور تھا۔ تین روز بعد وہ بھی مارا گیا۔ کسی نے پولیس کی ایک شش کی کار سے ایک شاٹ گن چرا کر اسے گولی مار دی تھی۔ یوں ایماٹ، مافیا فیملی کا سربراہ بننے کی خواہش دل میں لئے اپنے دو خطرناک ساتھیوں سمیت اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

وہ دونوں اسے سربراہ بنوانے کیلئے سرگرم تھے اور ہر قدم اٹھانے کیلئے تیار تھے مگر اپنی جان دے کر بھی وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے البتہ اس کے بعد لمبارڈو بیملی کا صدر بن گیا جسے الگپن کی پشت پناہی حاصل تھی۔

لمبارڈو کے صدر بننے سے گویا الگپن کے دل کی مراد پڑ آئی۔ اسے گویا فیملی پر بالواسطہ طور پر کنٹرول حاصل ہو گیا۔ دوسری طرف جتنا برادرز اور کئی دوسرے لوگوں کے مرنے سے غیر قانونی شراب کے دھندے میں جو خلا پیدا ہوا، اسے بھی الگپن ہی نے پُر کیا۔

تاہم اس دھندے میں روز بروز دشواریاں بڑھ رہی تھیں اور منافع کی شرح کم ہو رہی تھی۔ اصلاح پسندوں کی مختلف تنظیموں کا دباؤ بڑھ رہا تھا، الگپن کے کئی اڈوں پر تالے پڑے، بعض کو وہ دوبارہ کھولانے میں کامیاب ہو جاتا تھا، بعض کو کھولانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔ یوں مجموعی طور پر آمدنی میں کمی ہو رہی تھی۔

ایک روز وہ رات کے پچھلے پہر اپنے ہوٹل کے سوئٹ میں جا کر سویا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے اسے جگایا۔ جان نور پو کے برعکس وہ راتوں کو دیر تک جاگنے والا آدمی تھا، وہ اپنے اکثر اڈوں پر خود چلا جاتا تھا اور ان کی ”کارکردگی“ وغیرہ کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ راتوں کی بیشتر سرگرمیوں اور مشاغل میں بھی وہ حصہ لیتا تھا۔

فون پر اسے خبر ملی کہ اس کے ایک جواخانے پر چھاپے پڑا ہے جس میں اصلاح پسندوں کے نمائندے اور خبر بھی حصہ لے رہے تھے۔ اب تو الگپن کے ان اڈوں پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوششیں ہونے لگی تھیں جو سیمرو میں واقع تھے۔ الگپن نے سیمرو کو محفوظ محسوس کرتے ہوئے وہاں وہاڑے کھولے تھے۔

اڈوں کے خلاف کارروائیوں کے سلسلے میں مجبور پوری بھی خاصا اہم رول ادا کر رہے تھے۔ ان دنوں مجبور کو کسی حد تک نیم سرکاری حیثیت حاصل تھی، وہ کسی سروسز کی طرح باقاعدہ علاقے میں گھوم پھر کر جائزہ لیتے تھے کہ کون سی چیز کو قانون کی گرفت میں لایا جاسکتا ہے اور کس کے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے۔

یہ مجبور عام طور پر کہیں نہ کہیں ملازمت کرتے تھے۔ مجبری گویا ان کا ”پارٹ ٹائم جاب“ ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ چھاپوں اور قانونی کارروائیوں کے دوران بھی موجود رہتے تھے۔ وہ اپنی ذات کو لوگوں کی نظروں سے مخفی رکھنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

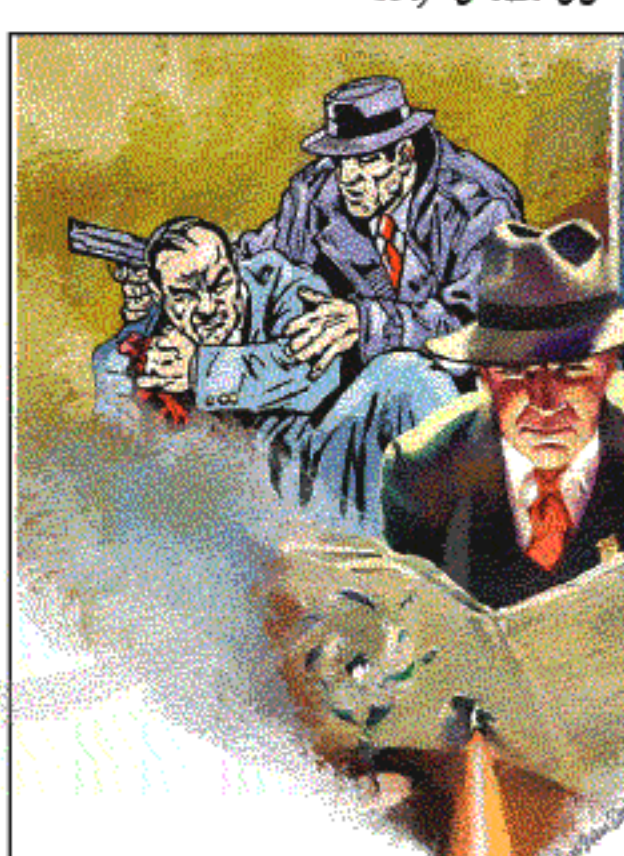
الگپن نے فوراً اٹھ کر شب خرابی کے لباس میں ہی اس اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی شیو بھی ذرا بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں نیند کے غبار سے پوچھل تھیں۔

وہ جب جواخانے کے دروازے پر پہنچا تو اندر بریگ نامی ایک شخص دروازہ تھوڑا سا کھولے کھڑا تھا۔ وہ درحقیقت انشورنس ایجٹ تھا لیکن پارٹ ٹائم کام کے طور پر مجبری کرتا تھا۔ اس نے الگپن کو نہیں دیکھا لیکن الگپن نے اسے دیکھ لیا تھا اور پہچان بھی لیا تھا۔



جب الگپن نے دروازہ کھول کر اندر جانے کی کوشش کی تو بریگ نے وہ اندر سے چلا یا۔ ”کیوں اندر گھسے چلے آ رہے ہو؟ یہاں کیا پارٹی ہو رہی ہے؟“

ہو گئیں اور ان میں زیادہ خونریزی آگئی۔ خود الگپن نے بھی اپنے ذرا کچ سے ہلکی مشین گولوں کی ایک کھپ مگولی۔



معلومات کرنے پر الگپن کو پتہ چلا کہ مین ٹین نیویارک میں ایک ایسا سرجن موجود ہے جو سرجری کے ذریعے اس الگپن کو روک سکتا ہے۔ یہ ایک نازک آپریشن تھا۔ الگپن اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ خاصی پریشانی کے عالم میں نیویارک پہنچا۔

کرسکی کی آمد آگئی۔ ان دنوں چھٹیاں تھیں۔ الگپن نے سرجن کے پاس جا کر درخواست کی کہ وہ جلد از جلد اسکے بیٹے کا آپریشن کرے، وہ اس کی خدمت میں ایک لاکھ ڈالر پیش کرے گا۔ سرجن نے آپریشن کیا اور وہ کامیاب بھی رہا لیکن سرجن نے اپنی مقررہ فیس ہی لی جو وہ سب سے لین تھا یعنی ایک ہزار ڈالر۔ اس نے الگپن کے اصرار کے باوجود مزید نانوائے ہزار ڈالر قبول نہیں کئے جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ الگپن حیران رہ گیا، اسے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں ایسے بااصول لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔

بچہ ابھی اسپتال میں ہی داخل تھا تاہم الگپن کی پریشانی کافی کم ہو چکی تھی۔ ایک روز جبکہ وہ گھر پہنچا، اس کی گلی کے کونے پر رہنے والا ایک شناسا اس کے پاس آیا اور اس سے درخواست کی کہ الگپن اس کے گھر چلے، وہ بہت تنہائی محسوس کر رہا ہے، دونوں کچھ دیر بیٹھیں گے، کپ شپ کریں گے اور ٹیکس پلائیں گے، وقت اچھا گزر جائے گا۔

الگپن کی بیوی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور الگپن نے بڑی کے ساتھ چلا گیا۔ ابھی اس نے وہاں بیٹھ کر بیٹنی شروع ہی کی تھی کہ اچانک چھ آدمی دروازہ کھول کر اندر آ گئے اور انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ الگپن کو اندازہ ہوا کہ اسکے بڑے نے اسے مروانے کا بندوبست کیا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چھلانگ لگا کر اور دیوار کی آڑ لے کر گولیوں کی پگھلی ہو چھڑا سے بچ گیا۔ اس نے تاک کر تین فائر کئے، دو آدمی ایک ایک گولی سے ہی مر گئے، تیسرے کے گھٹنے میں گولی لگی، وہ بولکھلا کر واپس بھاگا اور سیزجیوں سے اترنے کی کوشش میں لڑھکتا ہوا نیچے جا کر گر اور مر گیا۔

حملہ آور تعداد میں چھ ہونے کے باوجود بولکھلاے ہوئے تھے۔ تین آدمی بولکھلا جٹ میں ہی مارے گئے تھے باقی تین فرار ہو گئے۔ الگپن اس رات تین افراد کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو گیا اور اسے وہ رات جیل میں گزارنی پڑی تاہم جلد ہی اس کی جان چھوٹ گئی۔ اس کے وکیل نے عدالت میں ثابت کر دیا کہ اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا، اس نے تو خود خالقیت کے تحت فائر کئے تھے، وہ تو غیبت تھا کہ وہ گھر سے نکلے وقت ہمیشہ اپنی ہیلت کے ساتھ لگے ہوئے ہولسٹرز میں دو پستول رکھتا تھا، اگر وہ سرخ نہ ہوتا اور اپنے حواس بجا رکھتے ہوئے بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ نہ کرتا تو حملہ آوروں کی جگہ اس کی اپنی لاش پڑی ہوتی۔

تاہم ایک اور حقیقت نے یہ بھی لکھا ہے کہ قصہ درحقیقت یوں نہیں تھا۔ اصل میں خود الگپن نے گھات لگا کر ان تین آدمیوں کو مارا تھا اور اس وقت اس کے اپنے سرخ آدمی بھی اسکے ساتھ تھے۔ اس کے اس اقدام کے پیچھے کہانی یہ تھی کہ اسکے پرانے باسن اور ساتھی سیل نے اسکے بچاؤ سے پر شکا کو آ کر دوسرے اس کے اشارے پر قتل کئے تھے۔

الگپن اور جان ٹوریو نے اس وقت سیل کو اس لئے بروکلین سے شکا کو بولوا یا تھا کہ انہیں اپنے دشمنوں کو مروانے کیلئے ”باہر“ کے آدمی کی ضرورت تھی۔ جرائم پیشہ گروہ خاص موقعوں پر مصلحت کے تحت کسی کو مروانے کیلئے ”باہر“ کا آدمی بولواتے تھے۔

اب جبکہ الگپن بروکلین آیا ہوا تھا تو سیل کو ”باہر“ کے آدمی کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس نے الگپن سے اپنے ”تھانوں“ کا بدلہ مانگ لیا تھا اور الگپن انکار نہیں کر سکا تھا۔ اسکے اور اسکے آدمیوں کے ہاتھوں مرنے والے تین آدمی درحقیقت سیل کے دشمن تھے اور سیل کو ان کی جان مطلوب تھی۔ الگپن نے اس کی خواہش پر اس کے احسان کا بدلہ اتار دیا تھا۔

الگپن جب واپس شکا کو پہنچا تو سیل اٹلی کی حالت پہلے سے بھی بدتر تھی۔ بد معاشوں کے گروہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے۔ ڈول نامی وہ خنجر بد معاش جسے الگپن نے ایک بار سبق سکھایا تھا اور جو اس وقت غصہ ہو کر بیٹھ گیا تھا، ایک بار پھر سر اٹھا چکا تھا اور کافی طاقتور ہو چکا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہو چکا تھا کہ سیزجیوں میں الگپن کی جگہ سارے دھندے اب وہ خود کر سکتا ہے۔ اس کے خیال میں الگپن کو سیزجیوں سے نکالنا اس کیلئے مشکل نہیں تھا۔

حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ الگپن خونریزی سے چٹنا چاٹتا جب بھی نہیں بچ سکتا تھا۔ شہر میں گویا ایک خونی آندھی سی آئی ہوئی تھی۔ خونریزی کی کئی وجوہ کے باعث اور کئی پہلوؤں سے جاری تھی۔ کاروباری رقابتیں، بد معاشوں کے طور طریقے اور دشمنی کے لاتهاپی سلسلے تو اپنی جگہ تھے ہی لیکن اب ان میں نئے نئے عوامل شامل ہوتے جا رہے تھے۔ خونریزی کے معاملے کو اس وقت بھی ہوائی جب اسکیل اور ایٹیل کا مقدمہ لڑنے کیلئے چندہ جمع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

قصہ اصل میں یہ تھا کہ مافیائیلی کا کوئی خاص بد معاش جب کسی مصیبت میں پھنس جاتا تھا یا قانون کی گرفت میں آ جاتا تھا تو اسے چھڑانے یا اس کا مقدمہ لڑنے کیلئے اور مختلف محکموں کو رشوتیں کھلانے کیلئے باقاعدہ گلی کوچوں اور بازاروں سے چندہ جمع کیا جاتا تھا۔ اس ہم کیلئے ایسے آدمیوں کو مقرر کیا جاتا تھا جن کی علاقے میں دہشت ہوتی تھی، جن کی صورت دیکھتے ہی لوگ ڈر جاتے تھے اور خاموشی سے مطلوبہ رقم نکال کر رکھ دیتے تھے خواہ اس کیلئے انہیں گھر کے برتن ہی بیچتے پڑتے۔

اسکیل اور ایٹیل پر پہلے بھی ایک پولیس آفیسر کے قتل کا مقدمہ چل چکا تھا۔ اس وقت بھی ان کیلئے ایک لاکھ ڈالر چندہ جمع کیا گیا تھا۔ وہ ہم بخیر و خوبی انجام پا گئی تھی اور اسکیل اور ایٹیل اس مقدمے میں بری بھی ہو گئے تھے۔

اب ان پر دوسرے پولیس آفیسر کے قتل کا مقدمہ شروع ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں پولیس آفیسر ایک ہی واقعے میں مارے گئے تھے مگر اسکیل اور ایٹیل پر ان کے بارے میں مقدمے وقتے سے چل رہے تھے۔ اب دوسرا مقدمہ شروع ہوا تو ایک بار پھر چندے کی ہم درپیش ہوئی۔

مافیائیلی کا کرتا دھرتا چونکہ پہلے ایماٹ ہی بنا ہوا تھا اس لئے پہلی بار چندہ جمع کرنے کی ہم اس نے اپنے حکم پر اور اپنی نگرانی میں شروع کرانی

تھی۔ اس نے اور بڑ نامی ایک بد معاش کو اس ہم کا انچارج مقرر کیا تھا۔ اور بڑ کی علاقے میں بڑی دہشت تھی۔ لوگ اس سے سخت نفرت کرتے تھے لیکن ڈرتے بھی تھے۔ اکثر بد معاشوں اور دہشت گردوں کا معاملہ یہی ہوتا ہے، لوگ دل ہی دل میں ان سے نفرت کرتے ہیں لیکن ان کی دہشت اور ان کی گروہی طاقت کی وجہ سے ان کا حکم ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اور بڑ کی عمر 44 سال تھی لیکن وہ مضبوط کالمی کا ایک دراز قد آدمی تھا اور بہت سے نوجوانوں سے زیادہ طاقتور دکھائی دیتا تھا، اس کی رنگت تانے جھنسی تھی اور ناک عقاب کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی، اسے کسی کے سامنے اپنی خفاقت کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خفاقت اس کے چہرے پر ہی لکھی ہوئی تھی۔

اب ایماٹ تو اس دنیا میں نہیں تھا۔ الگپن اسے مروا چکا تھا چنانچہ اور بڑ نے خود ہی اپنے آپ کو دوسری بار چندہ جمع کرنے کی ہم کا انچارج مقرر کر لیا۔ اس مرتبہ اس کے عزائم بھی پہلے سے کہیں زیادہ بلند تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ اس بار وہ ضرورت سے کہیں زیادہ چندہ جمع کرے گا اور اس کا بیشتر حصہ خود ہی رکھ لے گا۔ ویسے تو اس قسم کے لوگوں کی نیت اکثر ہی خراب رہتی ہے لیکن اس بار تو شروع سے ہی خراب تھی۔

اب یہ شاید اس کی بد قسمتی تھی کہ اس کی چندہ جمع کرنے کی ہم کا آغاز ہی اچھا نہیں ہوا۔ ایک تو لوگ حالات سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ روز روز کی لڑائی جھگڑوں، گروہی دشمنیوں اور خونریزی کی وجہ سے کاروبار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بے قصور لوگ گروہوں کی باہمی دشمنی اور چٹاقلش کی زد میں آ کر جانی اور مالی نقصان اٹھاتے رہتے تھے، اس پر بھی آئے دن کوئی نہ کوئی ان سے چندے لینے آ جاتا تھا۔

شاید ان حالات کا رد عمل تھا کہ کچھلی بار جن لوگوں نے اور بڑ کو فراخ دلی سے چندے دیئے تھے، اس بار انہوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ اور بڑ جیسے بد معاش کی نظر میں اس ”تنگین جرم“ کی سزا موت تھی۔ اس نے پہلے بخیر نامی ایک دکاندار کو قتل کیا پھر وہ بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو مور کی برادرز کھلاتے تھے۔

اس کے بعد اور بڑ کو چندہ تو تیزی سے ملنے لگا لیکن اندری اندر اصل اٹلی کے لوگوں کے دلوں میں نفرت کا لاوا بھی کپنے لگا۔ کسی بھی گھمان آبادی میں کسی ایک ہی گروہ کے ہمدرد نہیں رہتے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہوں، کس کے کاروباری مفادات کس کے ساتھ وابستہ ہوں اور پھر ان میں سے بعض لوگوں کو دوسروں کی سرپرستی اور پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ ہوا ہے کہ ایک روز ایک کاروبار بڑ کے قریب سے گزری تو اس میں ایک شاٹ گن گرنی اور دوسرے ہی لمحے اور بڑ سڑک پر پڑا نظر آیا۔ گولی اس کی کھوپڑی میں گئی تھی۔

اس کے چھ دن بعد ویو نامی ایک اور شخص کی پریشانی میں سوراخ ہو گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا جو اور بڑ کی طرف سے چندہ جمع کرنے پر مامور تھے۔ اس کے دو دن بعد انیکولا نامی ایک اور شخص کی لاش کوڑے کے ڈھیر پر پڑی پائی گئی۔ یہ بھی اور بڑ کے کارندوں میں سے ایک تھا۔

اس کے تین دن بعد قلب نامی ایک شخص پر گولی چلائی گئی مگر اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بچ گیا اور ایک بے قصور راہ گویا کی زد میں آ کر مر گیا۔ قلب وہ آدمی تھا جس نے اور بڑ کے حکم پر چندہ نہ دینے کے ”تنگین جرم“ میں بھری نامی دکاندار کو قتل کیا تھا۔ جب قلب پر گولی چلی اور وہ اتفاقاً قتل کیا گیا تو اس نے قدرت کی اس مہربانی کو نعمت سمجھا اور اس واقعے کے بعد روپوش ہو گیا۔

ان حالات میں الگپن بروکلین سے واپس آیا تو سیل اٹلی کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چھوٹے چھوٹے بد معاش اسکے کاروبار کے ساتھ چھپ چھپ کر رہے تھے اور ڈول تو اپنے آپ کو مکمل طور پر الگپن کا جانشین سمجھ رہا تھا۔ اس نے تمام سیلونز اور شراب خانوں کو پیغام بھیجا اور یہاں تک کہ انہیں اب الگپن کی شراب اور بیئر چھوڑ کر ڈول کی شراب اور بیئر خریدنی ہوگی ورنہ وہ اپنے اپنے سیلون اور شراب خانے بند کرنے کی تیاری کر لیں۔

سیرو کو الگپن اب بھی اپنا محفوظ ٹھکانا شمار کرتا تھا لیکن ڈول نے وہاں کے بارے میں بھی اعلان کر دیا کہ جلد ہی وہاں کے جوئے خانوں میں الگپن کی مشینوں کی جگہ ڈول کی مشینیں لگی ہوں گی۔ ایک اور گروہ کا سرغنہ ویس بھی کچھ اسی حکم کے دعوے کر رہا تھا۔ ویس ایک نہایت خطرناک آدمی اور سفاک قاتل تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ اس سے الگپن بھی ڈرتا تھا۔

انہی دنوں کے بارے میں ایک اخباری رپورٹر کی ذاتی تحریروں میں سے ایک تحریر سے شہادت ملتی ہے کہ ایک روز اس نے الگپن کو اپنے سیزجیوں والے ایک ریسٹورنٹ میں اپنے ایک آدمی کے ساتھ تیزی سے کچھ بات کرتے دیکھا۔ رپورٹر درود بیٹھا تھا اسلئے وہ سن نہیں سکا کہ کیا گفتگو ہو رہی تھی لیکن الگپن کا چہرہ سرخ تھا اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے۔

اسے شاید اپنے کچھ کاروباری اڈوں کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ وہاں کچھ لوگ بد معاشی کر رہے ہیں۔ دوسرے بد معاشوں نے شاید یہ سمجھا لیا تھا کہ الگپن اب کچھ نہیں کر سکتا۔ الگپن نے ایک دیوار پر آویزاں پینٹنگ ایک طرف ہٹائی، اس کے پیچھے ایک خفیہ خانہ تھا۔ الگپن نے اس میں سے ایک نئی مشین گن نکالی۔ یہ ہلکی مشین گن اس نے خود سنبھالی، اپنے تین آدمیوں کو اس نے پستول دیے اور پھر وہ تیزی سے کہیں روانہ ہو گئے۔

رپورٹر کو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ چاروں اس رات کہاں گئے اور انہوں نے کیا کیا۔ رپورٹر نے اس بارے میں اپنے اخبار میں بھی کچھ نہیں لکھا البتہ دوسرے روز شکا کو اور سیزجیوں کے مختلف مقامات سے سات لاشیں ملیں۔ یہ لاشیں ملنے کی خبر اخبارات میں ضرور آئی لیکن اس رات رپورٹر نے سیزجیوں کے ریسٹورنٹ سے الگپن اور اس کے آدمیوں کو جس طرح روانہ ہوتے دیکھا تھا، اسکے بارے میں کسی اخبار میں ایک لفظ بھی نہیں چھپا۔

انہی دنوں اسٹیٹ انٹارنی کے عہدے کیلئے انکیشن ہونا تھا۔ یہ ایک بڑا اور اہم عہدہ تھا۔ اسٹیٹ انٹارنی ریاست کا سب سے بڑا سرکاری وکیل ہوتا تھا، اسکے ماتحت تقریباً ستر اسسٹنٹ کام کرتے تھے۔ بد معاشوں کے گروہ چاہ رہے تھے کہ اس عہدے پر باب کر منتخب ہو جائے۔ باب کرو کا رویہ مافیائی گروہوں کے ساتھ بہت نرم رہا تھا، وہ پہلے ہی اس عہدے پر کام کر رہا تھا۔

گروہوں کے سرغنہ اسے اپنا ہمدرد محسوس کرتے تھے۔ وہ مال بنانے والا آدمی تھا شاید اسی لئے اسکے دور میں بد معاشوں کے گروہ پھل پھول رہے تھے، شہر کا ماحول تباہ کر رہے تھے، خونریزی میں مصروف تھے مگر ان کی کوئی خاص سرکوبی ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی، عدالتوں سے انہیں قابل ذکر سزا نہیں ہوتی تھی۔

اسے دوبارہ منتخب کرانے کیلئے مافیائی گروہ سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ گروہ دوبارہ منتخب ہو گیا تو گویا اس بڑے سرکاری عہدے پر ان کا ”اپنا آدمی“ بیٹھا ہوگا۔ اس چکر میں وہ خارجی طور پر اپنی آئیں کی دشمنیاں بھی بھول گئے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر انہوں نے آپس کی مار مار دی اور خونریزی بند کر دی۔

شاید یہ شہر کی بد قسمتی تھی کہ باب کرو دوبارہ اسٹیٹ انٹارنی منتخب ہو گیا۔ اسکے چار دن بعد ایک اور افسوسناک واقعہ رونما ہوا کہ باب کرو کا چیف اسسٹنٹ سوینگن قتل ہو گیا۔

اس قتل کا الزام الگپن پر آ گیا! (جاری ہے)

”ہاں..... پارٹی تو میں اندر آ کر منعقد کروں گا، میں اس جگہ کا مالک ہوں۔“ الگپن فرمایا۔

”اوہ.....!“ تب بریگ نے دروازہ کھول دیا اور قدرے طنز سے لہجے میں بولا۔ ”آؤ..... آؤ..... الگپن! ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“

الگپن اسے ایک طرف دھکیل کر اندر پہنچا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا اس بڑے ہال میں داخل ہو گیا جہاں جوا ہوتا تھا۔ وہاں قطاروں میں جوئے کی مشینیں لگی ہوئی تھیں اور ان کے قریب چھاپے مارنے والے کچھ لوگ بھی کھڑے تھے، ان میں بھی ایک آدھ خبر شامل تھا۔

الگپن ان کے قریب سے گزرتے ہوئے فرمایا۔ ”یہ تم لوگوں کی زندگی کا آخری چھاپہ ہے۔ آج کے بعد تم کہیں چھاپے نہیں مارو گے۔“ وہاں اس وقت ایک پادری صاحب، ایک بچ اور علاقے کا پولیس آفیسر بھی موجود تھا۔ الگپن آگے بڑھتا چلا گیا اور آتش میں چلا گیا، وہ لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا وہ تجوری سے ٹوٹوں کی گڈیاں نکال کر اپنی بیسیوں میں ٹھونس رہا تھا۔

”یہ شخص کون ہے؟“ پادری صاحب نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے الگپن کہتے ہیں، شاید نام ہی تمہارے لئے کافی ہو۔“ الگپن نے زہریلے لہجے میں خود اپنا تعارف کر لیا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ تم الگپن ہی ہو سکتے ہو۔“ پادری صاحب نے سر ہلایا۔ ”تم شاید اپنے آپ کو امریکا کے صدر سے بھی زیادہ طاقتور سمجھتے ہو۔“

”آخر تم لوگ میرے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہو؟“ الگپن نے چڑچڑے لہجے میں پوچھا۔

”ہماری تم سے کوئی ذاتی پڑ خاش تو نہیں ہے، مسئلہ صرف معاشرے کی اصلاح اور قانون و اخلاقیات کا ہے۔“ پادری صاحب نے جواب دیا۔

”ہونہ۔!“ الگپن نے صرف اتنا کہا۔

اس دوران اس کا کاؤنٹینٹ وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کا کزن بھی آ گیا تھا۔ الگپن نے رقم کاؤنٹینٹ کے سپرد کر دی اور الگپن کا کزن اسے ساتھ لے کر قلم کی محفوظ جگہ پر پہنچنے کا چل دیا۔ الگپن بھی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کسی کو بھی انہیں روکنے یا رقم اپنے قبضے میں لینے کی جرأت نہیں ہوئی۔

الگپن شیشو بنا کر اور عمدہ لباس پہن کر واپس آ گیا۔ وہ اب ذرا نرم لہجے میں پادری صاحب سے مخاطب ہوا۔ ”فادر! کیا ہمارے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا؟“

”کیسا سمجھوتہ؟“ پادری صاحب نے پریشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

”اگر آپ لوگ سیزجیوں میں میرا پیٹھا چھوڑ دیں تو میں انکشی میں اپنے اڈے بند کر دوں گا۔“ الگپن بولا۔ انکشی ایک اور قریبی علاقے کا نام تھا۔

”مسٹر الگپن! میرے اور تمہارے درمیان صرف یہ سمجھوتہ ملے پا سکتا ہے کہ تم قانون کی پابندی کرو اور ان تمام علاقوں سے نکل جاؤ۔“ پادری صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس کے بعد الگپن نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ بات کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

وہاں موجود ایک شخص نے چھاپے کا وارنٹ جاری کرنے اور کارروائی کی نگرانی کرنے والے سچ سے کہا۔ ”آپ اس شخص کی گرفتاری کا وارنٹ بھی جاری کریں جو اپنے آپ کو اس غیر قانونی اڈے کا مالک کہہ رہا ہے۔“

سچ صاحب کا غذا ت وغیرہ سنبھال کر بیٹھے اور ان کی خانہ پزی کرنے لگے۔ وارنٹ کی کارروائی مکمل ہونے سے پہلے ہی الگپن وہاں سے غائب ہو گیا، چھاپے مارنے والے لوگ آخر کار جب واپس جانے کیلئے باہر نکلے تو وہاں تماشائیوں کا جھوم تھا، ان میں بہت سے غصے بد معاش بھی شامل ہو چکے تھے۔ انہوں نے چھاپے مارنے والوں کو ڈنڈوں اور گھونٹوں سے مارنا شروع کر دیا، ان کے گھونٹوں پر پیتل کے خول چڑھے ہوئے تھے۔

انہوں نے خاص طور پر پھروں کو اتار مارا کہ ان کے ناک، منہ برابر ہو گئے۔ دو پھروں نے اس بارے میں بعد میں رپورٹ درج کرانی۔ ایک نے بتایا کہ اسے تو کوئی بھی مار دی تھی اور حملہ آورا سے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے مگر ظاہر ہے حملہ آورا جھوم میں شامل تھے، ان کی شناخت متعین ہونا اور ان کا پکڑا جانا بعید از امکان تھا۔ الگپن کے دھندے دوسرے روز سے ہی دوبارہ شروع ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الگپن اب ایک طوفان بن چکا تھا جسے روکنا انگلٹرزے لوئے قانون کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

جن مجروں نے اس کے اڈے پر چھاپے میں حصہ لیا تھا، انہوں نے آئندہ کیلئے بخیری چھوڑ دی اور اپنے اپنے اصل پیشے پر انکشا کر لیا۔ عدالت میں بھی الگپن کے خلاف کوئی خاص کارروائی نہ ہو سکی البتہ اس واقعے کا اس کے دھندے پر ذرا برا اثر پڑا اور آدمی کچھ کم ہو گیا۔

اسی سال آگے چل کر حالات مزید خراب ہو گئے۔ گروہوں کے درمیان قتل و غارت شروع ہو گئی۔ ایک قتل دوسرے قتل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ قتل اور جوانی قتل کا کچھ ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ اعداد و شمار کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ تقریباً روز ہی کسی نہ کسی گلی کو پے میں یا پھر کہیں لاوارث سے انداز میں کھڑی ہوئی گاڑی میں ایک یا دو لاشیں ملتیں۔

کہیں دوبارہ مقابلے ہوتے۔ خوب گولیاں چلتیں اور جب تک پولیس کی بھاری نفری جمع ہو کر جائے وقوع پر پہنچتی، تب تک برسر پیکار لوگ فرار ہو جاتے اور ایک یا دو لاشیں جائے وقوع پر پڑی رہ جاتیں۔

ان لڑائیوں میں الگپن کے آدمی تو کم ہی مارے گئے اور اس کے گروہ کی براہ راست کسی گروہ کے ساتھ زیادہ لمبی دشمنی بھی نہیں چلی لیکن کاروبار پر بہر حال برا اثر پڑا۔

اسی دوران گروہی لڑائیوں کو مزید سنگین بنانے والا ایک اور ہتھیار متعارف ہو گیا۔ یہ ہلکی مشین گن تھی جس کے ایک ماڈل کو نائی گن کا نام بھی دیا گیا۔ بد معاشوں، قاتلوں اور دہشت گردوں کے ہاتھ میں یہ نیا ہتھیار آیا تو ان کے باہمی مقابلے اور لڑائیاں پہلے سے زیادہ خطرناک



کسی پولیس آفیسر یا سرکاری وکیل کا قتل بہر حال معمولی واقعہ نہیں ہوتا تھا۔ اسٹیٹ انٹارنی کے چیف اسسٹنٹ سوئگن کے قتل کا الزام الکھون پر آیا تو اس کے لیے مشکلات کھڑی ہو گئیں۔ درحقیقت الکھون نے مخالف گروہوں کو سبق سکھانے اور اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے بہت سے لوگوں کو مروانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاہم

موقع کا انتظار تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے بعد ڈول کی کمرٹ جائے گی اور وہ کبھی سر اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ ساتھ ہی اس واقعے سے دوسرے گروہوں کو بھی سبق حاصل ہو جائے گا۔ انہیں معلوم ہو جائیگا کہ الکھون کو لٹکانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ایک روز اسے اپنے اس ”آپریشن ٹھکانے“ کے لیے بہترین موقع میسر آ گیا۔ اسے اسکے ایک تجربے اطلاع دی کہ ڈول کے چھ خاص



ترجمہ: محمود احمد سودی

قسط: 12

آدی دو گاڑیوں میں بھر کر ایک بازار میں پہنچنے والے ہیں۔ شاید وہ کسی قسم کی خوشی منانے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔

الکھون نے تیزی سے اپنے آدمیوں کو تیاری کا حکم دیا۔ سات گاڑیاں فوری طور پر اس آپریشن میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوئیں۔ ان میں الکھون کی اپنی ہلت پروف گاڑی بھی شامل تھی۔ الکھون خود بھی مشین گن لے کر اس ہم میں حصہ لینے جا رہا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ خود اس ہم کی قیادت کر رہا تھا۔

دو گاڑیاں بازار پہنچ کر ایک سرے پر آؤں رخ کھڑی ہو گئیں۔ دو گاڑیوں نے دوسرے راستے سے بازار کے دوسرے سرے پر راستہ روک لیا۔ راستے میں ایک خالی پلاٹ بھی تھا۔ ایک گاڑی اس پر بھی ”تینات“ تھی۔

اس حکمت عملی کے ذریعے درحقیقت بازار میں ٹریفک روک دیا گیا تھا۔ اب ان لوگوں کی کارروائی میں مداخلت کے لیے کوئی نہیں آ سکتا تھا اور نہ ہی بازار میں پھنسی ہوئی گاڑی فرار ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ خالی پلاٹ کی طرف سے بھی کوئی نکل کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہاں بھی الکھون کے آدی ایک گاڑی میں، راستہ روکنے کے لیے تیار تھے تھے۔

اس کے بعد بازار پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کم از کم ان دو گاڑیوں کے لیے تو قیامت ہی آگئی جن میں ڈول کے آدی موجود تھے۔ ان کی شناخت کے سلسلے میں تمام ضروری اطلاعات الکھون کو مل چکی تھیں۔ الکھون اپنے آدمیوں کو یہ دکھانے کے لیے، کہ دشمن کو سبق کیسے سکھایا جاتا ہے، خود مشین گن لے کر اپنی ہلت پروف گاڑی میں موجود تھا۔

مشین گنوں کی فائرنگ کی گھن گرج سے بازار کی عمارتوں کے درو دیوار لرز اٹھے۔ بعد میں صرف ایک بیونی پارلر کی دیوار پر گولیوں کے 90 نشانات شمار کیے گئے۔ اسی طرح دوسری بہت سی دکانوں وغیرہ پر بھی گولیوں کی بارش ہوئی۔

وہ دو گاڑیاں جو خاص طور پر فائرنگ کا ہدف تھیں، گولیوں سے چھلنی ہو گئیں۔ ان کے شیشے چٹنا چور ہو گئے۔ ان میں موجود لوگوں نے کوئی راہ فرار نہ پا کر گاڑیوں سے اتر کر پیدل بھاگنے کی کوشش کی مگر موت نے انہیں وہ قدم بھی جانے کی مہلت نہ دی۔ کسی کا ایک پاؤں زمین پر اور ایک گاڑی میں ہی رہ گیا اور اس کے جسم میں بہت سی گولیاں اتر گئیں۔

کسی کا ہیٹ، کسی کا کوٹ جاہ شدہ گاڑی میں پڑا رہ گیا۔ گاڑیوں کے فرش پر خون ہی خون جمع ہو گیا۔

الکھون کی گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح آئی تھیں، متعدد افراد کی جانیں لے کر اور بہت سی تباہی پھیل کر وہ اسی طرح غائب ہو گئیں۔ کئی بے قصور افراد کی فائرنگ کی زد میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بازار میں جن لوگوں نے یہ ساری کارروائی دیکھی تھی، ان کے حواس کچھ دیر کے لیے شل ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ آتش و آہن کی اس خوفناک بارش میں زندہ بچ گئے تھے۔

الکھون کا آپریشن تو کامیاب رہا تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اس نے اور اس کے آدمیوں نے گولیوں کی جو اندھا دھند بارش کی تھی اس میں اسٹیٹ انٹارنی کا دست راست سوئگن بھی مارا گیا تھا۔

سوئگن درحقیقت بد معاشرہ ہی کے ساتھ ایک گاڑی میں موجود تھا لیکن یہ ایک ایسی بات تھی جو الکھون کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ بد معاشرہ کی گاڑی میں اسسٹنٹ اسٹیٹ انٹارنی کا کیا کام؟ سوئگن اس گاڑی میں کیا کر رہا تھا؟ یہ جاننے کے لیے اسکے شخصی پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری تھا۔

سوئگن اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو مختلف شعبوں میں قسمت آزمائی کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس نے پولیس کے محکمے میں بھی کچھ عرصہ خدمات انجام دی تھیں۔ اس کی وجہ تو شاید یہ بھی رہی ہو کہ وہ ایک پولیس آفیسر کا بیٹا تھا۔

تعلیم اس نے قانون کی حاصل کی تھی اس لیے کچھ عرصہ وکیل بھی رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ صحافی بھی رہا تھا اور اس زمانے میں اس نے بہت سے صحافیوں کو دوست بنایا تھا جو اس کی موت کے بعد بھی اس کے دوست ہی رہے تھے۔

جب وہ وکالت کر رہا تھا اور پھر جب وہ اسٹیٹ انٹارنی کا چیف اسسٹنٹ بنا، اس دوران اس نے جو بھی مقدمہ جیتا، اس کے صحافی دوستوں نے اپنی تحریروں میں اس کی تعریفیں کر کے خوب حق دیتی نبھایا۔

مسئلہ یہ تھا کہ بچپن اور لڑکپن میں اس کے ساتھ کچھ ایسے لڑکے اور بچے بھی کھیلے کوڈے تھے یا کچھ عرصہ اسکول میں ساتھ پڑھے تھے جو بڑے ہو کر بد معاشر بن گئے۔ گروہوں میں شامل ہو گئے یا کسی مافیا کا حصہ بن گئے۔ انسان کو بچپن میں تو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ بڑے ہو کر اس کے کسں ساتھیوں میں سے کون کیا بنے گا۔

سوئگن کی خوبی یا خامی یہ تھی کہ اس نے بڑے سرکاری عہدے پر پہنچنے کے بعد بھی اپنے بچپن کے کسی بھی ساتھی سے مکمل قطع تعلق نہیں کیا تھا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ روز ہی اپنے بچپن کے ان دوستوں سے بھی ملتا تھا جو بد معاشر یا مافیا کے کارندے بن گئے تھے لیکن یہ ضرور تھا کہ ایسے کچھ دوست اگر کبھی کسی خاص موقع پر اس سے ملنے یا اسے اپنے ساتھ کہیں لے جانے کے لیے آتے تھے تو وہ انکار نہیں کرتا تھا۔

اس روز بھی ڈول کے بد معاشر گاڑی لے کر اسے لینے اس کے گھر پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی اس کے بچپن کے ساتھی تھے۔ وہ کسی کامیابی کا چھوٹا مونا جشن منانے جا رہے تھے اور انہوں نے چاہا تھا کہ اس موقع پر سوئگن بھی ان کے ساتھ ہو۔

سوئگن کا باپ، جو پولیس سارجنٹ تھا، اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ان لوگوں کو دیکھا بھی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بد معاشرہ کے ساتھ جانے دیکھ کر ناک بھوس بھی چڑھا تھی۔ اگر اسے ذرا بھی اندیشہ ہوتا کہ درحقیقت موت اسکے جوان بیٹے کو گھر سے ہلا کر لے جا رہی تھی، تو شاید وہ اسے جانے ہی نہ دیتا، وہیں روک لینا اور محض ناک

سوئگن کا نام ان میں ہرگز شامل نہیں تھا۔ ظاہر ہے سوئگن نہ تو کسی جرائم پیشہ گروہ کا آدی تھا اور نہ ہی وہ سرکاری عہدے دار کے حیثیت سے الکھون کا دشمن تھا۔ وہ سرکاری عہدے دار ہونے کے باوجود گویا الکھون کے اپنے آدمیوں میں سے ایک تھا۔

چنانچہ جب پہلے افواہوں کی صورت میں سوئگن کے قتل کا الزام الکھون پر آیا تو اس نے اخباری رپورٹروں سے بات چیت کے دوران انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بھلا سوئگن کو کیوں مرواؤں گا؟ وہ تو بہت اچھا نوجوان تھا اور میرا بہت ہی اچھا دوست تھا۔ کل رات ہی تو میری اس سے نہایت تفصیلی اور دوستانہ ملاقات ہوئی تھی۔ چلتے وقت میں نے اسے اس کے ڈیڑی کے لیے نہایت عمدہ و سکی کی ایک بوتل بھی تحفے کے طور پر دی تھی۔“

سوئگن کا باپ پولیس کا سارجنٹ تھا۔ یہ بات کر کے الکھون نے گویا پریس کے سامنے ظاہر کر دیا تھا کہ پولیس اور سرکاری وکیلوں سے بھی اس کے کس قسم کے مراسم تھے!

ہو اور اصل یہ تھا کہ الکھون نے جب بڑے پیارنے پر ”جنگ“ یا اپنے مخالفین کا ”آپریشن ٹھکانے“ کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا آغاز اس نے قتل کی اکاؤنٹ دار دانتوں سے کیا۔ سب سے پہلے اس نے ڈول کے ایک خاص بندوق باز کو قتل کر لیا۔ اس بندوق باز کا نام کون تھا۔

کون کون الکھون نے اپنے آدی کے ذریعے قتل نہیں کر لیا۔ الکھون اپنے معاملات میں نہایت شاطر تھا۔ وہ قتل و غارت گری کے معاملات میں بھی اپنی حکمت عملی اس طرح بناتا تھا جیسے شطرنج کی بساط پر مہرے چل رہا ہو۔ اس نے کون کون قتل کرانے کے لیے اس کے ایک پرانے دشمن کو تلاش کیا۔ اس کا نام ران تھا۔ کون نے کئی سال پہلے ران کے باپ کو قتل کیا تھا جس کا بدلہ ران ابھی تک نہیں لے سکا تھا۔

ظاہر ہے اگر اسے نہ صرف الکھون کی پشت پناہی حاصل ہو جاتی بلکہ ٹھیک ٹھاکہ رقم بھی ملتی تو اس کے لیے کون سے بدلہ لینا بہت آسان ہو جاتا۔ یوں ران نے کون کون کو اطمینان سے ٹھکانے لگا دیا اور ڈول یا اس کے گروہ کا شہرہ الکھون کی طرف نہیں گیا۔ الناقصت نے الکھون کا اس طرح ساتھ دیا کہ اس قتل کی وجہ سے اس کا ایک اور دشمن قتل ہو گیا جس طرح نیکی سے نیکی کا چراغ جلتا ہے، کبھی بھی اسی طرح بدی سے بدی کا چراغ بھی جلتا ہے۔

مقتول کون دراصل ڈول کی شراب کی سپلائی کی رقم وصول کرنے بھی جایا کرتا تھا۔ وہ قتل ہو گیا تو فوری طور پر اس کی جگہ کسی دوسرے آدی کا ”تقرر“ نہیں کیا جاسکا جو دکانداروں، شراب خانوں کے مالکوں اور سیلون والوں سے وصول کرنے جایا کرتا۔ جبکہ شراب کی سپلائی کا کام بدستور جاری رہا۔

ڈول اور اسکے گروہ کے لوگ تو ابھی شیش و بیج میں ہی تھے کہ کون کے قتل کے سلسلے میں کیا کیا جائے۔ اسی دوران ان کے اپنے ہی ایک اور خطرناک بد معاشر میکو کی نیت میں خرابی آئی۔ اس نے سوچا کہ میدان خالی ہے، شراب کی سپلائی جاری ہے اور وصول کرنے کوئی نہیں جا رہا، کیوں نہ یہ کام میں مشغول کر دوں؟

بد معاشر اور بدشت گرد اکثر مومنے دماغ کے ہوتے ہیں۔ میکو نے سوچا کہ وصولی کے لیے دوسرا آدی مقرر ہونے میں چند دن تو لگ ہی جائیں گے۔ ان چند دنوں میں وہ خاصی بڑی رقم سمیٹ لے گا اور جب نیا آدی مقرر ہوگا تو وہ بس روانی میں وصولیاں کرنا شروع کر دے گا اور حالات کی پچھل میں اسے شاید خیال ہی نہیں آئے گا کہ پچھلے چند دنوں میں تو وصولیاں ہوئی ہی نہیں ہیں۔

وہ بہت بڑی رقم توقع کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن یہ محض اس کی خام خیالی تھی کہ اس گڑ بو کو کوئی محسوس نہیں کر پائے گا۔ لوگوں نے اسے ڈول کا خاص آدی سمجھ کر کسی خاص پس و پیش کے بغیر رقبے تو دے دیں لیکن چند دن بعد جب ڈول کا باقاعدہ طور پر ”مقرر کردہ“ آدی وصولیاں کرنے لگا تو اس کے پاس پچھلے کچھ دنوں کا حساب بھی موجود تھا۔

اس نے لوگوں سے پچھلے بتایا جات کامطالبہ کیا تو ہر ایک نے یہی کہا کہ وہ تو پہلے ہی کی طرح باقاعدگی سے ادائیگی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ بیچ میں ایک دن کا ناغہ بھی نہیں آیا۔ نیا آدی یہ سن کر حیران رہ گیا۔ ”تم کسے ادائیگی کرتے رہے ہو؟“ اس نے باری باری سب سے پوچھا۔

”میکو کو.....“ سب نے یہی جواب دیا۔

دوسرے روز ڈول کے اپنے ہی کچھ آدی میکو کو اس طرح اپنے ساتھ لیے ہوئے آئے کہ اس کے ہاتھ ریشی سے اس کے پشت پر بندھے ہوئے تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔

وہ لوگ کسی دکان، شراب خانے یا سیلون پر رکتے۔ ان میں سے کوئی میکو کے لیے بال بکڑ کر ایک جھگڑے سے اس کا سرواٹھا تا اور پوچھتا۔ ”کیا یہی وہ آدی تھا جسے تم نے ادائیگی کی تھی؟“

”ہاں۔“ سیلون یا شراب خانے کا مالک یا ملازم جواب دیتا اور وہ لوگ آگے بڑھ جاتے۔

اس طرح انہوں نے ان تمام جگہوں سے تصدیق کی جہاں ڈول کی شراب سپلائی ہوتی تھی اور رقم واجب الادا تھی۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ گزشتہ چند روز کی رقبے میکو نے وصول کر لی تھیں۔

دوسرے روز میکو کی لاش ایک گڑھے میں پائی گئی! میکو بھی ایک ایسا آدی تھا جسے الکھون اب زندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے لیے اسے الگ ہی جگہیں ملانی پڑی۔ میکو خود اسے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس قسم کے واقعات کو الکھون کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا تھا۔

کے بعد دیگرے اس طرح ڈول کے کسی آدمی کو مروانے کے بعد الکھون نے یکدم میں ایک بڑی کارروائی کر کے اس کے چند خاص خاص آدمیوں کا صفایا کرنے کا پروگرام بنارکھا تھا جس کے لیے اسے مناسب

ہوں چڑھانے پر اکتفا نہ کرتا۔ بہر حال سوئگن خطرناک گروہوں کی آپس کی دشمنی میں بے موت مارا گیا۔ فائرنگ اور خونریزی کا یہ واقعہ جس انداز میں رونما ہوا، اس نے شہر میں سنسنی پھیلادی۔

اسٹیٹ انٹارنی باب کرو نے بھی اس واقعے کے بعد اپنے پہلے اخباری بیان میں اعتراف کیا۔ ”اس واقعے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ابھی میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔“

کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ فائرنگ کرنے والے کون تھے لیکن واردات کے انداز سے بہت سے معاملہ فہم لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ الکھون ہی کا کام ہو سکتا ہے تاہم یہ قیاس وہ لوگ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ الکھون نے خود بھی اس کارروائی میں حصہ لیا ہوگا۔

یہ سوال بھی شہریوں کے ذہنوں میں ابھرا کہ آخر اسٹیٹ انٹارنی کا اسسٹنٹ بد معاشرہ کے ساتھ ان کی گاڑی میں کیا کر رہا تھا؟ اخبارات میں چونکہ سوئگن کے بہت سے ہمدرد اور دوست موجود تھے اس لیے ان میں سے کسی نے خود ہی یہ شوشا چھوڑ دیا کہ شاید وہ کسی واردات ہی کے بارے میں ثبوت حاصل کرنے کے لیے بد معاشرہ کے ساتھ جا رہا تھا۔

اسٹیٹ انٹارنی، باب کرو نے بھی جلدی سے اس بیان کو اپنا لیا اور سکون کی سانس لی ورنہ وہ لوگوں کی انگشت نمائی کی وجہ سے کچھ فکر مند ہو رہا تھا۔

سوئگن کا باپ البتہ صورتحال کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے خبر سنتے ہی اپنے غم و اندوہ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”مارنے والے درحقیقت میرے بیٹے کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ان کی لاعلمی میں مارا گیا۔ قسمت کے کھیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

بہر حال پولیس نے جلد ہی نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ کام الکھون کے گروہ کا ہے۔ باب کرو نے بھی اس خیال کی تائید کر دی۔ شوئیکران دونوں پولیس کے سرانصر سائوں کا چیف تھا۔ اس نے قتل کے الزام میں الکھون کی گرفتاری کا وارنٹ حاصل کر لیا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ الکھون کو گرفتار کیسے کیا جائے؟

وہ غائب ہو چکا تھا! اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سوئگن خواہ بد معاشرہ کی گاڑی میں، انہی کے ساتھ مارا گیا تھا مگر اس کی موت نے بہر حال پولیس اور عوام میں کافی اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ پولیس اسے دیکھتے ہی گولی بھی مار سکتی ہے اور بعد میں اس سلسلے میں کوئی کہانی گھڑ سکتی ہے۔

اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر وہ پولیس کے سرانصر سائوں کے چیف شوئیکر کے ہتھے چڑھ گیا تو کم از کم ان دونوں شوئیکر اس کی دہشت کے زیر اثر نہیں ہوگا۔ کچھ بعید نہیں کہ پولیس والے اس سے تفتیش کے سلسلے میں عام مجرموں والا طریقہ اختیار کریں یعنی اسے کسی پولیس اسٹیشن کے تہہ خانے میں لے جا کر تشدد کریں۔

الکھون جب پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تو انہوں نے دوسرے طریقے سے اپنا غصہ نکالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اس کے کئی اڈوں پر چڑھائی کر دی، خوب توڑ پھوڑ مچائی اور کئی اڈوں پر تالا لگا دیا۔ الکھون کے اندازے کے مطابق پولیس والوں نے ایک دو دن کے اندر اندر اسے کم از کم ایک ملین ڈالر کا نقصان پہنچایا تھا۔ یہ تو صرف املاک کی تباہی کا نقصان تھا۔ اس سے بھی زیادہ نقصان آمدنی میں ہوا۔

پولیس چیف کولنز نے خود اپنی گمرانی میں ایسی کارروائیاں کرائیں۔ اس دوران پتہ چلا کہ الکھون کے دو تین اڈے ایسے بھی تھے جو ریکارڈ کے مطابق تو عدالتی حکم کے تحت بند تھے لیکن درحقیقت وہ کھلے تھے اور وہاں جو دھندہ پہلے چل رہا تھا وہ اب بھی چل رہا تھا۔

جس ہوٹل میں الکھون کا ہیڈ آفس ہوا کرتا تھا وہاں ابھی تک بچپس کمرے اونچے درجے کے عشرت کدوں کا کام دے رہے تھے۔ اسکے علاوہ پولیس نے بعض اڈوں کی دیواروں میں وہ خفیہ خانے بھی دریافت کر لیے جن میں ہتھیار چھپا کر رکھے جاتے تھے۔ پولیس نے ان سب بنگیوں پر خوب تباہی مچائی اور اپنے دل کے ارمان نکالے۔

ان کارروائیوں کے دوران موجود رہنے والے ایک رپورٹر نے اپنے اخبار میں لکھا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ الکھون نے اپنی ایک الگ ہی دنیا بنا رکھی ہے جس میں وہ جو چاہے، ہو سکتا ہے۔ اس کی دنیا میں اس شہر، ریاست یا ملک کا کوئی قانون نہیں چلتا۔ وہاں صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ وہ اپنی اس دنیا کا بادشاہ ہے۔“

تاہم وقتی طور پر تو کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا کہ الکھون کی اس دنیا کو تہہ و بالا کر دیا گیا ہے لیکن لوگ وٹوق سے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ یہ سب اڈے دوبارہ کھل جائیں گے، سب دھندے دوبارہ چلنے لگیں گے۔ لوگوں کے خیال میں الکھون اب ایک ایسی آندھی بن چکا تھا جس کے بارے میں کبھی کبھی یوں لگتا تھا کہ وہ رگ رگ ہے مگر ذرا توقف کے بعد وہ پھر چلنے لگتی تھی اور تمام پابندیوں کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتی تھی۔

اصلاح پسندوں اور جج جج کے لوگوں نے بھی اس دوران اپنا غم و غصہ نکالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے الکھون کے، فاشی کے ایک اڈے کو آگ لگا دی۔ فائر بریگیڈ وہاں اس وقت پہنچا جب سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد فائر بریگیڈ نے صرف یہ کوشش کی کہ آگ برابر کی عمارتوں تک نہ پھیلنے پائے۔

جب ایک اخباری رپورٹر نے فائر چیف سے پوچھا کہ فائر بریگیڈ اتنی تاخیر سے کیوں پہنچا تو اس نے اطمینان سے جواب دیا کہ وہ جلدی آ کر کیا کرتے، ان کے پاس پانی ہی نہیں تھا، انہیں پانی کا انتظام کرنے میں دیر ہوگئی۔

آگ لگانے والوں کے ہم خیال، آتش زنی کے اس واقعے پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگر الکھون کے سارے اڈوں کو اسی طرح آگ لگا دی جائے تو اچھا ہے کیونکہ پولیس اور عدالتوں کے ذریعے انہیں مستقل طور پر بند کرنا ممکن نہیں تھا۔

بہر حال قتل کے واقعات کی تحقیقات کے لیے ایک گریڈ جیوری بنائی گئی مگر یہ جیوری عوام کے سامنے اپنی حقیقت کے کوئی خاص نتائج پیش نہیں کر سکی۔ جیوری کی کارکردگی کی راہ میں کئی رکاوٹیں حاصل تھیں۔

سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ شہر کے قوانین کے مطابق گریڈ جیوری صرف ایک ماہ کے لیے بنائی جاتی تھی۔ اسے جو کچھ بھی کرنا ہوتا تھا، ایک ماہ کے اندر اندر کرنا ہوتا تھا۔ اس جیوری کو ایک ماہ تو گواہ حلاش کرتے کرتے ہی گزر گیا۔

واقعہ بلاشبہ بہت بڑا تھا لیکن ایسا کوئی آدی جیوری کے سامنے نہیں آ رہا تھا جسے صحیح معنوں میں اس واقعے کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ صرف الکھون ہی نہیں بلکہ ڈول بھی روپوش ہو چکا تھا جس کے آدی اس واقعے میں مارے گئے تھے۔

ڈول پورے ایک ماہ تک غائب رہا۔ جب جیوری درخواست کر دی گئی کہ ڈول اپنے بھائیوں سمیت عدالت کے سامنے پیش ہو گیا۔ اس نے مؤقف اختیار کیا کہ وہ جان کے خوف سے روپوش ہو گیا تھا۔ دو دن اسے حراست میں رکھنے کے بعد عدالت کو اسے رہا کرنا پڑا۔







ویسے کیلئے اندازہ کرنا فطری مشکل نہیں تھا کہ اس پر اور ڈرچی پر قابضانہ حملے کا ذمہ دار کوئٹہ تھا۔ اب اسے الیکون نے کہا کہ جواب دینا تھا۔ قبائلی زندگی اور ماڈرن ورلڈ میں بدلہ لینا گویا اہم ترین فریضہ ہوتا ہے۔

الیکون کا بیٹا کوادران دونوں ایک بار پھر اس کے اپنے ہوٹل میں تھا۔ اس کا نام "ہاتھورن ہوٹل" تھا لیکن ویسے کو معلوم تھا کہ اس ہوٹل میں

پھر آخری گاڑی میں سے خاکی پینٹ شرٹ والا ایک آدمی ہلکی مشین گن ہاتھوں میں لئے اترا اور نہایت اطمینان سے چل رہا تھا۔ ٹورنٹ کے دروازے تک آیا جبکہ پہلی گاڑی میں سے کچھ لوگ ہاتھوں میں شاٹ گنیں لئے اترے اور پھر وہ دینے کے سے انداز میں وہیں کھڑے ہو گئے۔

خاکی پینٹ شرٹ والے نے دروازے پر پہنچ کر ایک گھٹنے سے بل



جرم کے بارے میں انتہائی دلچسپ اور تیز بینی کہانی  
ماضی کا ایک کواڈھ جس نے کسی روپ میں جنم لیتا رہتا ہے

# الیکون

ترجمہ: محمود حمود  
قسط: 13

جھک کر ایک بار پھر فائرنگ شروع کی۔ ان دونوں ہی نے متحارب ہونے والی اس ہلکی مشین گن پر گول ڈبے جیسا ڈرم لگا ہوتا تھا جس میں سو گولیاں ہوتی تھیں۔ اس نے یہ سو گولیاں بھی تباہ شدہ ریسٹورنٹ پر برسا دیں۔ اس کام میں اسے صرف دس سیکنڈ لگے۔

اپنی سب مشین گن خالی کر کے وہ اٹھا اور اطمینان سے واپس چلا گیا۔ کسی گاڑی کا ہارن سنکھل کے انداز میں تین مرتبہ بجاد اور جو لوگ گاڑیوں سے اترے ہوئے تھے، وہ تیزی سے گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ گاڑیاں فوراً ہی شاکا گو کی طرف روانہ ہو گئیں جس کی حدود وہاں سے دو فرلاٹک کے فاصلے پر شروع ہو جاتی تھیں۔

پولیس نے بعد میں حساب لگایا کہ حملہ آوروں نے کم از کم ایک ہزار گولیاں چلائی تھیں۔ سڑک پر موجود 35 گاڑیوں میں سوراخ ہو گئے تھے لیکن مجبوری طور پر اس دہشت انگیز کارروائی میں صرف چار افراد زخمی ہوئے تھے جن میں سے دو تو معمولی ہی زخمی تھے۔ ایک عورت کی آنکھ میں البتہ شیشے کی ایک کچی گھس گئی تھی۔

ایک زخمی نے پولیس کے چیف ڈیٹکو، شوٹیکر کو پناہ نام بار کو بتایا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ چھوٹا موٹا بیوہ پارے ہے اور ان دونوں ہاتھورن ہوٹل میں رہائش پذیر ہے لیکن شوٹیکر کو یاد آیا کہ اس شخص کو پولیس نے اس وقت بھی مشکوک انداز میں دیکھا ہے۔ پڑا تھا جب ویسے اور ڈرچی پر حملہ ہوا تھا، اس وقت اس شخص نے اپنا نام ویلری بتایا تھا۔

جب ہاتھورن ہوٹل پر حملہ ہوا تو بارکویا ویلری باہر فٹ پاچھ پر کھڑا تھا۔ اس نے سب کچھ دیکھا تھا لیکن بعد میں جب شناختی پریکٹس اس کے سامنے کچھ لوگوں کو پیش کیا گیا جن کے بارے میں پولیس کو کافی حد تک یقین تھا کہ وہ حملے میں شریک تھے، تو اس نے انڈر ورلڈ کے آداب کے مطابق انہیں پیچھا نینے سے صاف انکار کر دیا حالانکہ ان میں ویسے، ڈرچی، موران اور ان کا ایک زبردست گمن گن پیئر بھی شامل تھا۔

الیکون نے اس واقعے میں عام، غیر متعلقہ لوگوں اور راہ گیروں کو پہنچنے والے تمام نقصانات کی تلافی کی۔ حتیٰ کہ جس عورت کی آنکھ میں شیشہ گھس گیا تھا، اس کی آنکھ بچانے کیلئے بھی اس نے تمام ممکنہ انتظامات کر ڈالے۔ ان سارے معاملات میں اس نے اخراجات کی کوئی پروا نہیں کی۔ یوں اس نے لوگوں کی ہمدردیاں جیت لیں، اخبارات میں اس بات کا خوب چرچا ہوا۔

لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ "بھئی الیکون خواہ کیسا بھی ہے لیکن وہ یہ بات ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اس کی وجہ سے کسی عام اور بے قصور شہری کو کوئی نقصان پہنچے۔"

یہ سب باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن الیکون کو بہر حال جو نقصان پہنچتا تھا، وہ پہنچ گیا۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اخبارات میں کچھ اس قسم کی شہ سرخیاں لگ گئیں۔

"شہر میں خوفناک گینگ وار شروع ہو گئی۔"

"شہر کو زبردست خونریزی کا خطرہ۔"

"گینگ وار پورے شہر کو پیٹ میں لینے والی ہے۔"

اخبارات میں اس طوفان کے نتیجے میں الیکون کے ان تمام اڈوں پر دوبارہ تالا پڑ گیا جنہیں اس نے بڑی مشکل سے کھلایا تھا۔ الیکون کے لئے یہ ایک کڑا وقت تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنی لائن کے کسی کھمدار آدمی سے مشورے کی ضرورت ہے۔

جان ٹوریو جو مستقل طور پر رہنے کے ارادے سے آئی چلا گیا تھا۔ وہاں زیادہ عرصے نہیں رہ سکا تھا کیونکہ موسمی نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ تمام ٹیکسٹرز کو پکڑ کر جیل میں ڈال دے گا۔ جان ٹوریو کو کہانی یا سسلی میں باقاعدہ ایک ٹیکسٹرز کے انداز میں زندگی نہیں گزارنا تھا تاہم کچھ نہ کچھ دھندے چل رہے تھے اس کے علاوہ امریکا میں ایک ٹیکسٹرز کے طور پر اس کی جو شہرت تھی، وہ اٹلی تک بھی اس کے ساتھ گئی تھی۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا کہ موسمی جیسا ڈیکٹریٹر اسے واقعی جیل میں بند کر دے۔

چنانچہ وہ امریکا واپس بھاگ آیا تھا اور ان دونوں نیویارک میں تھا اور ایک ایڈز مین کے ساتھ اسکے ترجمان کی حیثیت سے تھی ہو گیا تھا۔ دراصل اس نے ذرا غلطی رخ پر سیاست میں دو تین کرپٹ آدمی ڈھونڈ لئے تھے اور ان کے فرنٹ مین کے طور پر وہی دھندے کر رہا تھا جن میں وہاں رہتا تھا۔

آج کے جدید دور میں بھی ہر ملک میں سیکڑوں جرائم پیشہ افراد سیاست یا سیاستدانوں کی چھتری تلے پناہ لے لیتے ہیں اور سرکاری پشت پناہی کے ساتھ ان کے دھندے چلتے ہیں بلکہ بعض پسماندہ ممالک میں تو بہت سے جرائم پیشہ لوگ خود مختلف پھکنڈوں سے عوام کو بے وقوف بنا کر سیاست میں آجاتے ہیں اور پورے معاشرتی ڈھانچے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔

جان ٹوریو کو چھوٹے موٹے سیاستدانوں کے ساتھ اشتراک گویا انہی حالات کی ابتدائی شکل تھی۔ اس کا نیویارک سے فلوریڈا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ فلوریڈا میں اس نے کچھ جاکدا خریدی تھی۔ الیکون ان اسکے پاس فلوریڈا ہی پہنچا اور ویسے والا مسئلہ اسکے گوش گزار کیا۔ دونوں سرجوڑ کر بیٹھے۔

جان ٹوریو نے بہر حال اسن پینڈی کا مظاہرہ کرنے کا مشورہ دیا۔ الیکون کو کہہ کر گرم دماغ کا آدمی تھا لیکن اس نے جان ٹوریو کے مشورے کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔

کچھ عرصے بعد جان ٹوریو بھی قتل ہو گیا۔ اسے گولی مار دی گئی۔ الیکون نے بعد میں ایک جگہ بات کرتے ہوئے کہا۔ "جان ٹوریو کے قتل کے بعد میں نے ویسے سے صاف صاف بات کی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ کیا تم تیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مرنا چاہتے ہو؟ آخر تمہاری سبھ میں کوئی معقول بات کیوں نہیں آتی؟ اس سے پہلے کہ ہم سب ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جائیں۔ کچھ تو محض پکڑلو۔ میں اس وقت تک بھی اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کیلئے تیار تھا لیکن وہ بد بخت

میری بات سننے کیلئے تیار نہیں تھا۔"

الیکون نے بہر حال اسن پینڈی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ کسی نہ کسی ذریعے سے ہر قابل ذکر گروہ کو پیغام بھجو چکا تھا کہ اگر ہم آپس کے اختلافات ختم کر دیں اور ایک دوسرے کو ہلاک نہ کریں تو زیادہ فائدے میں رہیں گے۔ اگر بات صرف مال کمانے کی ہے تو شکاگو اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اتنی گنجائش ہے کہ ہم سب خوب کما سکتے ہیں، ہم سب اسن پینڈی سے رہتے ہوئے جتنا کما سکتے ہیں، اتنا ایک دوسرے کو ہلاک کرتے ہوئے نہیں کما سکتے۔

الیکون نے اپنے اس اسن پینڈی کے "منشور" پر باقاعدہ اور باضابطہ طور پر عمل کرنے کیلئے بھی کوششیں شروع کیں۔ اصل مافیانی فیملی کا سربراہ اب الیکون کا حمایت یافتہ آدمی ٹونی لمبارڈو بن چکا تھا۔ الیکون نے اس سے کہہ کر "اسن مذاکرات" کیلئے ایک میٹنگ کا انتظام کیا۔

طے پایا کہ یہ میٹنگ شرین ہوٹل میں ہوگی تاہم الیکون اس میں شرکت نہیں کرے گا کیونکہ دو جانی دشمنوں کا ایک دوسرے کے سامنے آ جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کوئی ذرا سی چنگاری بارود کو ہجر کا سکتی تھی کیونکہ دونوں ہی دشمن مختلف مزاج اور خنوار تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی فریق میٹنگ میں شرکت کرے اور دوسرے سے ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ رہے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک پولیس آفیسر بھی اس میٹنگ میں شرکت کر رہا تھا تاکہ "اسن مذاکرات" کو پرامن رکھا جاسکے۔ الیکون کی نمائندگی لمبارڈو کر رہا تھا۔ الیکون کا پیغام مختصر اور سادہ تھا۔ وہ صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ ویسے کس طرح پرامن رہ سکتا تھا؟ باہمی دشمنی اور قتل و غارت گروہ کیلئے الیکون انکی ہر معقول بات ماننے کے لئے تیار تھا۔

میٹنگ میں الیکون کا یہ پیغام ویسے کو سنا دیا گیا۔ ویسے ابھی تک الیکون سے جس بات پر سب سے زیادہ عناد رکھتا تھا، وہ یہی تھی کہ الیکون نے اس کے دوست، ساتھی اور اتحادی برین کو قتل کر دیا تھا۔

اب ویسے نے فرمائش تو نہیں کر سکتا تھا کہ برین کے بدلے وہ الیکون کو قتل کرے گا تاہم اس کا یہ مطالبہ ضرور تھا کہ جن لوگوں نے برین پر فائرنگ کر کے اسے ہلاک کیا تھا، جواباً انہیں ہلاک کرنے کی اجازت دی جائے۔ ویسے کی معلومات کے مطابق اسکیل اور فیصل قاتل تھے۔ وہ دونوں ان دونوں قتل ہی کی ایک واردات کے سلسلے میں ایک دوسرے شہر جولٹ کی جیل میں تھے لیکن ویسے کیلئے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ انہیں جیل میں ہی مروانے کا انتظام کر دے گا لیکن ضمانت بس یہی درکار تھی کہ الیکون ان کی موت کا انتقام نہیں لے گا تا کہ خونریزی کا سلسلہ ہمیں نہ زکارتے، آگے نہ بڑھے۔

جب یہ پیغام فون پر الیکون کو دیا گیا تو اس نے جواب دیا۔ "اگر گلیوں میں آوارہ پھرتا ہوا کوئی بیمار سنا بھی میرے گھر کی چھاؤں میں آکر بیٹھ جائے تو میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اسے ہلاک کر دے۔ اسکیل اور فیصل تو پھر بھی انسان ہیں اور انسان بھی ایسے جنہوں نے میرے لئے اہم خدمات انجام دی ہیں۔"

جب یہ جواب ویسے کو سنا دیا گیا تو وہ غصے سے تھلا تا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ مزید ایک لفظ کہے بغیر وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

جس پولیس آفیسر نے اس میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ اس نے اپنے کیپٹن کو اس کے بارے میں رپورٹ دی تو وہ دانت غیث کر بولا۔ "یہ غیبت الیکون کی کسی بھی وقت کیلئے موت کا فرشتہ ثابت ہو سکتا ہے، یہ اپنے راستے میں آنے والی کسی بھی رکاوٹ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے فائدے کیلئے یہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

ادھر پولیس چیف کلنٹر کو اس میٹنگ کی رپورٹ ملی تو اس نے اندازہ لگایا کہ ویسے، الیکون کو کھانے لگائے بغیر جین سے نہیں بیٹھے گا۔ سب اپنے اپنے انداز سے لگا رہے تھے اور اپنے اپنے قیاس ظاہر کر رہے تھے لیکن صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اس بارشاورت کیلئے جان ٹوریو خود کھانا کھاتا تھا لیکن الیکون نے "اسن مذاکرات" کا کام ہونے سے پہلے ہی احتیاطاً کچھ اقدامات شروع کر دیے تھے۔

برین کی فلاور شاپ اب بھی قائم تھی اور اس میں پھولوں ہی کا کاروبار ہو رہا تھا۔ برین کے گروہ کے لوگوں کی آمدورفت وہاں اب بھی جاری رہتی تھی۔ ان میں ویسے بھی شامل تھا۔

اس دکان کے برابر میں ایک بلڈنگ تھی جو ایک ایک کمرے کے فلیٹوں پر مشتمل تھی۔ اس میں دوسری منزل پر سامنے کا ایک فلیٹ ابھی خالی ہوا تھا کہ ایک شخص اسے کرائے پر لینے کیلئے پہنچ گیا حالانکہ وہ کوئی ایسی بلڈنگ نہیں تھی کہ لوگ اس میں کمرہ خالی ہونے کا انتظار کرتے اور خالی ہوتے ہی فوراً لینے پہنچ جاتے۔

بلڈنگ اپنے وقت کے خاصے مقبول راکٹر ہیرو اسٹیفن کیلبر کی ملکیت تھی اور ذرا بھی اچھی حالت میں نہیں تھی لیکن اس کی لوکیشن بہر حال اچھی تھی۔ سامنے کے فلیٹوں کی کڑکیاں مین روڈ پر کھلی تھیں۔

جس شخص نے آکر دوسری منزل کا فلیٹ کرائے پر لیا تھا، اس نے اپنا نام آسکر بتایا تھا۔ اس نے جو فلیٹ لیا تھا، اس سے نہ صرف برین کی فلاور شاپ کے سامنے کا مظہر بلکہ سڑک کے دوسری طرف واقع دور تک کی عمارتیں بھی صاف دکھائی دیتی تھیں جن میں ایک چرچ بھی شامل تھا۔

جس روز آسکر نے فلیٹ کرائے پر لیا، اسی روز فلاور شاپ کی کچھلی گلی کی ایک بلڈنگ میں بھی ایک عورت نے ایک فلیٹ کرائے پر لیا۔ اس نے اپنا نام ایانا بتایا تھا۔ اس نے جو فلیٹ کرائے پر لیا تھا، اس کی کڑکی عقی گلی میں کھلی تھی اور وہاں سے فلاور شاپ ہی نہیں بلکہ دوسری کئی عمارتوں کے پچھلے دروازوں پر بھی نظر رکھی جاسکتی تھی۔

ایانا اور آسکر اپنے اپنے فلیٹ کی چابی لینے کے بعد غائب ہو گئے۔ بعد میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان کی جگہ ان دونوں فلیٹوں میں کچھ اور لوگ آگئے مگر کسی کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی۔ البتہ بعد میں ایک دو خواتین کی گواہی سے معلوم ہوا کہ ان دونوں فلیٹوں میں جو وہ افراد آئے تھے، وہ دونوں ہی اپنے اپنے فلیٹ کی سامنے والی کڑکی میں بیٹھ کر زیادہ تر وقت گزارتے تھے، وہ بس کرسی پر بیٹھے نیچے سڑک کی طرف دیکھتے رہتے تھے اور سگریٹ پیتے رہتے۔ کبھی کبھی ان کے ہاتھ میں گلاس بھی دکھائی دے جاتا تا سی طرح انہوں نے کئی دن گزار دیے تھے۔

11 ماکتوبر 1926ء کو ویسے عدالت میں موجود تھا۔ اس کے ایک آدمی پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا جس کی ہر پیشی پر ویسے موجود رہا تھا۔ اس خطرناک قاتل کا نام سالٹ تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ اسے بری کرانے کی غرض سے ویسے نے جیوری کے ایک رکن کو خریدنے کیلئے ایک لاکھ ڈالر کی پیشکش کی تھی۔

اس روز ساعت ختم ہونے پر ویسے عدالت سے وکیل صفائی برائن کے ساتھ نکلا لیکن دونوں الگ الگ گاڑیوں میں روانہ ہوئے۔ ویسے کے ساتھ اس کا ڈرائیور سام اور باڈی گارڈ پیٹرک تھا جبکہ برائن کے ساتھ ایک تجربہ ناپ آدمی آئیوینج تھا۔ دونوں گاڑیاں آجمنائی برین کی فلاور شاپ کی طرف روانہ ہوئیں جس کا نام "شوٹیلڈ" تھا۔

گاڑیاں دکان کے سامنے پہنچ کر سڑک کے دوسری طرف رکیں اور یکے بعد دیگرے پانچوں افراد اتر کر فلاور شاپ کی طرف بڑھے۔ ویسے اور پیٹرک آگے تھے۔ برائن ذرا پیچھے تھا سام اور آئیوینج خاصا پیچھے تھے۔

الیکون جہاں بیٹھتا تھا، وہاں کھڑکیاں اور دروازے لوہے کے مضبوط اور موٹے شرٹز کے ذریعے نہایت محفوظ بنا دیے گئے تھے۔ الیکون کے مخصوص کمرے تک پہنچنے کیلئے ایک خاصی طویل راہداری عبور کرنا پڑتی تھی جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی افراد بظاہر بے ضرر سے انداز میں بیٹھے ہوتے تھے۔

دیکھنے میں وہ ہوٹل کے حملے کے لوگ ہی لگتے تھے لیکن ویسے کو معلوم تھا کہ وہ ماہر شناختی گمن مین تھے۔ وہ الیکون کے ساتھ ساتھ اس پورے فلور کی حفاظت کیلئے بیٹھے تھے لیکن ویسے نے الیکون کے جس ڈرائیور پر تشدد کروا کے اسے ہلاک کیا تھا، اس سے وہ الیکون کے معمولات اچھی طرح معلوم کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس وقت الیکون کے ارد گرد حفاظتی انتظامات سب سے کم ہوتے تھے۔

ہاتھورن ہوٹل سوٹ چوڑی ایک باورچی سڑک پر واقع تھا۔ وہ کارز کی عمارت تھی، اس کا ریسٹورنٹ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ اس سڑک پر ہر طرح کی دکانیں تھیں اور لوگوں کی خوب آمدورفت رہتی تھی۔ الیکون کے تمام جواخانے اور دیگر ڈسٹاں سے دوبارہ کھل چکے تھے۔

ویسے کو اہم ترین بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ الیکون وہ پیر کا کھانا کھانے زیادہ تر اپنے ہی ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں گراؤنڈ فلور پر آتا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف اس کا خاص باڈی گارڈ فریک ہوتا تھا۔ ویسے کیلئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ وہ پورے بازار میں اپنا کوئی آدمی مقرر کر دیتا جو اسے اطلاع دیتا کہ الیکون نیچے ریسٹورنٹ میں آیا ہے۔

وہ 20 ستمبر، پیر کا دن تھا۔ الیکون بیرون شہر کے ایک بھٹے کے دورے سے واپس آیا تھا۔ اب اس کا شراب کی سپلائی کا کام آس پاس کے شہروں میں بھی چل رہا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے دوسرے شہروں کے دوروں پر بھی جانا پڑتا تھا۔ رقوم کی وصولی اور دوسرے بہت سے معاملات کے سلسلے میں بعض اوقات اس کا جودنا ضروری ہو جاتا تھا۔

اس روز وہ اپنے خاص باڈی گارڈ فریک کے ساتھ نیچے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے آیا تھا۔ ریسٹورنٹ میں ماربل کے ٹاپ والی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ الیکون اور فریک حسب معمول بڑے سے ہال میں سب سے پیچھے ایک میز پر اس رخ سے بیٹھے تھے کہ پورال ہال اور دروازہ ان کی نظر میں رہے، باہر سے آنے والے پر فوراً ہی ان کی نظر پڑتی تھی۔

ریسٹورنٹ میں بھی خوب رونق تھی۔ تقریباً کبھی میز پر بھری ہوئی تھیں۔ کچھ کھانے کے سامنے بھی اسٹولوں پر لوگ موجود تھے۔ سسرور کے نواح میں ایک بڑے پارک میں ریس کا سیزن شروع ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ سے بھی شہر میں رونق بڑھی ہوئی تھی۔ آس پاس کے شہروں سے بھی لوگ آتے ہوئے تھے۔

اچانک مشین گن کی تڑتڑاہٹ نے الیکون اور اس کے باڈی گارڈ کو چونکا دیا۔ آواز باہر سے آرہی تھی پھر ایک کار سڑک پر سے گزرتی دکھائی دی۔ فائرنگ اسی میں سے ہو رہی تھی۔ وہ پولیس کے سراغ رسالوں کی مخصوص کار معلوم ہوئی تھی۔ اس میں زوردار آواز والی گھنٹی بھی بج رہی تھی۔ ان دونوں پولیس اور فائر بریگیڈ وغیرہ کی گاڑیوں میں سائرن یا ہونٹ تو بجنے نہیں تھے، گانگ بجاتا تھا۔

فائرنگ کی آواز آتی رہی اور گاڑی آگے گزرتی چلی گئی۔ الیکون انجمن کے عالم میں دروازے پر آ گیا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ گاڑی سے فائرنگ کی آواز تو آرہی تھی لیکن نہ کسی جگہ شیش ٹوٹا تھا، نہ کسی یوٹارک پلستر اکھڑا تھا اور نہ ہی کسی اور قسم کی ٹوٹ پھوٹ نظر آرہی تھی۔

الیکون تو اس بات پر صرف حیران ہی ہو رہا تھا لیکن اس کے باڈی گارڈ فریک کو اچانک خیال آیا کہ یہ کوئی چال تھی۔ فائرنگ جعلی تھی اور شاید اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ دونوں متوجہ ہوں اور تجسس میں مبتلا ہو کر دروازے تک آجائیں، اصل حملہ اس کے بعد ہو۔

فریک اس وقت الیکون سے کئی قدم پیچھے تھا۔ اسے جو بھی یہ خیال آیا، وہ چھلانگ لگا کر آگے پہنچا اور اس نے پہنچ کر الیکون کو سینے کے بل فرش پر لیٹ جانے کی ہدایت کی۔ اس نے خود بھی ایسا ہی کیا۔

اس کا اندیشہ درست ہی نکلا۔ اسی لمحے اصل حملہ شروع ہوا۔ سڑک پر آگے پیچھے دس گاڑیاں نمودار ہوئیں۔ اس وقت تک جعلی فائرنگ کرنے والی گاڑی چند قدم آگے جا چکی تھی۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں کو گویا کوئی جھلٹ نہیں تھی۔

ہوٹل کے قریب پہنچ کر انہوں نے فائرنگ شروع کی اور یہ فائرنگ اصلی تھی۔ وہاں دو ہوٹل پاس پاس تھے اور ان کے نیچے دکانوں کی قطاریں بھی تھیں۔ ان سب کے دروہواری جہاں شروع ہو گئی۔ شیشے ٹوٹنے لگے۔ دیواروں کا پلستر اکھڑنے لگا اور ہر چیز گویا لرزنے لگی۔ فائرنگ کی گھن گرج سے فضا مرتعش ہو گئی اور لوگوں کو اپنے کانوں کے پردے پھٹنے محسوس ہونے لگے۔

ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچ کر گاڑیاں رک گئیں۔ فائرنگ جاری رہی۔ کھڑکیوں کے نہ صرف شیشے غائب ہو گئے بلکہ فریم بھی اکھڑ کر نہ جانے کہاں کیاں جا گئے، میزوں پر کھڑے ہوئے گلاس اور کپکپلوں میں تہلیل ہو کر غائب ہونے لگے۔ دیواروں پر گولیوں کے نشانات قطار در قطار نمودار ہونے لگے۔

گولیاں ایک عام قد کاٹھ کے آدمی کے پیٹ اور سینے جتنی بلندی سے گزر رہی تھیں جبکہ الیکون اور فریک سینے کے بل فرش سے چپکے ہوئے تھے۔ صرف وہی اس حالت میں نہیں تھے۔ ریسٹورنٹ میں موجود تمام کابھوں اور محلے نے بھی ان کی تقلید کی تھی۔ وہ سب میزوں کے نیچے گھسے اسی طرح فرش سے چپکے ہوئے تھے۔ شیشے کی کرسیاں پلستر اور گھڑی وغیرہ کے ٹکڑے ان پر گر رہے تھے۔

فریک جعلی فائرنگ کی آواز سننے ہی اپنا پستول نکال چکا تھا لیکن اس سے ایک بھی گولی نہیں چلا سکا تھا۔ اب تو فائرنگ کے اس طوفان بلا خیز کے سامنے وہ اپنا پستول والا ہاتھ ذرا سا اوپر کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔



اچانک مشین گن گرجی۔ ویس اور اس کا باڈی گارڈ پیٹرک جودکان کے قریب پہنچ چکے تھے، فوراً ہی گر پڑے۔ پیٹرک کے جسم اور سر میں سات گولیاں پیوست ہوئی تھیں جبکہ ویس کو دس گولیاں لگی تھیں۔

پیٹرک تو گرتے ہی مر گیا۔ ویس دس گولیاں کھانے کے بعد بھی کھٹکتا ہوا تنک پاتھ تک پہنچا، وہ کچھ دیر بعد اسپتال جا کر مر رہا۔ اسے اس دوران

روتا ہلکتا چھوڑ جاتے ہیں، ان کی دنیا ہمیشہ کیلئے اجڑ جاتی ہے، ویران ہو جاتی ہے یہ چیز واقعی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے سمجھنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔

ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”شہر میں جب پہلی بار ایک دوسرے پر پتول تلے گئے۔ میں نے اس وقت ہی سب لوگوں کو سمجھا دیا تھا کہ دیکھو لڑنے، مرنے اور ایک دوسرے پر گولیاں



ہوش نہیں آیا۔ فائرنگ ایک کمرے کے اسی فلیٹ سے ہو رہی تھی جو کچھ دن پہلے کرائے پر تھا۔ لیکن چلانے والے نے سڑک کے ایک بڑے حصے پر گولیوں کی بو چھاڑ کر دی تھی۔

بران کے جسم پر بھی چار ڈم آئے تاہم وہ مہلک نہیں تھے، وہ رینگتا ہوا ایک تہہ خانے کی بیڑیوں میں چلا گیا، وہاں سے وہ چند لمحوں بعد خود ہی کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا کچھ دور واقع ایک کلیئنگ تنک چلا گیا۔

سام اور تنجین معمولی زخمی ہوئے اور گرتے پڑتے وہاں سے بھاگے۔ گولیاں ان کے تعاقب میں تھیں مگر وہ موڑ مڑ کر غائب ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی وجہ سے کونے پر واقع چرچ کی دیوار پر بھی گولیاں لگیں جس پر ایک مقدس فرمان بھی لکھا ہوا تھا، فرمان کے کئی الفاظ غائب ہو گئے اور پستراڑ جانے کی وجہ سے اس کا مفہوم سمجھ جانے کے قابل نہیں رہا۔

اس کے فوراً بعد دونوں فلیٹوں کے لیکن عقی راستوں سے نکلے اور پیدل ہی مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے فرار ہو گئے۔ اہلی مشین گن ان میں سے صرف ایک ہی نے استعمال کی تھی، وہ اس نے راستے میں ایک مکان کے سامنے لگی ہوئی بئرے کی بازو میں پھینک دی۔ دوسرا آرام سے اپنی مشین گن بھی لے گیا۔

پولیس کو بعد میں ان دونوں فلیٹوں میں کھڑکی کے پاس رکھی کرسیوں کے ارد گرد کیڑوں سگریٹوں کے ٹوٹے ملے۔ بستی چادروں سے اندازہ ہوا کہ کوئی ان پر جوتوں سمیت سوتا رہا تھا۔ سامنے والے فلیٹ میں سے گولیوں کے خول بھی ملے۔ درحقیقت ان دونوں فلیٹوں کے بارے میں پولیس کو علم ہی ایک پتھن بعد ہوا۔ پولیس اس دوران شہادتیں جمع کرتی رہی۔ قتل کے وقت ویس کی عمر صرف چھپیس سال تھی۔

پولیس چیف کولنز نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس قسم کے واقعات ہونے چاہئیں لیکن بہر حال اگر کچھ لوگوں کا مرنا ناگزیر ہو ہی جائے تو پھر بہتر ہے کہ وہ گنگسٹر ز اور جرائم پیشہ لوگ ہوں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کا صفایا کرتے رہیں تو بہتر ہے، اس طرح پولیس کا کام کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“

الکھن نے ہاتھوں ہاتھ میں جمع ہونے والے رپورٹرز سے نہایت غمزہ لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ویس کی موت کا بہت افسوس ہے اور میرا اس کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے پولیس کو فون کیا تھا کہ اگر وہ مجھ سے پوچھ گچھ کی ضرورت محسوس کر رہے ہوں تو میں رضا کارانہ طور پر آجاتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے آنے سے منع کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر ویس مرا تو سب سے پہلے لوگوں کا دھیان میری طرف جانے کا لیکن میں بھلا ویس کو کیوں قتل کروں گا؟ پولیس مجھے پوچھ گچھ کیلئے بلا تو نہیں رہی لیکن اس کا خیال یقیناً یہی ہوگا کہ ویس کو میں نے قتل کر دیا ہے۔“

”آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی تو بہر حال چل رہی تھی نا اور دشمنی کا آغاز عام طور پر علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کیلئے ہوتا ہے۔“ ایک رپورٹر نے ڈرتے ڈرتے اظہار خیال کیا۔

”یہ بچکانہ باتیں ہیں۔“ الکھن تڑی سے بولا۔ ”پولیس نے یہ بڑا آسان طریقہ ڈھونڈ لیا ہے کہ شہر میں ہونے والے ہر قتل کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دو۔ مجھے گویا لوگوں کو قتل کرانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے حالانکہ میرا تو اپنا یہ عالم ہے کہ اگر میں باڈی گارڈ کی پوری فوج ساتھ لئے بغیر دروازے سے قدم باہر نکالوں تو فوراً ہی مجھے قتل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔“

الکھن اس پر پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کیلئے آدمی اسیحوں کی تمیز اور قدرے حکمن آلود چٹون میں ہی آ گیا تھا۔ بیروں میں سیلبر تھے۔ ان دنوں اس کے طبقے کے لوگوں کا اس قسم کے حلیے میں کسی میننگ یا کانفرنس وغیرہ میں آنا خاصا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اس نے اس روز ضلیہ درست کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ پریس کانفرنس میں رپورٹرز کی خوب خاطر تواضع کی جا رہی تھی۔

”الکھن نے پریس کانفرنس سے خطاب جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ویس اس لئے مارا گیا کہ اس کی کھوپڑی میں ایک نیل کا داغ تھا، وہ کبھی کوئی عقل کی بات سننے اور سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اس کی موت کا افسوس صرف اس لئے ہے کہ وہ شخص اپنی خردمافی کی وجہ سے مارا گیا۔ مجھے افسوس اس لئے نہیں ہے کہ وہ کوئی بہت اچھا اور شریف آدمی تھا۔ آپ سب جانتے ہیں کہ وہ پکا بد معاش، نہایت بے رحم اور جلا د صفت انسان تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ وہ پہلے مارا گیا۔ اگر زندگی اسے مہلت دیتی اور اسے موقع میسر آتا تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔ وہ مجھے قتل کرنے کیلئے کمر بستہ ہو کر پھر رہا تھا، وہ اور برہمن کے گروہ کے جتنے بھی دوسرے لوگ باقی ہیں، سب کے سب جلا د، لیبرے، ڈاکو اور دہشت گرد ہیں۔ ان کے ساتھ معقولیت کی تو کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔“

پھر وہ پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد بولا۔ ”بہر حال..... اب قتل و غارت کا یہ سلسلہ ختم ہونا چاہئے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں، ایک بیٹے کا باپ ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کی تصویر نکال کر صحافیوں کو دکھائی۔ ”مجھے دنیا میں سب سے زیادہ اس سے محبت ہے اس کے بعد مجھے اس کی ماں سے محبت ہے اور میں صرف بیوی، بیٹے والا ہی نہیں بہن، بھائیوں والا بھی ہوں۔ مجھے ان سے بھی محبت ہے اور آپ ذرا سوچیں کیا یہ ظلم نہیں کہ میں چودہ ماہ سے اپنی بیوی اور بیٹے کے پاس اپنے گھر نہیں جاسکا؟“

اس نے ہمدردی طلب نظروں سے رپورٹرز کی طرف دیکھا اور ایک لمبے کی ڈرامائی سی خاموشی کے بعد بولا۔ ”میں صرف موت کے خطرے کی وجہ سے اپنے گھر نہیں جاسکا۔ میں مرنا نہیں چاہتا خاص طور پر اس طرح سڑک پر مرنا نہیں چاہتا کہ میرا جسم مشین گن کی گولیوں سے پھٹتی ہو اس لئے میں ایک عرصے سے امن کی اپیلیں کر رہا ہوں۔ میں ان لوگوں کے سامنے التجائیں کر چکا ہوں کہ خدا کیلئے بندوبست ایک طرف رکھ دو اور عقل، شعور کی کوئی بات کرو، وہ لوگ بھی عقلی والے ہیں، ان کی بھی بیویاں اور بچے ہیں، دیئے ان میں سے بہت سے کم عمر بھی ہیں۔ ان کی شادیاں نہیں ہوئیں لیکن بہر حال ان کے بھی ماں، باپ، بہن، بھائی تو ہیں نا؟“

پھر اس کا لہجہ جذبات سے بوجھل ہو گیا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا ان لڑکوں کے دماغوں میں ایسا کون سا جنون، کون سا شخص محسوس جاتا ہے کہ یہ اپنے جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تو قبروں میں جا پھینچے ہیں۔ پہلے ان کی لاشیں سڑکوں پر پڑتی ہیں پھر اسپتالوں اور مردہ خانوں میں لڑتی ہیں اور آخر کار مٹی میں سا جاتی ہیں۔ یہ اپنی ماؤں، بہنوں کو اپنے پیچھے

چلانے کی ضرورت نہیں، اس شہر میں دھندا کرنے کیلئے اتنی گنجائش ہے کہ ہم سب مل کر بہت اچھی طرح کھا سکتے ہیں اور اپنے آپ کو خوب مضبوط بنا سکتے ہیں۔ آخر ہمیں گلیوں کے آوارہ کنوں کی طرح لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ کاروبار میں مقابلے بازی اور مسابقت ضرور ہوتی ہے مگر ایسی نہیں کہ انسان ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں۔ بہر حال..... میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔“

ایک بار پھر اس نے ایک لمبے کیلئے خاموش ہو کر رپورٹرز کے چہروں کا جائزہ لیا اور بات آگے بڑھا دی۔ ”میں نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ ویس کی ماں اس کے جنازے میں شرکت کیلئے آ رہی ہے، وہ بڑی اچھی عورت ہے۔ جب ہمارے درمیان دشمنی نہیں ہوا کرتی تھی تو میں نے کئی بار ویس کے گھر میں اس کی ماں کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا کھایا ہے۔ معلوم نہیں کیوں ویس نے بھی اس پر اتنے تعلق کا بھی خیال نہیں کیا اور بندوبست بازی کے رخمان سے دور رہنے کی کوشش نہیں کی۔“

پھر اس نے سمجھا دیوں کو بتایا۔ ”میں جب بھی ویس یا دوسرے گروہوں کے لیڈروں کے سامنے امن کی تجویز پیش کرتا تو وہ اپنی شرائط پیش کرنا شروع کر دیتے تھے شاید وہ سمجھتے تھے کہ میں ان سے ڈرتا ہوں اس لئے امن کی باتیں کرتا ہوں۔ انہیں توقع ہوتی تھی کہ وہ مجھ سے اپنے مطالبات منوانے کے بعد امن کی پیشکش پر توجہ دیں گے۔ میں انہیں بتا دیتا چاہتا ہوں کہ میں اگر امن کی بات کرتا رہتا ہوں تو اس کی وجہ میری کمزوری نہیں بلکہ میری شرافت اور معقولیت ہے۔ میں کاروبار کرنے شہر میں آیا ہوں اور وہ میں کرتا رہوں گا کسی میں ہمت نہیں ہے کہ مجھے نکال سکے اور اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ مجھے قتل کر سکتا ہے یا شہر سے بھاگ سکتا ہے تو وہ کوشش کر کے دیکھ لے اور اگر کوئی امن کی بات کرنا چاہتا ہے تو میں ہر وقت اس کی بات سننے کیلئے تیار ہوں۔“

پھر وہ ایک اور پہلو کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ کیا سوچتے ہیں یا اخبار والے میرے بارے میں کیا لکھتے ہیں۔ اس کے باوجود میں نے یہ پریس کانفرنس اس لئے بلائی کہ میرے بعض دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اپنا موقف اور اپنے خیالات بہتر طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کیلئے کبھی کبھار اہم موقعوں پر پریس سے رابطہ کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے اپنے دوستوں کا مشورہ قبول کر لیا۔“

اس نے مزید بچ اور جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے اپنی تقریر جاری رکھی۔ ”بنیادی طور پر میں ایک برنس مین ہوں لیکن عام قسم کے کاروباری لوگوں سے ذرا مختلف ہوں۔ میں ذرا جوازی قسم کا برنس مین ہوں۔ میں صرف کاروبار میں ہی نہیں زندگی کے ہر معاملے میں قسمت آزمائی کرتا ہوں۔ بازی یا داؤ لگاتا ہوں اور ہر جوازی کی طرح جیتنے کا یقین رکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھ میں کوئی برائی، کوئی خرابی نہیں ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کو لوٹا نہیں۔ کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ کسی کے گھر میں نقب نہیں لگائی۔ کسی کی جبری نہیں توڑی، اب اگر کوئی مجھے قاتل مشہور کرنے کی کوشش کرے تو اس سے بڑی زیادتی کیا ہو سکتی ہے؟ مجھے کبھی کسی قتل کے الزام میں سزا نہیں ہوئی بلکہ پینٹیشنل بنیادوں پر دیکھا جائے تو مجھے کسی بھی معاملے میں کوئی سزا نہیں ہوئی۔ پولیس کے پاس میرا کسی بھی جرم کے سلسلے میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔“

ایک رپورٹر کے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ ”مجھے اسٹیٹ انارنی، انٹل پر اسکیپ فریا پولیس کا کوئی عہد یاد آ رہا ہے پوچھ گچھ کیلئے بلائے گا تو میں ضرور چلا جاؤں گا۔ میں کہیں چھپا ہوا نہیں ہوں، مفروضہ نہیں ہوں، میں تو یہیں موجود ہوں۔“

پھر اس کے ہونٹوں پر قدرے شاعرانہ مسکراہٹ آگئی۔ ”بلکہ اگر میری زبان کچھ زیادہ کھل گئی تو بہت سے پردہ نشینوں کے چہروں سے نقاب اٹھ جائے گا۔ بہت سے لوگوں کو شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ میرے سینے میں تو بہت سے لوگوں کے راز دفن ہیں اور یہ میرا ظرف ہے کہ میں ان کے بارے میں نہیں بولتا۔“

اس پر پریس کانفرنس کے بعد اخباری رپورٹرز، پولیس چیف کولنز سے بھی ملے۔ اس نے نہایت بد مزگی کے عالم میں اعتراف کیا کہ پولیس نے واقعی الکھن کو پوچھ گچھ کیلئے نہیں بلایا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔“ کولنز نے کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے اس کے پاس جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ثبوت موجود ہے، جب شکا گو میں فائرنگ ہوئی، وہ اس وقت سیرو میں تھا۔ ظاہر ہے الکھن جیسے لوگ کچا کام تو نہیں کرتے۔ اسے بلا نا محض وقت کا زیاں تھا لیکن میں نا امید نہیں ہوں۔ وہ کبھی نہ کبھی اس طرح ہماری گرفت میں ضرور آئے گا کہ پھر چھوٹ نہیں سکے گا۔“

تاہم کولنز کے لہجے کا کھوکھلا پن سب پر عیاں تھا۔ پریس رپورٹرز آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہتے تھے۔ ”شکا گو اور سیرو کا اصل حکمران تو الکھن ہے۔“

☆.....☆.....☆

ویس کا جنازہ کچھ زیادہ شان و شوکت سے نہیں اٹھا۔ بمشکل دو سو آدمی جنازے میں شریک تھے اور ان میں کوئی بچ یا سیاستدان نہیں تھا۔ مرنے کے بعد ویس کی جیب سے چند کاغذات برآمد ہوئے تھے جن سے کچھ افشاقات ہوئے تھے مثلاً یہ کہ اپنے کون سے قاتل کو بری کرانے کیلئے ویس نے کس بچ، ہر کاری وکیل یا جیوری کے درکن کو کتنی رقم میں خریدا۔ اس کے گروہ میں کیسے کیسے قاتل شامل تھے، اس کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا ایک آدمی جس کا نام ارلین تھا، ایک روز ایک سیلون میں پینے پلانے کے قتل میں مصروف تھا۔ دو دوست بھی اس کے ساتھ تھے، ان کے نام ریلے اور کیپ تھے۔

ارلین جب زیادہ ترنگ میں آیا تو نشانہ بازی کے موضوع پر اس کی ریلے اور کیپ سے بحث ہو گئی۔ ان دونوں نے فرما کر ڈالی کہ ارلین موقع پر ہی اپنی مہارت کا ثبوت پیش کرے۔ ارلین نے فوراً پتول نکالا اور سیلون میں ایک کونے میں سب سے زیادہ فاصلے پر بیٹھے ہوئے گاؤک کے سر کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔

گاؤک بیچارہ جس کا کسی کے جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جو ایک کونے میں آرام سے بیٹھا اپنے شغل میں منہمک تھا، پٹ سے گرا اور مر گیا۔

”دیکھا تم نے میرا نشانہ.....؟“ ارلین نے فخریہ لہجے میں اپنے دوستوں سے پوچھا۔

ریلے اور کیپ تو فوراً ہی پکڑے گئے لیکن اصل قاتل یعنی ارلین فرار ہو گیا۔ وہ اپنی نوائے کی طرف نکل گیا۔ ریلے کو مر قید کی سزا ہوئی۔ کیپ کو

بھی شاید سخت سزا ملتی لیکن اس کے خلاف ایک ہی چشم و گواہ میسر تھا اور فیصلہ کن پیشی سے ایک رات پہلے کی نے اس گواہ کا سر ہتھوڑے سے چکل دیا۔

ارلین دو سال بعد پکڑا گیا۔ چند ماہ جیل میں رہنے کے بعد اسے ریاست بدر کر دیا گیا۔ اسے دوسری ریاست کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔ وہ جب اس عدالت میں پیش ہوا تو نئے میں دھت تھا اس کے باوجود کسی قانونی قسم کی بنا پر جج نے اسے بری کر دیا۔

بہر حال ویس کی موت اور اس کے بہت سے قاتلوں کے جیل میں ہونے کی وجہ سے اس گروہ کی کمرٹ گئی۔ دوسرے گروہوں کے حوصلے بھی پست ہو رہے تھے۔ پچھلے چند سالوں کے دوران بہت سے لوگ ایک دوسرے کے بہت سے آدمیوں کو مار چکے تھے۔ بہت سے روپوش اور مفروضہ تھے۔ بہت سے گھروں میں صف ماتم چھپی ہوئی تھی۔

ہر گروہ میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو لڑاکے، قاتل یا دہشت گرد نہیں تھے۔ انہیں گروہوں میں ”دانشر“ کا درجہ حاصل تھا۔ وہ گویا گروہوں کا ”دماغ“ ہوتے تھے، وہ لوگ سر جوڑ کر بیٹھے اور آخر کار امن مذاکرات کیلئے ”اجلاس“ بلائے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ اجلاس اصل مافیائیلی کے سربراہ لہارڈو کے ”زیر صدارت“ ہوتا تھا۔

الکھن خوش خوشی اس اجلاس میں شرکت کیلئے پہنچا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ ہمیں امن قائم کرنا پڑے گا۔“

اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ہم نے اپنا ماحول ایسا بنالیا ہے جیسے ہم شہر میں نہیں بلکہ شنگھ گلیری میں رہ رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کا صفایا کر کے پولیس کو خوش ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں، بنیادی طور پر ہم کاروباری لوگ ہیں لیکن ہم نے کاروباری دنیا کو اپنے لئے موت کا میدان بنالیا ہے، ہمارے کاروبار پہلے ہی کچھ آسان نہیں ہیں۔ ہم جیسے مشکل کاروبار کرنے والوں کو تو چاہئے کہ وہ اپنے معاملات میں امن، سکون کا زیادہ خیال رکھیں تاکہ دن بھر کی مشکلات اور اعصابی تناؤ کے بعد وہ رات کو گھر جا کر سب کچھ بھول بھال کر زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں اور چین کی نیند سو سکیں، ہمارا یہ حال نہیں ہونا چاہئے کہ ہم کسی کھلی کھڑکی یا کچھ دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے بھی ڈریں۔“

اس کے بعد خاصے طویل مذاکرات ہوئے اور ایک تفصیلی ضابطہ اخلاق طے پایا جس کے خاص خاص نکات یہ تھے کہ ایک دوسرے کو اشتعال دلانے والی باتیں اور سختی نہیں کی جائیں گی۔ پولیس اور اخباروں کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہوئے ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کی کوشش نہیں کی جائے۔ اپنے آدمیوں کی غلطی پر ہر گروہ انہیں خود ہی سزا دے گا۔

اس کے علاوہ علاقوں کی تقسیم پر بھی نئے سرے سے اتفاق رائے ہو گیا اور طے ہو گیا کہ اس تقسیم کی سختی سے پابندی کی جائیگی۔ کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کے علاقے میں گھسنے اور اس کا دھندا ختم کر کے اپنا دھندا چھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ عام طور پر یہی چیز چیدہ چیدہ باتیں فساد کی وجہ بنتی تھیں، مل بیچہ کر یہ مسائل طے کر لئے گئے۔

اس کے بعد جنس مٹایا گیا جس کے دوران شرکاء کے درمیان کچھ اس قسم کے مکالمے بھی سننے میں آئے۔

”وہ رات یاد ہے جب ہماری دو کاریں تمہاری کار کا تعاقب کر رہی تھیں؟“

”یقیناً یاد ہے۔“

”ہم اس رات جنہیں قتل کرنے گئے تھے مگر صرف اسلئے چھوڑ دیا کہ کوئی عورت تمہاری ساتھی تھی۔“

اس بات پر حقہ لگا کر خوشی اور شکر گزاری کا اظہار کیا گیا۔ امن معاہدے میں یہ بھی طے پایا تھا کہ آئندہ کوئی اپنے ساتھ مسلح باڈی گارڈ نہیں رکھے گا۔ اس کے دو دن بعد ایک اسکواڈ کار نے تیز رفتاری سے جاتی ہوئی ایک کار کا تعاقب کیا اور کچھ آگے جا کر اسے روک لیا۔ اس کار میں الکھن تھا۔

میک کلو اسکے ڈرائیور کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ جان نوریو کے زمانے سے الکھن کے ساتھ تھا اور درحقیقت ایک گمن مین تھا۔ الکھن پر جب سوئکن کے قتل کا الزام آیا تھا تو اس میں میک کلو کا نام بھی شامل تھا۔

”میں تو صرف شیو بنائے آیا ہوں۔“ الکھن نے سارجنٹ کی طرف دیکھ کر انتہائی خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے کہا پھر اپنے قریب رکھے بیگ کی طرف اشارہ کیا جس میں گولف کی چھڑیاں تھیں۔ ”اس کے بعد میں گولف کورس جاؤں گا۔“

پولیس نے میک کلو کی اور پھر پوری کار کی تلاشی لی لیکن انہیں کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ وہ جیران رہ گئے، انہیں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”امن معاہدے پر خوش اسلوبی سے عمل ہو رہا ہے۔“ میک کلو پولیس والوں کی طرف دیکھ کر شاعرانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ورنہ میں بھلا تمہیں غیر مسلح حالت میں مل سکتا تھا؟“

پولیس والوں کو اور کچھ نہیں سمجھا تو انہوں نے تیز رفتاری کے جرم میں اس کا چالان کر دیا۔

1926ء کے اختتام تک بھی امن امان کی یہ فضا برقرار رہی۔ کچھ بد معاش اور قاتل جیلوں میں بند رہے۔ کچھ کے مقدمات چلتے رہے صرف ڈپل کے بھائیوں نے ایک بار معاہدے کی کچھ خلاف ورزی کی، انہیں گولیاں لگیں تاہم وہ مرنے سے بچ گئے۔ الکھن کو کسی نے نہیں چھیڑا اور کوئی اس کیلئے خطرے کا باعث نہیں بناتا تاہم اس دوران ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

اسٹین نامی ایک شخص الکھن کا نو جوانی کا دوست تھا۔ ہاتھوں ہاتھ اور اس کے برابر میں واقع دوسرا ہوٹل گواک الکھن کی عی کا تھا لیکن کاغذات میں ان کا مالک اسٹین تھا۔ ایک روز وہ غائب ہو گیا اور اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

الکھن کے سوانح نگاروں میں سے ایک نے لکھا ہے۔ ”جس روز اسٹین غائب ہوا، اس رات الکھن کو ایک بار میں بیٹھے دیکھا گیا جہاں وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا، وہ اپنے دوست کی گمشدگی پر سخت غمزہ دھتا۔“

اسٹین کی لاش ایک ماہ بعد ملی۔ شریف ہوف مین بھی اس بات پر حیران تھا کہ اسٹین کے قتل پر الکھن کی طرف سے کوئی سخت رد عمل کیوں سامنے نہیں آیا؟ گروہوں کے درمیان کوئی جنگ کیوں شروع نہیں ہوئی؟

افواہ یہ سننے میں آئی کہ الکھن خود نئے اور اشتعال کے عالم میں اسٹین کو قتل کر بیٹھا تھا۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ اس کے حکم پر اس کے دو آدمیوں نے اسٹین کو اتار مارا تھا کہ وہ ہلاک ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی اختلاف ہو گیا تھا اور اسٹین نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جس سے الکھن نے سخت توہین محسوس کی تھی۔

بہر حال یہ معر حل نہیں ہو سکا کہ اسٹین کو کس نے اور کیوں مارا؟ تاہم یہ طے تھا کہ یہ کسی دوسرے گروہ کی حرکت نہیں تھی۔ اس دوران کسی گروہ کے ہاتھوں بھی ایک لڑاکا مارا گیا۔ کرسس قریب تھا، اس کے بھائیوں نے تمام گروہوں سے اپیل کی کہ کم از کم کرسس کے موقع پر تدفین کیلئے اس کی لاش دے دی جائے لیکن لاش کا کچھ پتہ نہ چلا۔

دو دن بعد دو بچے کھیل کو دارو درواز بھاگ کے دوران ایک میدان کے قریب گڑھے میں جا گرے۔ وہاں انہیں ایک شخص کی لاش پڑی ملی۔ اس کے بعد مزید قتل ہوئے لیکن ان محسوس میں امن برقرار رہا کہ گروہوں کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہوئی۔ اس دوران الکھن کو گویا مزید ”بڑا آدمی“ ہو گیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ انفرادی سطح پر کسی سے نمٹ لیتا تھا لیکن درحقیقت اب اسے کوئی چھیڑتا نہیں تھا۔

نیا سال شروع ہوا تو جارج جانسن نامی ایک شخص نیا امریکی انٹارنی منتخب ہو گیا۔ الکھن کی نظر میں یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔

(جاری ہے)



الکھون نے اب اپنا ہیڈ کوارٹر میٹروپول ہوٹل میں منتقل کر لیا تھا جو اس کے اور جان نور پور کے سابق ہیڈ کوارٹر ”فورڈ پوسٹ“ سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ یہ ایک اچھا معیاری اور شاندار ہوٹل تھا۔ الکھون نے ابتداء میں اس میں دس کمرے حاصل کئے تھے۔ اس کا اپنا شاندار اور کشادہ سوئٹ ان کمروں کے علاوہ تھا۔

”میں کسی کی گھرانی نہیں کر رہا۔ میری بیاس ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔“  
 پہلے نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں جواب دیا۔  
 ”کل کے چھوکرے.....! میرے سامنے زبان چلاتے ہو؟ پولیس کی وردی پابن کرم اپنے آپ کو کیا سمجھ رہے ہو؟“ ڈرچی کچھ اور برہم ہو کر بولا۔ ان دنوں بیشتر پولیس والے اس جیسے بد معاشوں کے سامنے دیکھے ہوئے تھے۔



ترجمہ: محمود احمد مودی

قسط: 14

# الکھون

جلدی ہی اس نے یہاں دو فلوورز پر پچاس کمرے لئے۔ یہ علاقہ اس کیلئے زیادہ محفوظ تھا کیونکہ یہاں قریب ہی میٹر تھامسن کے دفاتر بھی تھے۔ گویا ایک بہت بڑا قانون شکن خود چل کر قانون کے محافظوں کے قریب آ گیا تھا۔

جب برٹین قتل ہوا، ان دنوں پولیس کے سرخسراؤں کا سراہہ ہیوز ہوا کرتا تھا۔ برٹین کے قتل کی وجہ سے اس کی ذات کچھ اس طرح ایکٹو کی زد میں آئی کہ وہ کچھ عرصے کیلئے محفل بھی ہو گیا تھا لیکن کچھ عرصے بعد وہ کاؤنٹی کے ہائی وے کی پولیس کا چیف بن گیا تب وہ شہر بگھارنے لگا کہ اس نے الکھون کو تیسروں سے نکال بھاگایا ہے۔

یہ بات جب الکھون کے کانوں تک پہنچی تو وہ میٹروپول ہوٹل میں اپنے شاندار سوئٹ میں بیٹھے بیٹھے خوب ہنسا پھر خود شہر سے بولا۔ ”وہ بے چارہ مجھے کیا لگا لگا، وہ تو ان دنوں محفل تھا جب میں نے یہاں..... میٹروپول میں ہیڈ آفس بنایا۔“

الکھون اب واقعی بہت ”بڑا“ آدمی بن چکا تھا۔ میٹروپول میں اس کے منتقل ہونے سے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی بہت بڑی کنبی یا کوئی سرکاری ادارہ وہاں منتقل ہوا ہے۔ راہداریوں میں سب گارڈز ادھر سے اُھر آتے جاتے دکھائی دیتے۔ دن بھر الکھون سے ملنے کیلئے آنے والوں کا تاننا بندھا رہتا جن میں ابھی بھی معروف کاروباری، سیاسی اور سماجی شخصیات کے علاوہ پولیس آفیسر بھی ہوتے تھے۔ اب ان میں سے کوئی بھی الکھون سے ملنے کیلئے آئے میں شرم یا ہتھیانہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ کوئی منہ چھپا کر نہیں آتا تھا۔ سب علی الاعلان آتے تھے۔ ہر ایک کے پاس کوئی مستقل جواز موجود ہوتا تھا۔ انہیں ملاقات کیلئے انتظار بھی کرنا پڑتا تھا۔

الکھون کے پچاس کمروں میں سے دو کمروں میں جننازم بھی تھا۔ وہ اپنے آدمیوں پر زور دیتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے ورزش کیا کریں اور خوش لباس نظر آیا کریں۔ وہ اپنے غنڈوں، بد معاشوں کو بھی روایتی بد معاشوں والے انداز میں شیو بڑھاوے، شکن آلود کپڑے پہنے، جمایاں لیتے ادھر ادھر گھومتے دیکھنا قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔

وہ اپنے آدمیوں سے کہتا تھا۔ ”اندر سے آپ چاہے جتنے بڑے بد معاش ہوں لیکن ظاہری طور پر آپ کو بد معاش نظر نہیں آنا چاہئے۔ آپ کو کوئی الامکان ایک معزز کاروباری شخصیت نظر آنا چاہئے۔“

اس نے گینگ لینڈ یا انڈر ورلڈ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے کاروباری سیٹ اپ، انداز و اطوار اور اس کے آدمیوں کے ظاہری طور پر پتے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک قسم کی مافیا کا سربراہ ہے اور اس کے تمام دھندے غیر قانونی ہیں۔

تھامسن تیسری مرتبہ میز تختہ ہو چکا تھا اور اس بار وہ اصلاح پسند میز ڈیور کو ہرا کر آیا تھا۔ الکھون جیسے لوگوں کے حق میں تھامسن کا دورا جمنا ثابت ہوتا تھا کیونکہ وہ زیادہ سخت گیری اصول پسند نہیں تھا۔

انتخابی مہم کے دوران اس کے مقابلے میں پیچھاہ ڈیور افسوں کے ساتھ چلا تا ہی رہ گیا تھا۔ ”یہ کس قسم کا آدمی ہے؟ اس کے پاس تو دماغ نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے، میں جب بھی اس سے شہر کے مسائل کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، وہ بس ایک لغو لگا دیتا ہے، سب سے پہلے امریکا.....! لگتا ہے اسے اس کے سوا کوئی بات ہی کرنی نہیں آتی۔“

ڈیور کتب افسوں ہی ملتا رہ گیا اور تھامسن میز بن گیا۔ اس کی دینا منتداری، شرافت اور اصول پسندی اس کے کسی کام نہ آئی۔ سیاست میں اکڑا لیا ہوتا ہے۔ تھامسن کی انتخابی مہم میں الکھون اور اس کی قبیل کے دوسرے لوگوں نے خوب دولت خرچ کی تھی۔ انہیں معلوم تھا وہ جتنا خرچ کر رہے ہیں، اس سے میگزوں گنا کمائیں گے۔

تھامسن نے اپنی انتخابی مہم کے دوران صاف طور پر کہہ دیا تھا۔ ”شہر میں جتنے بھی تفرق کے اڈے بند کئے گئے ہیں، میں نہ صرف انہیں کھول دوں گا بلکہ ہم ہزاروں نئے اڈے بھی کھولیں گے، ہم چاہتے ہیں جب لوگ اپنے کام کاج، روزمرہ مصروفیات اور پریشانیوں سے تھک جائیں تو ان کے پاس تفریح کے لئے حسب استطاعت کوئی جگہ موجود ہو، انہیں ہر وقت پولیس کا حذر کا نہ لگا رہے، پولیس کے پاس اتنے اختیارات نہیں ہونے چاہئیں کہ وہ جس کے چاہے کھریڈکان میں گھس جائے، جس کی چاہے تلاشی لیٹے لگے، جس کا چاہے کان منجھ لے۔ پولیس کو وارنٹ کے بغیر کسی جگہ کی تلاشی کا اختیار نہیں ہونا چاہئے۔“

الکھون نے اپنے دفتر میں جارح و انتہائیں اور ابراہام لنکن کی تصویروں کے ساتھ تھامسن کی تصویر لگائی ہوئی تھی۔

انتخابی مہم کے دوران بد معاشوں کی بد معاشیاں عروج پر تھیں اور وہ تھامسن کو میز بنوانے کے لئے ہر ہتھکنڈے آزما رہے تھے۔ حالانکہ ابھی ڈیور ہی میز تھا مگر لگتا تھا کہ بد معاشوں کی دنیا شہر کو کسی اور ہی بھاؤ میں لئے جا رہی تھی۔ انہی سرگرمیوں کے دوران ڈرچی، جو اتھ تھ سائیڈ رز کا ایک اہم گن مین تھا، ایک پولیس آفیسر کے ہاتھوں مارا گیا۔

وہ پولیس آفیسر مشکل چیمپس سال کا نو جوان تھا، اس کا نام پہلے تھا۔ وہ ایک دینتدار اور اصول پسند پولیس آفیسر تھا۔ بد معاشوں کو پسند کرتا تھا۔ میٹروپور نے پولیس آفیسرز کو ہدایت کی تھی کہ وہ دہشت گردوں کے بد معاشوں پر نظر رکھے جو اسلحا استعمال کرنے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔

ایک روز پہلے ایک بار کے سامنے کھڑا تھا کہ ڈرچی اندر سے نکلا۔ پہلے گا باہر کھڑے دیکھ کر اس کی پیشانی پر پل پڑ گئے اور وہ سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے غرایا۔ ”تم یہاں میری گھرانی کیلئے کھڑے ہو؟“

”جاؤ..... اپنا کام کرو۔“ پہلے نے اسے بازو سے پکڑ کر دوسری طرف گھمانے کی کوشش کی۔

اس پر ڈرچی اور زیادہ تپ گیا۔ وہ پھٹکانے کے انداز میں بولا۔ ”تمہیں میرا بازو پکڑ کر جھٹکا دینے کی جرأت کیسے ہوئی؟“

”میں نے تمہیں کوئی جھٹکا وغیرہ نہیں دیا۔ میں تو تمہیں یہاں سے جانے کا موقع فراہم کر رہا ہوں۔“ پہلے نے گویا الفاظ کو چباتے ہوئے جواب دیا۔

ان کے درمیان بھرا ہوا گئی تو پہلے نے ہسٹول نکال لیا اور ڈرچی کو گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ ڈرچی نے جانتا جاہا۔

”پولیس اسٹیشن.....؟“ پہلے نے جواب دیا۔ ”میں اس واقعے کی رپورٹ کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ باتیں ریکارڈ پر رہیں جو تم اس وقت کر رہے ہو۔“

ڈرچی کو گاڑی میں بیٹھنا پڑا اور جب پہلے اسے لے کر پولیس اسٹیشن کے سامنے پہنچا تو چار قانونی کی آواز لگنی اور جب چند پولیس والے صورتحال کا جائزہ لینے آئے تو انہوں نے ڈرچی کو مردہ حالت میں گاڑی کی اگلی سیٹ پر پڑے دیکھا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ پہلے گاڑی کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہسٹول تھا اور وہ بالکل پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے اپنے افسران بالا کو اس واقعے کی جو رپورٹ پیش کی، اس میں مندرجہ بالا تفصیلات اور مکالے وغیرہ لکھنے کے بعد اس نے مزید لکھا۔

”جب میں ڈرچی کو پولیس اسٹیشن لارہا تھا تو تمام راستے وہ مجھے گالیاں دیتا رہا، پولیس اسٹیشن پہنچ کر میں نے اسے گاڑی سے اترنے کیلئے کہا تو اس نے مجھے ایک لات رسید کی اور بولا۔ ”تم کیا سمجھ رہے ہو کہ یہ ہسٹول ہاتھ میں پکڑ کر تم بہت بڑی چیز بن گئے ہو؟ میں اس ہسٹول سمیت تمہیں جہنم میں پہنچا دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ سے ہسٹول چھیننے کی کوشش کی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ہسٹول میرے ہاتھ سے جھین کر وہ مجھے ہلاک کر دے گا۔ میری جان کو خطرہ تھا اس لئے میں نے اپنے دفاع میں اس پر گولی چلا دی۔ دو گولیاں کھانے کے بعد بھی وہ چونک بھاٹپائی سے باز نہیں آیا، اس لئے مجھے دو گولیاں مزید چلائی پڑیں۔“

یہ معاملہ عدالتی تحقیقات کیلئے بھی پیش ہوا۔ عدالت میں ڈرچی کے وکیل نے اپنے بیان کے دوران کہا۔ ”جب ڈرچی کو قتل کیا گیا.....!“

اس پر سرخسراؤں کے سربراہ شیکر نے ناک بھوں چڑھا کر اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔ ”تم سے کس نے کہا کہ ڈرچی کو قتل کیا گیا تھا؟ کیا عدالت نے ایسا کوئی فیصلہ دے دیا ہے؟ تم یہ الفاظ استعمال کر کے تو بین عدالت کے مرتکب ہو رہے ہو۔“

پہلے پر کوئی آنچ نہ آئی۔ اس کے ڈپارٹمنٹ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے افسروں نے تو اسے بہادری کا مظاہرہ کرنے پر ایک تحفہ دینے کا بھی اعلان کر دیا۔ پہلی بار ایک خطرناک بد معاش اس انجام کو پہنچا تو پولیس والوں کا مورال کچھ بلند ہوا۔ مجرموں کے دیکھوں نے کافی دوا لیا کیا اور اسے ”قانون کی مدد سے قتل“ قرار دیا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔

تھامسن کے میز بننے سے الکھون کیلئے ماحول مزید سازگار ہو گیا تھا تاہم کبھی کبھار کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ جاتا تھا مثلاً ایک بار اس کی ایک بریوری پر فیڈرل اینٹیٹھون نے چھاپہ مارا۔ الکھون کو یقینی اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکی۔ اس کا کوئی تجربہ اسے خبردار نہ کر سکا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فیڈرل اینٹیٹھون نے پولیس کو اس چھاپے کے بارے میں خط بھی لکھ نہیں بتایا تھا بعد میں ایک ایف بی آئی ایجنٹ نے کچھ لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اندازہ ہو گیا ہے کہ اس قسم کے کسی چھاپے میں اگر پولیس کو شریک کر لیا جائے یا اسے اس کا ردوائی کے بارے میں شک بھی کچھ معلوم ہو جائے تو کچھ لینا چاہئے کہ چھاپہ بنا کام ہو جائے گا، حالات تو یہ ہو گئے کہ جو بریوری اس میں رکھی جاتی ہیں اور ان پر پولیس تعینات کر دی جاتی ہے، وہاں پولیس ہی کی گھرانی میں شراب تیار ہوتی رہتی ہے اور پہلے سے بھی زیادہ ٹکس چوری ہوتا رہتا ہے۔ پہلے چھوڑا بہت ٹکس دکھاوے کے لئے حکومت نکال رہا ہوتا ہے، وہ کی بند ہو جاتا ہے۔“

الکھون کی جس بریوری پر چھاپہ پڑا، اس میں کام کرنے والے بڑے حیران ہوئے۔ الکھون اب اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ اس کے معمولی کارکن تو بھی سمجھتے تھے کہ اس کے کسی کاروبار پر کوئی چھاپہ نہیں مار سکتا۔ اس چھاپے کے دوران الکھون کے ایک آدمی نے جا کر رازدارانہ انداز میں ایف بی آئی والوں کو بتایا۔ ”یہ الکھون کی بریوری ہے، آپ چھاپہ نہ ماریں، آپ جس طرح چاہیں گے، اس طرح ہو جائے گا۔“

اس آدمی کو اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب ایف بی آئی ایجنٹ نے اس کی بات پر توجہ ہی نہیں دی۔ اس بھیارے کا خیال تھا کہ اس کے پاس الکھون کا نام نہ کر تو بڑے بڑے افسر چوڑی بھول جاتے تھے اور ”مک مکا“ کی بات سے تو کوئی نا اقل رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

بہر حال اس قسم کے واقعات سے اب الکھون کی بادشاہت میں کوئی خاص ٹپل پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اب ایک ایسی شخصیت بننا جا رہا تھا جسے بہت سے لوگ اور ادارے اپنی نہایت خاص تقریبات میں مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کرنے لگے تھے۔ بعض ایسی تقریبات جن میں

بہت زیادہ حفاظتی انتظامات کی ضرورت ہوتی تھی، ان کے بارے میں لوگ ایک دوسرے کو مشورہ دیتے تھے۔ ”بھئی تمہیں پولیس یا کسی اور ایجنسی سے حفاظتی انتظامات کی درخواست کرنے کی ضرورت نہیں، الکھون کو مہمان خصوصی کے طور پر بلا لو، اس کے گارڈز آ کر خود ہی سارے حفاظتی انتظامات سنبھال لیں گے۔“ اور پولیس سے زیادہ اچھی طرح سنبھال لیں گے۔ تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔“

یہ حقیقت تھی کہ جہاں الکھون خاص طور پر اپنے گارڈز کے ساتھ موجود ہوتا تھا، وہاں حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں کسی کو کوئی فکر نہیں رہتی تھی۔ ستم طریقہ تو یہ تھی کہ ایک بار خود پولیس ڈپارٹمنٹ نے اپنی ایک تقریب میں حفاظتی انتظامات بہتر بنانے کے خیال سے الکھون کو خاص مہمان کے طور پر مدعو کر لیا۔

درحقیقت الکھون نے اپنی شخصیت کا تاثر معززانہ بنانے کیلئے خاصی محنت بھی کی تھی اور اس پر پہلو پر خصوصی توجہ دی تھی۔ وہ فلاحی کاموں میں حصہ لیتا تھا۔ رفاہی کاموں کیلئے چندے دیتا تھا اور کسی قسری کام میں حصہ لینے کیلئے نہیں نکلتا تھا۔

اس کی شخصیت کا یہ ایک عجیب پہلو تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ ایک مہنگسٹ تھا۔ نہ جانے کتنے انسانوں کے خون سے اس کے اپنے ہاتھ رنگے ہوئے تھے اور نہ جانے کتنے انسانوں کی موت کا وہ بالواسطہ طور پر ذمے دار تھا، اس کا کوئی بھی دھندا جائز اور قانونی نہیں تھا۔ اس کے باوجود جب لوگوں کو اس کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ گویا اس کے بارے میں یہ ساری باتیں فراموش کر دیتے تھے۔

وہ اس شیر کی طرح تھا جو بظاہر پالتو دکھائی دیتا تھا۔ بے ضرر سے انداز میں اپنے گھر میں ٹپل رہا ہوتا تھا لیکن سب کو معلوم تھا کہ ضرورت کے وقت وہ کسی کو بھی پیر پھاڑ کر کھا جائے گی ملاحیت رکھتا تھا۔ وہ بلا کا خوش لباس تھا۔ نہایت عمدہ اور قیمتی لباس پہنتا تھا۔ سب سے شاندار ہیٹ سر پہنکھتا تھا۔ اس کی ٹائی میں ہیرے کی پن اور ایک دو انگلیوں میں ہیرے کی انگلی ضرور جھکائی تھی۔ اس کا قد لمبا، جسم بھاری اور ورزش تھا۔ اپنے غیر معمولی لباس اور نمایاں سراپا کے ساتھ جب وہ کسی تقریب یا محفل میں پہنچتا تھا تو اس کی طرف دیکھتے ہی لوگوں کو احساس ہوتا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی آدمی ہے اور یقیناً کچھ ناقابل وضاحت قسم کی غیر معمولی قوت اور اختیارات کا مالک ہے۔

وہ ہمیشہ خوش مزاج نظر آتا تھا۔ چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ اگر کبھی کسی خاص ہی بات پر وہ کسی کی طرف سرد نگاہوں سے دیکھ لیتا تھا تو اس کا خون خشک ہونے لگتا تھا۔ اگر اسے کوئی ایسا شخص کسی محفل میں دیکھتا جو اس سے واقف نہ ہوتا، تو شاید اس پر اسے کسی سربراہ مملکت کا گماں گزرتا۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ ایک مہنگسٹ ہونے کے باوجود اسے شہر میں ایک ”سیلبرٹی“ کا مقام بھی حاصل تھا۔

وہ بے حد فدا خد، شاہ خرچ اور غریبوں یا ضرورت مندوں کے کام آنے والا بھی تھا۔ اس سے زمانے میں بھی اپنے دوستوں اور رشتے داروں کے لئے اس کی کرسی کی شاہجنگ کا بل ایک لاکھ ڈالر تک جا پہنچتا تھا۔ بعض دوستوں کو اس نے پتلون کی ایسی بیٹ بھی تحفے میں دی جس کے بگل پر ان کے نام کے ابتدائی حروف تھے جسے ہیروں سے بنے ہوئے تھے۔

وہ دنیا بھر کے موضوعات پر نہایت عمدہ گفتگو کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں جس مزاج بھی غضب کی تھی۔ سیاست، آرٹ، حالات حاضرہ، اسپورٹس، معیشت غرضیکہ کوئی موضوع ایسا نہیں تھا جس پر وہ مدھی سے نہ بول سکتا ہو۔

اسے احساس تھا کہ اس کی شان و شوکت کی اصل بنیاد غیر قانونی شراب کے دھندے پر تھی۔ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ کہتا تھا۔ ”بیشتر معاشرے ہمیشہ سے اقتصادات کا مجموعہ رہے ہیں۔ میری شراب جب تک ٹکسوں پر لدی ہوتی ہے، نہ ناجائز ہوتی ہے، جب وہ کسی معزز آدمی کے گھر میں ٹرے میں خوبصورت گلاس رکھ کر ان میں داخل کر رہا ہوں تو کچش کی جاتی ہے تو خاطر مدارات کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔“

جائز ناجائز دولت کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ کہتا تھا۔ ”میرے خیال میں تو دنیا کے بیشتر بادشاہوں کے پاس جود دولت تھی، وہ ناجائز ہی تھی۔ بادشاہ بھلا کون سا کاروبار کرتے تھے جو ان کے پاس اتنی دولت ہوتی تھی؟“

ایک بار اس نے معززین کی ایک محفل میں شراب کے دھندے کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ستم طریقہ ہے کہ جن بھجوں کی عدالتوں میں ہمارے مقدمے چلتے ہیں، ان کے گھروں میں بھی ہماری شراب استعمال ہوتی ہے۔“

اخلاقیات کے موضوع پر بھی وہ زور دھور سے بولتا تھا۔ ہر دور کے لوگ یہی کہتے آئے ہیں کہ گزرا ہوا زمانہ اچھا تھا، وہ بھی کہا کرتا تھا۔ ”میرے لڑکپن کے دور میں اخلاقی قدروں کی بڑی اہمیت تھی۔ آج کے نوجوان ان نظروں میں تو اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، وہ کسی کی عزت کو تاننا نہیں جانتے۔“

خاندانی منصوبہ بندی کے وہ خلاف تھا۔ اس کے خیال میں یہ قوموں کو کمزور کر دینے کا راستہ تھا۔ عورتوں کے حقوق کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ کہتا تھا۔ ”آج کی عورت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے گھر سے باہر اس کی دلچسپی کے بہت سے عوامل پیدا کر دیئے ہیں جبکہ عورت کی اصل جگہ اس کا گھر ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ قابل توجہ چیز اس کے بچے ہونے چاہئیں، آج کے دور کی پریشانیوں کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نے عورت کو گھر سے باہر نکال دیا ہے۔“

بریں عورتوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے وہ کہتا تھا۔ ”یہ عورتیں باضابطہ طور پر کسی الگ تھلک جگہ پر..... کسی مخصوص ٹھکانے پر رہتی ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ اس جگہ کے بارے میں سب کو علم ہو گا کہ وہاں ایسی عورتیں رہتی ہیں لیکن اگر آپ ان پر پابندیاں لگا نہیں گے یا زبردستی انہیں شتم کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ آپ کے پاس پڑوس میں آ جائیں گی۔ پوری سوسائٹی میں پھیل جائیں گی۔ طرح طرح کے روپ دھاریس کی جن میں سے کئی روپ بظاہر معززانہ بھی دکھائی دیں گے، آپ کو یہ یقین نہیں چلے گا کہ آپ کے گھر کی عورتیں بڑے اشتیاق سے جس عورت سے مل رہی ہیں اور رسم و رواج بڑھا رہی ہیں، وہ کون ہے؟“

اس طرح وہ اکثر موضوعات پر دانثورانہ انداز میں اظہار خیال کرتا تھا۔

اس کی شخصیت اور شہرت کے افسانے دور دور تک پھیل گئے تھے۔ جس طرح ہر شہر میں کچھ چیزیں سیاہوں کیلئے کشش کا باعث ہوتی ہیں، اس طرح اب الکھون کا نام بھی ایسی چیزوں کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا جنہیں بیرون شہر سے آنے والے دیکھنا چاہتے تھے۔ کئی مسافروں سے بھری ہوئی ہمیں اس امید پر میٹروپول کے سامنے سے گزرتیں کہ شاید اس کی کوئی جھلک نظر آ جائے۔

الکھون اگر کبھی باہر نکلتا تھا تو کم از کم اٹھارہ مسلح گارڈز اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں ہوتے تھے۔ بیرون شہر سے آئے ہوئے لوگ جب کسی سڑک سے گزر رہے ہوتے اور اوجا چک کوئی ایک عجیب سی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیتا۔ ”وہ الکھون کی گاڑی جا رہی ہے“ تو سب اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے جلدی سے ادھر پھرتے۔

گاڑی کی تھی اسٹیل کا ایک چھوٹا سا قلعہ تھی۔ اس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں گاڑیوں کی گزریاں ہوتی تھیں، وہ تھیں اور اوجا چک ابھی اسی طرح اس کے گرد انسانوں کی دیوار ہوتی تھی جو اس کی جگہ گولی کھانے کیلئے تیار ہوتے تھے۔

جس طرح اس کی آمدنی بے حساب تھی، اسی طرح اخراجات بھی بے اندازہ تھے۔ 1929ء میں اس نے صرف پولیس کے تحفے اور سیاسی عہدیداروں کو رشوت کے طور پر 3 کروڑ ڈالر دیئے تھے۔ اسے خود بھی اپنی آمدنی کا صحیح اندازہ نہیں تھا اور کچھ کاغذات میں ظاہر کی جاتی تھی، وہ اس کی آمدنی کا دواں حصہ بھی نہیں تھی۔



اس کے اپنے رکن مکن اور عادات و اطوار میں بے پناہ شاہ خرچی تھی اوپر سے اسے خود بھی جوا کھیلنے کا شوق تھا اور وہ اکثر بہت بڑی بڑی بازیاں لگاتا تھا۔ اکثر وہ پچاس ہزار ڈالر کی لکڑی لے کر جوا خانے میں داخل ہوتا اور جیت تک اس کے پاس کچھ نہ ہوتا۔ کبھی کبھی تو وہ ایک رات میں ایک لاکھ ڈالر ہار جاتا۔



وہ ریس کا بھی زبردست رسیا تھا۔ ریس ٹریک چونکہ اس کے سابق یڈ کوارٹر ہاں تھا تو وہیں کے قریب ہی تھا، اس لئے وہاں بھی اس کی مدد و رفت خوب رہتی تھی۔ جاکوں اور ایک میکرز سے اس کے قریبی تعلقات تھے۔ کبھی کبھی اسے جج بھی اور اندر کی معلومات بھی مل جاتی تھی اور وہ جیت بھی جاتا تھا لیکن زیادہ تر ہار ہی تھا اور ریس مٹا ہی تھا۔ ایک بار اس نے ایک صحافی کو ریس ٹریک میں دیکھا۔ اس روز اس کے پاس ایک ٹھوس شپ تھی، اس نے دیکھا کہ صحافی کسی اور گھوڑے پر رقم لگا رہا تھا جبکہ الگھون کے پاس کسی اور گھوڑے کے بارے میں شپ تھی۔

”اے بیکر.....!“ الگھون نے خوش مزاجی سے صحافی کو مخاطب کیا۔

”تم پانچ نمبر گھوڑے پر رقم کیوں نہیں لگاتے؟“

”پانچ نمبر.....؟“ بیکر نے غارت سے کہا۔ ”وہ بھلا بھی جیت سکتا ہے؟“

”تم لگا کر تو دیکھو۔“ الگھون نے اصرار کیا۔

صحافی نے مسکراتے ہوئے گویا صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”بھئی تم تو خود ہار رہے ہو۔“

”جیتنے کے لئے کیا مشورہ دے رہے ہو؟“

الگھون نے اس کی صاف گوئی کا برا منائے بغیر اپنے ایک گارڈ کو اشارہ کیا اور اس نے پانچ نمبر گھوڑے کا پانچ ڈالر کا ٹکٹ لاکر زبردستی بیکر کی جیب میں ڈال دیا۔

جب بیکر نے اس ٹکٹ کی وجہ سے سو ڈالر جیتے تو وہ سر پیٹنے لگا کہ اس نے الگھون کا کہنا کیوں نہیں مانا اور زیادہ رقم کیوں نہیں لگائی۔ لیکن ایسا روز روز نہیں ہوتا تھا، زیادہ تر وہ ہار ہی تھا تاہم وہ بیکوں کا حساب چکانے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کرتا تھا۔

1927ء میں وہ اپنے دوستوں کو بتا رہا تھا۔ ”بچھلے صرف دو سال

میں، میں نے گیارہ لاکھ ڈالر گھوڑوں پر گنوائے ہیں۔“ جبکہ اس زمانے

میں اس کے دھندے اتنے زیادہ پھیلے بھی نہیں تھے جتنے بعد میں پھیلے،

اس سے اگلے دو سالوں میں وہ تقریباً 8 ملین ڈالر گھوڑوں پر ہار بیٹھا

تھا۔ اس کے قریبی جاننے والے کہا کرتے تھے۔ ”جوا کھیلنے وقت وہ

اندھا ہو جاتا ہے۔“

اس کے ساتھ ساتھ اس کے کبھی انداز و اطوار شاہانہ تھے۔ اس بھی

پارٹیاں شہر میں کوئی نہیں دیتا تھا۔ اچھے بھلے امیر لوگ بھی اپنی پارٹیوں پر

پورے سال میں اتنا خرچ نہیں کرتے تھے جتنا وہ ایک پارٹی پر خرچ

کر دیتا تھا۔ اس کی پارٹیوں میں آنے والوں کو جویش و عشرت میسر آتی

تھی، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بعض اوقات وہ پارٹی کے لئے

پورا ہونٹ یا ریستورنٹ بک کراتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ چھوٹے لوگوں اور کم تنخواہوں والے ملازموں کو

شپ دینے اور نوازنے میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ ہڈیوں اور ہڈیوں

میں وہ پیڑوں اور ہیٹ، کوٹ سنبھالنے والی لڑکیوں کو بھی سوچا س ڈار

سے کم نہیں دیتا تھا۔

اسے اپنی عزت اور زبان کا بہت خیال رہتا تھا۔ اس کے دشمن بھی

تسلیم کرتے تھے کہ اگر وہ کسی کو زبان دے دیتا تھا تو آنکھیں بند کر کے

سمجھ لیتا چاہے تھا کہ وہ اسے پورا کرے گا، وعدہ خلافی کا اس کے ہاں

کوئی تصور نہیں تھا۔

ایک طرف وہ اتنا سنگدل تھا کہ اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کتنے قتل

کر چکا تھا لیکن دوسری طرف غریبوں، ناداروں اور کم وسیلہ لوگوں کے

لئے اس کی مدد ملی اور فاضلی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

ایک بار وہ ایک ریستورنٹ میں کھڑا تھا کہ باہر سے اخبار بیچنے والا

ایک لڑکا اندر آ گیا۔ اس شام باہر بہت ٹھنڈی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی

تھی۔ لڑکے کے جسم پر بوندہ اور نا کافی لباس تھا، وہ ٹھنڈی وجہ سے

شوں شوں کر رہا تھا اور اپنے بازو پر اخباروں کا بنڈل اٹھائے ہوئے تھا

جسے اس نے ہلائنگ کی شیٹ میں لپیٹا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ریستورنٹ میں

بیٹھا ہوا کوئی گا کہ اخبار خرید لیتا تھا اسی امید پر اخبار فروش لڑکے

ریستورنٹ کا چکر لگاتے تھے۔

الگھون نے دیکھا کہ اس شام کسی بھی گا کہ نے اخبار فروش لڑکے

سے اخبار نہیں خریدا۔ وہ قدرے مایوسی کے تاثرات چہرے پر لئے

واپس جانے لگا تو الگھون نے اسے اشارے سے قریب بلایا اور پوچھا۔

”کتنے اخبار بیچ گئے ہیں تمہارے پاس؟“

”کم از کم پچاس تو ہوں گے سر۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”یہ سارے کتنے گئے ہوں گے؟“ الگھون نے پوچھا۔

”اٹھارہ ڈالر کے سر۔“ لڑکے نے گویا کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی

طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”یہ سارے اخبار وہاں ایک کونے میں رکھے اور پچاس ڈالر کا نوٹ

لے کر یوں رخصت ہوا جیسے اسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہ رہا ہو۔

فاضلی اور خدا ترسی کے اس کے یہ مظاہرے کوئی ایک آدھ دن کی

بات نہیں تھی۔ یہ مظاہرے ہمیشہ جاری رہتے تھے۔ مصیبت زدگان اکثر

اپنی درد بھری کہانیاں لے کر کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ جاتے تھے اور

اگر ان کی کہانی میں ذرا سی بھی سچائی محسوس ہوتی تھی تو الگھون انہیں

مایوس نہیں لٹاتا تھا۔ غریبوں، ضرورت مندوں اور مصیبت کے مارے

لوگوں کی کہانیاں سن کر وہ کبھی اکتاہٹ، چڑچڑاہٹ یا بیزارگی کا مظاہرہ

نہیں کرتا تھا۔

ایک بار ایک بڑھیا کو اس کے مالک مکان نے کئی ماہ سے کرایہ نہ

ملنے کے باعث فلیٹ سے نکال دیا۔ اس کا کٹھ کاڑھا نما سامان فٹ پاتھ

پر بچھ گیا اور وہ پریشان حال اسی انبار کے پاس بیٹھ گئی۔

ایک پولیس والے نے یہ بات الگھون کو بتائی تو اس نے فوراً اپنا ایک

ٹرک وہاں بھیجا۔ الگھون کے آدھوں نے بڑھیا کا کٹھ کہا اس طرح

اعتیاد اور حفاظت سے ٹرک میں رکھا جسے وہ کوئی خزانہ سمجھتا تھا۔

آدی بڑھیا کو اس کے سامان سمیت ایک فلیٹ میں پہنچا کر آئے جس کا

ایک سال کا کرایہ بٹگی ادا کیا جا چکا تھا۔

الگھون کی طرف سے سیکڑوں ایسے لوگوں کی بھی مدد ہوتی تھی جن کی

شکل دیکھنے کا بھی اسے اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ سیرور اور شکا گو کے بہت

سے دکانداروں کو ہدایت تھی کہ سردیوں میں اگر ان کے پاس ایسے

مطلوبک الحال لوگ آئیں جن کے پاس گھروں کو گرم رکھنے کیلئے کوئلہ

خریدنے کے پیسے نہ ہوں تو انہیں بھی حسب ضرورت کوئلہ دے دیا

جائے۔ غریبوں اور تنگ دستوں کو سودا سلف اور ضرورت کی ہر چیز دے

دی جائے، ان سب چیزوں کا بل الگھون کو بھیجا جاتا۔

1929ء میں جب امریکا میں پہلا بڑا اقتصادی بحران آیا اور

غریبوں کی حالت بالکل ہی ابتر ہو گئی تو الگھون نے پہلا آدی تھا جس نے شہر

میں ”سوپ کچن“ کھولے۔ یہ ایسے کچن تھے جن کے دروازے بھوکوں

کیلئے کھلے تھے، وہاں سے انہیں کم از کم سوپ کا ایک پیالا مفت مل جاتا

تھا۔

سیاح اور دوسرے شہروں کے لوگ شکاگو اور سیرور آتے تھے تو انہیں

کبھی ڈرائیروں یا گلی اور مزدور ٹائپ لوگوں کی زبانی الگھون کے

افسانے سننے کو ملنے تھے۔ وہ سب والہانہ انداز میں یہی کہتے تھے۔

”الگھون بہت اچھا آدمی ہے، غریبوں کا بڑا خیال رکھتا ہے، بھوکوں کو

کھانا کھلاتا ہے۔“

ایک عورت جو اس زمانے میں سولہ سترہ سال کی تھی، اپنے بڑھاپے

میں لوگوں کو بتاتی کرتی تھی۔ ”لوگ الگھون کے بارے میں جو چاہے کہیں

لیکن وہ بہت اچھا آدمی تھا، جب لوگ پریشان حال اور ضرورت مند

ہوتے تھے تو وہ ان کی مدد کے لئے موجود ہوتا تھا اور خاص طور پر جو لوگ

اپنی پریشانیوں کے بارے میں بالکل بچ بچ بتاتے تھے، ان کی مدد کے

لئے تو وہ پیش پیش ہوتا تھا اور وہ اپنی ان مہربانیوں کے کسی صلے یا بدلے

کی توقع ہرگز نہیں رکھتا تھا۔“

اس عورت کا بیٹا پولیس میں سرفرا س اور سار جٹ تھا۔ وہ زندگی بھر

الگھون کے قہقہے سنتا رہا۔ وہ بتاتا تھا۔ ”لوگوں کی نظر میں الگھون قصے

کہانیوں والے ڈاکو رابن بڈ کی طرح تھا جو امیروں کو لوٹتا تھا اور غریبوں

کی مدد کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنی اپنی ہوتی دولت غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔

لوگ محض غریبوں سے ہمدردی والی صفت کی بناء پر الگھون کو رابن بڈ

سے تشبیہ دیتے تھے ورنہ درحقیقت وہ تو امیروں کو نہیں لوٹتا تھا، وہ تو

امیروں اور متوسط طبقے کے لوگوں کیلئے ایسی تقریبات فراہم کرنے کا

کاروبار کرتا تھا جنہیں وہ آسانی سے اخذ کر سکتیں، دیکھا جائے تو وہی

کبھی نہیں لوٹتا تھا۔ کسی کی کوئی چیز نہیں چراتا تھا۔“

اس کے دھندوں کے غیر قانونی پہلوؤں سے قطع نظر وہ کوئی باقاعدہ

جرم پیش آدی معلوم نہیں ہوتا تھا یعنی کم از کم ایسا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا

جس کا وہنا بچھونا اور تمام آزادی کا ذریعہ صرف جرائم ہوں۔

الگھون خود بھی اس بات پر فخر کا اظہار کرتا تھا کہ ان اس کے پاس تو

جرائم پیشہ لوگ آتے ہیں تو وہ انہیں مفید اور کارآمد انسان یا جاننا اور

قانونی قسم کے ملازمین بناتا ہے۔ کوئی چور، لٹیئر اس کے ہاں آکر گارڈ

یا دربان بن جاتا تھا۔ کوئی نقب زن خانسامان کے فرائض انجام دینے

لگتا تھا، کوئی کسب کسب آویز بن جاتا تھا۔ کوئی چور یا ڈاکو رابن بڈ کے فرائض

انجام دینے لگتا تھا۔ اس طرح بہت سے جرائم پیشہ لوگ اس کے ہاں

آکر شرفیافتہ قسم کی خدمات انجام دے رہے تھے اور باقاعدگی سے

ملازمت کر رہے تھے۔ الگھون اسے اپنی ایک اہم سماجی خدمت شمار کرتا

تھا۔

بہت سے لوگوں کو اس کی وجہ سے کوئی ایسی چیز کھانے یا استعمال

کرنے کا موقع ملا جس کا اس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس کا ایک ملازم لوگوں کو بتاتا کرتا تھا۔ ”ہم اٹھارہ، بہن، بھائی تھے

اور ہمارا باپ ایک مزدور تھا، ہم نے زندگی میں کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا

تھا۔ میرا باپ اکثر قصائی کی دکان سے مرغی کی گردنیں لے آتا تھا جو

تقریباً مفت میں ہی مل جاتی تھیں۔ میری ماں ان کا پتلا سا بہت سارا

شوربے بنا لیتی تھی اور ہم باسی، سوکھی روٹی کے ٹکڑے اس میں بھجھو بھجھو کر کھا

لیتے تھے۔ ہم نے زندگی میں کبھی باقاعدہ گوشت نہیں کھایا تھا۔

درحقیقت ہم نے کبھی اچھا کھانا ہی نہیں کھایا تھا اور نہ ہی کبھی پیٹ بھر کر

کھایا تھا، بڑے ہو کر جب میں الگھون کے ہاں ملازم ہو گیا تب ہمارے

گھر میں ڈرافٹنگ کا کھانا کھانے کی نوبت آئی۔ اس کے ریستورنٹ کے

کچن سے بہت سی چیزیں ہمیں مفت مل جاتی تھیں پھر میرے بھائی،

بہن بھی بڑے ہو کر کچھ نہ کچھ کمانے لگے تب گھر کے حالات میں مزید

بہتری آئی اور بہت سی چیزیں ہم نے زندگی میں پہلی بار کھائیں۔“

الگھون کہتا تھا کہ وہ غریبوں کیلئے باقاعدگی سے جو کچھ کرتا ہے یا

اچھا کہ جس طرح کی شجاعت کے مظاہرے کرتا رہتا ہے، اس سے اس

نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ اس کی دولت میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے۔

اس امپرائیسی بھی تھی لیکن وہ تیزی سے اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ خصوصاً

1927ء کے بعد سے تو اس نے بہت ہی تیز رفتاری سے ترقی کی۔

اس میں اپنے کارکنوں اور اپنے کاروبار کو منظم کرنے کی بہت زیادہ

صلاحیت تھی۔ وہ ایک بہت اچھا منظم تھا۔ ملنے والے اس کے میٹرو پول

والے آفس میں بیٹھنے تو عام طور پر وہ آدمی آفسیوں کی شرٹ میں ہوتا اور

اسے سر کھانے کی فرصت نہ ہوتی، اس کی میز پر کاغذات، فائلوں اور

رجسٹروں کے انبار ہوتے۔ ڈرائیبلین کے بعد دیکرے بج رہے

ہوتے۔ بعض اوقات تین چار فون ایک ساتھ بج رہے ہوتے اور وہ

بیک وقت ان سب پر بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا۔

اس دوران کوئی نہ کوئی ملازم کسی نہ کسی اہم اور ہنگامی نوعیت کے مسئلے

کے سلسلے میں ہدایت لینے کیلئے بھی آتا رہتا۔ ایک بار اس کا صحافی

دوست بیکر اس سے ملنے پہنچا۔ وہ الگھون کی ایک تصویر بھیجنا چاہتا تھا اور

ڈیپٹا میئر کے ساتھ لے کر آیا تھا۔

بیکر ایک ذرا عجیب اور قدرے مختلف صحافی تھا۔ وہ رپورٹنگ کے

ساتھ ساتھ اپنی ضرورت کی تصویریں بھی خود ہی اتارتا تھا۔ اس کے

علاوہ وہ کبھی کبھی بائسنگ کے شوقیہ مقابلوں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ لوگ

اس بات پر عجیب طور پر حیران بھی ہوتے تھے۔ کہاں رپورٹنگ کا صحافت

اور کہاں بائسنگ۔ شاید الگھون ان اسی بناء پر اسے اور بھی زیادہ پسند کرتا تھا

کیونکہ وہ بائسنگ کا زبردست شائق تھا اور اکثر مقابلے دیکھنے جاتا تھا۔

اس روز بیکر اس کی تصویر بھیجنے کی تیاری کرنے لگا تو الگھون نے

اچانک میز سے سر اٹھا کر پوچھا۔ ”کیا خیال ہے بیکر.....! تم بائسنگ میں

بھی ہر اسکتے ہو؟“

بیکر نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”خدا

کے لئے کوئی مشکل کی بات کرو۔ میں یہاں تمہاری تصویر بھیجنے آیا ہوں، تم

سے گھونے بازی کرنے نہیں..... لیکن بہر حال اگر تم دیکھنا ہی چاہتے

ہو کہ ہم دونوں میں سے کون کسے بائسنگ میں ہر اسکتا ہے تو ہمیں سبس

کے جتنا نام میں جا کر باقاعدہ بائسنگ کے دستاں کے مابین کر مقابلہ کرنا

چاہئے۔“

”بچوں والی بات تو اب تم کر رہے ہو.....!“ الگھون نے غصہ

سائے لے کر کہا۔ پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھا اور ان

تین چار آدمیوں پر نظر ڈالی جو اس کی توجہ کے منتظر کھڑے تھے۔

اس نے ایک اور غصہ سائے لے کر پھر گویا صبر کرتے ہوئے بولا۔

”میرے پاس وقت کہاں ہے۔“

اس کے ملازموں کا کہنا تھا کہ الگھون کے ہاں ملازم ہونا کوئی معمولی

بات نہیں تھی۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی ملازمت کے امیدوار میں بھی کوئی نہ

کوئی غیر معمولی خوبی دیکھ کر ہی اسے رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس بات

کا بہت خیال رکھتا تھا کہ اس کے ملازمین اپنے حلیے، انداز گفتگو یا لہجے

سے بدعاش، لٹکے اور گھٹیا قسم کے انسان ہرگز نظر نہ آئیں۔

اس کے ملازمین دیوتا کی طرح اسے پوجتے تھے۔ اس کے رعب،

دبدبے، شجاعت اور اثر و رسوخ کی کہانیاں اپنے دوستوں کی محفل میں

بیٹھ کر سناتے تھے۔ ایک بار اس کا ایک کلرک اپنے دوستوں کو بتا رہا تھا۔

”کلرک پاس نے فون پر ایک جج صاحب کا نمبر ملوانے کیلئے مجھ سے کہا۔

جونجی جج صاحب دوسری طرف لائن پر آئے، پاس نے مجھ سے ریسیور

چھین لیا اور سخت غصے میں جج صاحب سے بات کرنے لگا، وہ کسی آفیسر

کے بارے میں بات کر رہا تھا جس نے پاس کیلئے کوئی مسئلہ کھڑا کیا تھا۔

پاس، جج صاحب پر برس رہا تھا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا اس آدمی کو نوکری

سے نکالنا ہے لیکن وہ ابھی تک وہیں ہے، کیا کہا.....؟ تم بھول گئے

تھے؟ آئندہ مجھ سے کیا ہوا کوئی وعدہ بھولنا نہیں..... اے.....؟“ یہ کہہ کر

پاس نے ریسیور ہٹ دیا۔ بہت بڑے بڑے لوگوں سے وہ اس طرح بات

کرتا ہے۔“

دفتر سے باہر وہ اکثر نہایت مہذب، نرم خور اور شائستہ دکھائی دیتا تھا۔ خصوصاً خواہ مخواہ کے ساتھ وہ بے حد تہذیب اور شائستگی سے پیش آتا تھا۔ اس کی ایک بریوری ایک رہائشی علاقے کے قریب تھی۔ وہاں کی ایک گلی میں رہنے والی عورت بتاتی تھی۔ ”وہ راستے میں اس محلے کی کسی بھی عورت کو دیکھ لیتا تھا تو گردن کو خم دے کر ہیٹ کا چھچھو کر اسے سلام کرتا تھا اور جسے پہچانتا تھا، اس کی خیر و عافیت نہایت عزت و احترام سے دریافت کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بار بیک سنہری فریم کا چشمہ بھی لگائے ہوتا تھا۔“

یہ درست ہے کہ وہ دفتر سے باہر کبھی کبھی ایسا چہرہ لگاتا تھا لیکن اس

چہرے کے ساتھ اس نے کبھی کسی کو اپنی تصویر کھینچنے نہیں دی۔

پولیس والوں کے ساتھ بھی وہ نرمی اور شفقت سے پیش آتا تھا۔ ایک

بار ایک نوجوان پولیس آفیسر گاڑی میں اس کی انوکھی سی کیڑ لنگ کے

قریب سے گزرا تو اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے اور نئے بھرتی ہونے

والے نوجوان کو بتایا۔ ”یہ الگھون کی گاڑی ہے۔“

پھر اسے الگھون نظر آ گیا تو اس نے پر جوش انداز میں ہاتھ ہلا کر

اونچی آواز میں الگھون کو پہلو کہا۔ اس آفیسر نے بعد میں اپنے ایک

دوست کے سامنے اعتراف کیا۔ ”الگھون مجھے ذرا بھی نہیں جانتا تھا

لیکن اس نے مشتاقانہ اور بزرگانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف



جب بھی کسی اخبار میں الکیون کے بارے میں کوئی منفی خبر چھپ جاتی تو میری فضا بہت تنگ ہو جاتی۔ اسے یقین نہ آتا کہ اس کا بھائی ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی دوستوں سے کہتی۔ ”ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا بھائی تو اتنا اچھا انسان ہے، وہ دوسروں کے کام آتا ہے۔ کزور اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ وہ تو ہر ایک کے کام آتا ہے، ہر ایک کا خیال رکھتا

میدان میں آگیا۔ اس کا نام جوزف ایلو تھا۔ وہ تارکھ سائیک کا آدمی تھا۔ وہ کل نو بھائی تھے اور سب کے سب قاتل اور بدعاش تھے، ان کے علاوہ اس کے بہت سے کزن تھے۔ جتا فیملی کی باقیات بھی اس کے ساتھ تھیں۔ دوسرے لوگ بھی تھے۔ یوں اس کے گروہ میں اچھے خاصے لوگ تھے تاہم زیادہ تعداد اس کے اپنے رشتے داروں ہی کی تھی۔



ترجمہ: محمود احمد مودودی

قسط: 15

# الکیون

ہے، یہ اخبار والے بھی، کبھی کسی کے بارے میں کیسی جھوٹی باتیں لکھ دیتے ہیں۔“

اسی طرح الکیون اپنے چھوٹے بھائی، جان کے لئے بھی ایک مشفق بزرگ کا کردار ادا کرتا حالانکہ جان اس سے صرف دو سال ہی چھوٹا تھا۔ ایک تو الکیون کے رویے میں اپنے چھوٹے بھائی، بہنوں کے لئے بزرگی اور شفقت تھی۔ دوسرے اس کی شخصیت بھی کچھ اس قسم کی تھی کہ وہ اپنی عمر سے کافی بڑا لگتا تھا۔

وہ ابھی صرف اٹھائیس سال کا تھا لیکن اپنی ایک ایسا زکری کر چکا تھا اور زندگی کے جیسے جیسے تجربوں سے وہ گزر چکا تھا شاید انہی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ خود بھی اپنے بارے میں کہا کرتا تھا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اٹھائیس سال کی عمر میں ایک ہزار سال کی زندگی جی چکا ہوں۔“

اس کا چھوٹا بھائی، جان خاصا حکم کشم کا آدمی تھا۔ اس نے زندگی میں ڈھنگ سے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ الکیون ان اس سے چھوٹے موئے کام لے کر اسے مصروف رکھنے اور اس کی ذات کو کسی حد تک کا آمد بنانے رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس پر ناراض نہیں ہوتا تھا۔

انہی دنوں جان ایک کلب میں گانے والی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے جو ان گلوکارہ کا نام ملین تھا۔ کلب بھی الکیون کا اپنا ہی تھا، وہاں موسیقی پیش کرنے والے بیڑ کا انچارج ملین نامی ایک موسیقار تھا۔ ملین بھی اسی کی ماتحتی میں کام کرتی تھی۔

الکیون کو جان اور ملین کے عشق کا پتہ چلا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس کے خیال میں پہلے تو جان ہی اس قابل نہیں تھا کہ وہ کسی سے عشق کرتا۔ الکیون کا کہنا تھا کہ وہ پہلے ہی نکلا تھا۔ عشق کے پکر میں پڑ کر اور بھی زیادہ نکما ہو جائے گا۔ اوپر سے اس کے خیال میں ملین بھی اس قابل نہیں تھی کہ اس سے عشق کیا جاتا۔

چنانچہ الکیون نے بیڑ کے انچارج ملین کو بلایا اور حکم سنایا۔ ”ملین کو چلا کر وہ اب اس کلب میں مزید نہیں گائے گی اور آئندہ میں یہ بھی نہ سنوں کہ اس کا اور جان کا پکر چل رہا ہے۔“

”یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟“ ملین خاصی ناگوری سے بولا۔ ”بڑی مشکل سے تو ہمیں ایک ڈھنگ کی گلوکارہ ملی ہے۔ اس وقت شہر میں اس جیسی گانے والی اور اس جیسی شخصیت کی مالک کوئی اور گلوکارہ نہیں ہے، زیادہ تر لوگ کلب میں اسی کی وجہ سے تو آتے ہیں۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے، کلب کی آمدنی کم ہوتی ہے تو ہو جائے لیکن میں نہیں چاہتا کہ جان اس قسم کی لڑکی کے عشق کے پکر میں پڑ کر بالکل ہی ناکارہ ہو جائے۔ تمہیں اس لڑکی کو رخصت کرنا ہوگا ورنہ اس کے ساتھ ساتھ تم بھی جاؤ گے۔“ الکیون نے فیصلہ سنایا۔

”جان اور ملین اگر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور میل ملاقات رکھتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اس میں تاہم نہیں اڑا سکتا۔ میں صرف ان معاملات میں ملین سے کچھ کہہ سکتا ہوں جن کا تعلق اس کے کام سے ہو۔“ ملین نے بھی اپنا فیصلہ سنایا۔

الکیون سے کوئی اس انداز میں بات کرنے اور اس کے حکم کے جواب میں اس طرح کی بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن مسئلہ صرف یہ تھا کہ شاعروں، موسیقاروں، مصوروں اور اس طرح کے دوسرے فنکاروں کی الکیون کی جیسے ٹیکسٹرز ذہنی عزت کرتے تھے اور ان پر کوئی سختی نہیں کرتے تھے۔ اس طرح کے فنکار اگر کسی ٹیکسٹر کے پاس ملازم ہوتے تھے تو ان کی حیثیت پسند یہ پالتو جانور کی سی ہوتی تھی جسے ہلاک نہیں کیا جاتا اور نہ ہی مارا جاتا جاتا ہے اور پھر ملین تو کچھ زیادہ ہی خاص قسم کا فنکار تھا۔

دور ویش مفت موسیقار تھا۔ اپنے فن کی دنیا میں گن رہتا تھا۔ اسے دنیاوی معاملات اور مال و متاع سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی اسی لئے الکیون جیسا آدمی بھی اس کی کچھ اور عزت کرتا تھا، اسے کوئی گزند پہنچانا گویا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ملین کی بات سن کر الکیون نے ٹھنڈی سانس لی اور گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے اپنے مسلح محافظوں سے مخاطب ہوا۔ ”ذرا موسیقی کے اس سنگی ریو فیئر کو تو دیکھو، اس بے چارے کو تو شاید احساس بھی نہیں ہے کہ یہ بات کس سے کر رہا ہے۔“

الکیون کے گمن مین ہنسنے لگے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشاروں کے ذریعے گویا الکیون سے پوچھنے لگے کہ کیا اس شخص کا کوئی بندوبست کرنا ہے؟ مگر الکیون نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے سے انہیں منع کر دیا۔ ملین ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی بات کرنے کے بعد کوئی کوئی نظروں سے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو گھومتے ہوئے دیر سے دیر سے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

تب الکیون نے گویا اپنے غصے کو بھلائے ہوئے ملین کو چھیننے کی غرض سے کہا۔ ”وہی وہ لڑکی تمہاری مہربانی سے اسٹیج پر گارہی ہے ورنہ اسے گانا نا کہاں آتا ہے۔“

”دیکھو۔۔۔ گانے کے بارے میں کوئی رائے مت دینا۔۔۔“ ملین فوراً بھڑک کر بولا۔ ”سانوں سے تم شراب کا دھندا کر رہے ہو، ابھی تک تو تمہیں شراب کی پیچان نہیں ہوئی۔ گانے کے بارے میں بھلا تمہیں کیا علم ہو سکتا ہے؟“

الکیون اور اس کے مسلح محافظ ملین کے انداز سے محفوظ ہوتے ہوئے بلند آہنگ قہقہہ لگانے لگے۔

یہ مسئلہ تو خیر الکیون نے کسی نہ کسی طرح حل کر لیا لیکن اس سے کہیں زیادہ تخمین دوسرے کئی مسائل اس کے سامنے سر اٹھاتے رہے حالانکہ وہ دور اس کے لئے بہترین ہو سکتا تھا۔ شہر کا مضبوط ترین گروہ اس کے پاس تھا۔ لڑائی بھڑائی کے ماہرین، بہترین نشانے باز، مساک قاتل بھی اس کے ارد گرد جمع تھے، وسائل کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اوپر سے شہر کا میئر گویا اپنا ہی آدمی تھا۔

یوں گویا ہر بات اس کے حق میں تھی مگر وہ اس دور سے کچھ زیادہ لطف اندوز نہ ہو سکا کیونکہ اس سال کے دوران اسے قتل کرنے کی کئی کوششیں کی گئیں اور سال کے آخر میں تو اسے روپوش بھی ہونا پڑا۔

اسے ہلاک کرنے کی کوششیں کرنے والے کئی افراد تو موت کی آغوش میں پہنچ چکے تھے لیکن پھر ایک نیا دشمن جاں گویا ختم شوک کر

جوزف ایلو نہ جانے کیوں الکیون کو قسم کر کے اس کی جگہ لینے کا زبردست خواہش مند ہو گیا تھا۔ شکار گو کے اس دور کے گروہوں اور تجربہ مند رجحانات کا تجربہ کرنے والے ایک محقق کا خیال ہے کہ اس دور میں اکثر ایسے لوگ سامنے آتے رہتے تھے جن کے ہاتھ میں ہندو آجاتی تھی تو وہ سمجھتے تھے کہ وہ دنیا کے سب سے طاقتور آدمی ہو گئے ہیں۔

وہ لوگ عقل و شعور سے کام لینے کے بجائے اپنی جاہلانہ انا کے کہنے پر چلتے تھے، بعض اوقات کسی خاص سبب کے بغیر ہی کسی کو اپنا دشمن تصور کر لیتے تھے اور پھر اسے صفیہ ہستی سے مٹا دینے کیلئے کمر بستہ ہو جاتے تھے۔ محقق کے خیال میں برہمن کا معاملہ بھی یہی تھا ورنہ بیج معنوں میں الکیون سے اس کی کوئی خاص دشمنی نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن وہ اپنی تیار انا کی رہنمائی میں چلتے ہوئے آخر کار الکیون سے ٹکرا کر فنا ہو گیا۔

جوزف ایلو کا بھی اصل اور بڑا دھندا غیر قانونی شراب ہی کا تھا۔ اس کے علاوہ وہ شراب تیار کرنے والوں کو اس کے کچھ اجزائے ترکیبی بھی فروخت کرتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ لہارڈو کے ساتھ بھی بزنس کرتا تھا جو ایک طرح سے الکیون کا دوست تھا اور جسے الکیون نے بڑی کوشش کر کے اصل مافیائی فیملی کا سربراہ بنوایا تھا۔

جوزف ایلو نے اپنے دھندوں میں اچھی خاصی دولت کمائی تھی۔ ان دھندوں کے علاوہ اس کی فیملی کی ایک مین روڈ پر بہت بڑی بیکری بھی تھی۔ جوزف ایلو تین منزلہ حویلی نما مکان میں رہتا تھا جو اس نے خود بنوایا تھا۔

لہارڈو کے ساتھ جوزف ایلو زیادہ عرصے کا رو بار جاری نہ رکھ سکا۔ جب سے لہارڈو مافیائی فیملی کا سربراہ بنا تھا، تب سے جوزف کے دل میں اس کے بارے میں بھی کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ مافیائی فیملی جو ”یونین“ کہلاتی تھی، جوزف اپنے آپ کو اس کا سربراہ بننے کا زیادہ اہل سمجھتا تھا۔

آخر کار اس کا لہارڈو سے جھگڑا ہو ہی گیا۔ اس نے اس کے ساتھ کاروبار ختم کر دیا اور تعلقات بھی منقطع کر لئے لیکن اسے زیادہ غصہ الکیون پر تھا جس نے لہارڈو کو ”یونین“ کا سربراہ بنوایا تھا۔ جب جوزف ایلو نے محسوس کیا کہ وہ الکیون سے ٹکر لینے کے قابل ہو گیا ہے تو وہ اس کے پیچھے لگا گیا۔

اصل اٹلی کے علاقے میں اصل اٹلی ہی کے نام سے ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ بھی تھا جو الکیون کا پسندیدہ تھا۔ الکیون اکثر وہاں کھانا کھانے آتا تھا۔ جوزف ایلو نے اس کے خانہ نامہ کو دس ہزار ڈالرز کی پیش کش کی اور اس سے فرمائش کی کہ وہ الکیون کے کھانے میں زہر ملا دے۔

خانہ نامہ نے جا کر یہ بات الکیون کو بتادی۔ خلاف توقع الکیون کو غصہ بعد میں آیا۔ پہلے وہ یہ بات سن کر رنجیدہ ہو گیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”اگر مجھے پتہ ہوتا کہ شکار گو میں میرے ساتھ کیا کچھ ہوگا تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔ میں نیویارک ہی میں رہتا اور اپنے نوجوانوں کے چھوٹے سے گروہ میں ہی شامل رہ کر فنی خوشی وقت گزارتا۔“

جوزف ایلو نے اس کے بعد اٹلر رورلڈ میں اعلان کیا کہ کوئی بھی گمن مین جو الکیون کو قتل کرے، وہ آکر اس سے پچاس ہزار ڈالرز انعام لے سکتا ہے۔

مئی 1927ء میں چار قاتل اس سلسلے میں قسمت آزمائی کرنے اور یہ مہم سر کرنے کے لئے آئے۔ ان میں سے ایک نیویارک اور ایک کلیو لینڈ سے آتا تھا جبکہ دوسرے لوگوں سے آئے تھے۔ ان بے چاروں کو نہیں معلوم تھا کہ شہر میں الکیون کی اپنی اٹلنجنس کا جال بچھا ہوا تھا۔

تقریباً ہریڈو، بکی، دلال، جیسی ڈرائیور، اخبار فروش، چور، چاکر، جعل ساز حتیٰ کہ پیشتر پولیس والے بھی اس کے خبر تھے۔ چاروں قاتلوں نے ابھی شہر میں قدم ہی رکھا تھا کہ الکیون ان کو ان کے بارے میں خبر مل گئی اور وہ مختلف مقامات پر مدہ پائے گئے۔

نیویارک سے آنے والے کا نام انڈینو تھا۔ اس کی لاش 25 مئی 1927ء کو ایک فٹ پاتھ پر پائی گئی، اس کے جسم میں پانچ گولیاں بیست تھیں۔ تین دن بعد جوزف ایلو کی فیملی کی بیکری پر مشین گن سے فائرنگ ہوئی۔ بیکری پر کم دہش دو گولیاں چلائی گئیں۔ بیکری کا ایک ملازم اور جوزف ایلو کا ایک بھائی زخمی ہوا۔

الکیون کو قتل کرنے کی مہم سر کرنے کی نیت سے آنے والے باقی تین قاتلوں کی لاشیں بھی یکے بعد دیگرے خاصے عبرت ناک انداز میں مختلف جگہوں پر پائی گئیں۔

جوزف ایلو کا جب بیرون شہر سے قاتل بلانے کا تجربہ نام ہو گیا تو اس نے جتا فیملی کے پرانے اور تجربے کار قاتلوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا لیکن اس تجربے کا بھی وہی نتیجہ نکلا۔ الکیون کی لاش دیکھنے کی جوزف کی حسرت تو پوری نہیں ہوئی البتہ اسے پورے موسم گرما کے دوران دس لاشیں اٹھوائی پڑ گئیں۔

ان میں سے بعض لاشوں کی مٹی میں ایک سکھ دبا ہوا پایا گیا جسے ”کل“ کہا جاتا ہے۔ اس بات کی زیادہ حصدقہ شہادتیں تو نہیں ملئیں لیکن جن دنوں لاشیں مل رہی تھیں، ان دنوں کافی زور و شور سے یہ تذکرہ سننے میں آ رہا تھا کہ بعض لاشوں کے ہاتھ میں نکل کا سکھ دبا ہوا تھا۔

شاید یہ افواہ جبکہ حرف مشین گن کی وجہ سے پھیلی ہو۔ جبکہ حرف مشین گن کو ”مشین گن جبکہ“ بھی کہا جاتا تھا۔ الکیون کے پاس جو ہندو باز اور قاتل موجود تھے، وہ ان میں سے ”مشین گن جبکہ“ کو سب سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ جو لوگ الکیون کو قتل کرنے کی نیت سے لگے تھے اور خود قتل ہو گئے تھے، ان میں سے زیادہ تر کے بارے میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ مشین گن جبکہ کے ہاتھوں اس انجام کو پہنچے تھے اور

مشین گن جبکہ کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ جسے قتل کرتا تھا، اس کی مٹی میں نکل کا سکھ دبا دیتا تھا۔ اس کے پیچھے بھی ایک کہانی تھی اور وہ مشین گن جبکہ کی اپنی کہانی تھی۔

مشین گن جبکہ ظاہر ہے اس کا اصلی نام نہیں تھا لیکن اس کے دوسرے دو نام جو اصلی سمجھے جاتے تھے، درحقیقت وہ بھی اصل نہیں

تھے۔ اس کا اصل نام شاید کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ بہر حال بعض شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ ایک سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ سکلی سے امریکا آیا تو اس کا نام وزو تھا۔ اس کے باپ کا نام ٹاکس اور ماں کا جوزفین تھا۔ ٹاکس اور جوزفین اپنے ایک سالہ بچے وزو کے ساتھ نیویارک کے علاقے بروکلین میں آکر آباد ہوئے تھے۔

وزو ابھی کم سن ہی تھا کہ اس کے باپ کو آئرش بدعاشوں کے ایک گروہ نے گولیوں سے اڑا دیا۔ آئرش بدعاش وائٹ پیٹرز کہلاتے تھے۔ وزو کے باپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ کسی اور کے دھوکے میں مارا گیا تھا جس سے اس کی شکل کافی بلی تھی۔

ٹاکس اس وقت اپنے جوتے پالش کر رہا تھا جب اسے گولیوں سے اڑایا گیا۔ اس کے جوتے پالش ہوئے ہی تھے اور اس نے جوتے پالش کرنے والے بچے کو مٹا دیا اور پٹ دینے کے لئے نکل کے تین کئے نکالے تھے جو اس کے ہاتھ میں ہی رہ گئے اور وہ بے قصور موت کے منہ میں چلا گیا۔

وزو نو جوانی کے دور میں داخل ہو چکا تھا جب اس کی ماں نے ڈیموری نامی ایک دکان دار سے شادی کر لی اور شکار گو آگئی۔ وزو کو بالکنگ کا شوق تھا۔ شوقی طور پر بالکنگ کرتے کرتے وہ ویلر ویٹ باکس بن گیا تاہم جب اس نے باقاعدہ پیشہ ور باکسر بننے کی کوشش کی تو اسے کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

اس کے فیملی کے اس کا نام جبکہ رکھا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہی فیملی نے جبکہ کو بالکنگ چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جبکہ اپنے سے زیادہ طاقتور باکسر کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

ممکن ہے بالکنگ کے رنگ کے اندر کی حد تک فیملی کا یہ مشاہدہ درست ہو لیکن رنگ سے باہر کی دنیا میں جبکہ بالکل نظر، بے خوف اور حوصلہ مند معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی سے بھی ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

اس دوران اس نے نشانے بازی کی مشق شروع کر دی تھی۔ بہت کم عرصے میں وہ زبردست ہندو باز بن گیا۔ انیس سال کی عمر میں وہ دوبارہ بروکلین آیا اور اس نے ان دنوں آئرش بدعاشوں کو قتل کر دیا جنہوں نے اس کے باپ کو گولیوں سے اڑایا تھا۔ اس کام میں ایک تیسرا آئرش بھی شریک تھا۔ جبکہ نے اسے بھی گولیاں ماری تھیں اور اپنی دانست میں اسے بھی ہلاک کر دیا تھا لیکن وہ بچ گیا تھا۔

جبکہ نے ان تینوں کے ہاتھ میں نکل کا ایک ایک سکھ رکھ دیا تھا۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح وہ کیا ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اپنے باپ کے ہاتھ میں مرتے وقت تین کئے تھے شاید جبکہ قاتلوں سے تعلق رکھنے والوں کو اس واقعے کی یاد دلانا چاہتا تھا یا پھر شاید وہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کی نظر میں ان قاتلوں کی یہ ”اوقات“ تھی۔ اس کا مقصد خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن اٹلر رورلڈ میں بہر حال یہ مشہور ہو گیا کہ جبکہ جسے قتل کرتا ہے، اس کی مٹی میں نکل کا سکھ دبا دیتا ہے۔

1923ء میں اس کے سوتیلے باپ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ یہ قتل غلطی سے نہیں ہوا تھا۔ اس کے باپ کا جتنا برا دور سے کچھ تعلق استوار ہو گیا تھا اور وہ گروہی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ جبکہ نے اپنے سوتیلے باپ کے قاتلوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس نے انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار کر چھوڑا۔

اس دوران وہ الکیون اور جان ٹور پو کے گروہ میں شامل ہو چکا تھا اور اپنا نام بھی بدل چکا تھا۔ اٹلی اور سکلی سے تعلق رکھنے والے اٹلر رورلڈ کے اکثر لوگ اپنے نام بدلے رہتے تھے۔ اپنی دانست میں اس طرح ایک تو وہ پولیس کو انجمن میں جلا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوسرے اپنے اصل خاندانی نام کو بدنامی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے یہ مقاصد پورے ہوتے تھے یا نہیں، بہر حال وہ اپنی ہی کوشش کرتے تھے۔

وزو کے ساتھ جو نام سب سے زیادہ چپک کر رہ گیا، وہ ”مشین گن جبکہ“ تھا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ کسی کو قتل کرنے کے سلسلے میں پستول کو ترجیح دیتا تھا تاہم وہ مشین گن کے استعمال میں بھی بے حد ماہر تھا۔

اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کم از کم بائیس قتل کر چکا تھا جبکہ وہ ابھی نو جوان ہی تھا۔

الکیون اسے بہت پسند کرتا تھا۔ وہ نہایت خوش شکل بھی تھا۔ صرف اس کی ناک ذرا بدوضع تھی شاید بالکنگ کے کسی مقابلے میں اس کی ناک کی بڑی ٹوٹ گئی تھی اور دوبارہ صحیح طور پر نہیں جڑ سکی تھی۔ اگر اس کی ناک ایسی نہ ہوتی تو اس کا چہرہ بجا طور پر کسی خوبصورت یونانی دیوتا کا چہرہ معلوم ہوتا۔

وہ صرف ایک ماہر ہندو باز اور خطرناک قاتل ہی نہیں تھا، اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ اس کا جسم کھلاڑیوں کی طرح ورثی اور خوبصورت تھا۔ وہ کئی طرح کے نقص میں بے پناہ ماہر تھا اور ڈانس پر قدر اپنی غیر معمولی پھرتی اور مہارت سے حاضرین کو حیران کر دیتا تھا۔

گولف کا ماہر کھلاڑی تھا۔ نورٹمانٹ جیت لیتا تھا۔ کسی ریڈیو این سے زیادہ ماہر گٹھ سوار تھا۔ وہ جس کھیل کی طرف بھی متوجہ ہوتا تھا، اس میں بہت جلد بے پناہ مہارت حاصل کر لیتا تھا۔

اس کی شادی کی تصویر کھینچنے والے فوٹو گرافر کا کہنا تھا۔ ”وہ ایک پرسش شخصیت کا مالک تھا۔ اسے دیکھنے والے کو اگر معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ درحقیقت کون ہے۔ کیا ہے تو وہ اسے دوست بنانے کی آرزو محسوس کرنے لگتا تھا۔“

پولیس کے سرانے رسالوں کے نئے چیف ولیم کوز نے اٹلی افسروں کو قاتل کر کے ایک مہم چلائی تھی کہ جن لوگوں کو بہت سے انسانوں کا قاتل سمجھا جاتا تھا اور جو بوجہ اپنے جرائم کی سزا نہیں پاسکے تھے، ان کا انفرادی تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ یہ لوگ نفسیاتی مریض تو نہیں تھے؟ ان کے دماغوں میں کہیں نفسیاتی گریں، پیچیدگیاں یا کئی تو موجود نہیں تھیں؟

ولیم کوز کی نہ کسی طرح کی پیشہ ور قاتلوں کو گھیر گھار کر ان کا نفسیاتی تجزیہ کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ مشین گن جبکہ کا تجربہ کرنے والی خاتون ماہر نفسیات نے رپورٹ دی۔ ”اس شخص کے ذہن میں کہیں نہ کہیں کوئی ٹیڑھا پن موجود ضرور ہے لیکن اس کی وضاحت مشکل ہے۔“

ایک پولیس آفیسر جو اس تجربے کے دوران موجود رہا تھا، اس نے بعد میں رائے دی تھی۔ ”یہ نو جوان اگر فی الحال پاگل نہیں ہے تو آگے چل کر بھی نہ بچے پاگل ضرور ہو جائے گا۔“

بہر حال اس ساری مشق اور تنگ و دو کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا اور کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ سنا ہے مشہور زمانہ قاتل جبکہ دیہی اور اس قبیل کے دوسرے مجرموں کے بھی اپنے اپنے دور میں نفسیاتی تجزیے ہوئے تھے لیکن ان کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا اور کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ بعض ماہرین نفسیات نے تو ان لوگوں کو مدافعی طور پر بالکل صحت مند بھی قرار دے دیا تھا۔

درحقیقت ولیم کوز کو جوزف ایلو کا بھی نفسیاتی تجزیہ کرانا چاہئے تھا جسے نہ جانے کیوں الکیون کو منظر سے ہٹا کر خود اس کی جگہ لینے کی سبک چڑھ گئی تھی۔

ایک بار پولیس کو ایک گمنام ذریعے سے پٹی کی راجر پارک کے علاقے میں ایک فلیٹ میں کچھ مشکوک سرگرمیاں جاری ہیں۔ پولیس نے وہاں چھاپے مارا تو بہت سے اسلئے اور ڈاکنامات کے ساتھ تین آدمی پکڑے گئے، تینوں جوزف ایلو کے آدمی تھے۔

ان میں سے ایک آدمی کی جیب سے ایک فلیٹ کے کرائے کی رسید برآمد ہوئی۔ اس فلیٹ پر بھی چھاپے مارا گیا۔ فلیٹ خالی تھا لیکن اس میں کھڑکی کے قریب اسٹینڈر پر ایک مشین گن فٹ تھی۔ اس فلیٹ کے مین سامنے ایک ریسٹورنٹ تھا جس کا مالک ایک نیم سیاسی شخصیت تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں الکیون اکثر رات کا کھانا کھانے آتا تھا اور اس نیم سیاسی شخصیت سے گپ شپ بھی کرتا تھا کیونکہ اس سے اس کی دوستی تھی۔



چنانچہ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ فلیٹ کی کھڑکی کے قریب مشین گن کس لئے فٹ تھی۔ جوزف ایلو کے تینوں آدمیوں کو پولیس اسٹیشن کے تہ خانے میں لے جایا گیا اور خوب ”رگڑا“ دیا گیا کیونکہ پولیس میں الیکٹرانک کے ٹھکانے خوار و بی تعدا میں موجود تھے۔ جوزف ایلو کے آدمیوں نے اگلے دیا کہ انہیں کس نے کس خاص ہم



پر لگایا ہوا تھا۔ چنانچہ پولیس نے جوزف ایلو کو بھی اس کے ٹھکانے سے اٹھوایا۔ اسے بھی پولیس اسٹیشن کے تہ خانے میں لایا گیا جہاں مڑوسوں سے ذرا ”خاص“ انداز میں پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔

باہر گویا کوئی پراسرار اور نادیدہ مشینری کام کر رہی تھی۔ جوزف ایلو کو پولیس اسٹیشن کے تہ خانے میں پینچے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مسلح آدمیوں سے بھری ہوئی چھ کاریں پولیس اسٹیشن آگئیں اور مسلح آدمیوں نے خاموشی سے پولیس اسٹیشن کو گھیرے میں لے لیا۔

تہ خانے کی کھڑکیاں سڑک کی سڑ پر تھیں۔ ان کھڑکیوں سے پولیس والوں نے کاروں کو آکر رکتے اور پراسرار انداز میں ادھر ادھر نقل و حرکت کرتے بھی دیکھا لیکن مونے دماغ کے پولیس والوں نے یہی سمجھا کہ شاید یہ آئی ڈی والے ان کی مدد کے لئے آئے ہیں چنانچہ جب تہ خانے کے دروازے پر دستک ہوئی تو ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

تین آدمی مشین گنیں لئے اندر آ گئے۔ وہ سیدھے جوزف ایلو کے پاس آئے اور اسے گھیرے میں لے کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک تو پلکیں جھپکاتے بغیر جوزف ایلو کو گھور رہا تھا، ان کے چہروں پر اور آنکھوں میں اتنی خوفناکی تھی کہ جوزف کی ٹھٹھکی بندھ گئی۔ اس نے شاید کبھی خواب میں بھی نہیں سوجھا تھا کہ الیکٹرانک کے آدمی اس طرح مشین گنیں لے کر کسی پولیس اسٹیشن پر ”چڑھائی“ بھی کر سکتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب وہ خود پولیس والوں کے چنگل میں چوہے کی طرح چھٹسا ہوا ہوگا۔

خود پولیس والوں کو بھی الیکٹرانک کے آدمیوں سے اس حد تک جرأت کی توقع نہیں تھی۔ وہ بھی قدرے نروس ہو گئے اور صحیح طور پر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ بہر حال انہوں نے دکھاوے کی حد تک ڈانٹ ڈپٹ کر الیکٹرانک کے آدمیوں کو بھاگا دیا۔

تینوں آدمی باہر چلے گئے اور تہ خانے کی کھڑکیوں سے ان کی گاڑیاں اور ان کے ساتھی بھی نظر آتا بند ہو گئے لیکن خود پولیس والے بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ جگہ جگہ چلے گئے تھے یا نہیں؟ کچھ بید نہیں تھا کہ وہ پوزیشن بدل کر آس پاس ہی نہیں چھپے ہوئے ہوں۔ بہر حال صرف تین آدمی اندر آکر جوزف ایلو کو جتنا ”ڈوڑ“ دے گئے تھے۔ اس کے لئے وہی کافی تھا۔ وہ لوگ جاتے جاتے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک خاموش پیغام بھی دے گئے تھے۔ موت کا پیغام! پولیس کے لئے یہ سب کچھ ایک دروس تھا اور وہ اپنا دروس مرنے کے طریقے تلاش کرتی تھی۔ اس وقت بھی انہیں ایک شارٹ کٹ کی تلاش تھی۔

تفتیشی افسر نے جوزف ایلو سے مذاکرات شروع کئے۔ ”اب تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ہمارے پاس تمہارے خلاف جو ثبوت موجود ہیں، ان میں سے صرف تازہ ترین ہی ایسے ہیں کہ تم ازم تین چار سال کے لئے جیل چلے جاؤ گے اور جب تم جیل سے نکلو گے تو الیکٹرانک کے آدمی تمہارے ”استقبال“ کے لئے باہر تمہارے منتظر ہوں گے۔“

جوزف ایلو کی ساری اگزوفوں ہوا ہو گئی تھی اور وہ اس وقت دہشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ تفتیشی افسر نے اپنے الفاظ کا اثر دیکھنے کے بعد ایک لمحے کے توقف سے بات آگے بڑھائی۔ ”دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم تمہیں فی الحال چھوڑ دیں، اس صورت میں شاید تمہیں جج کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہو۔“

جوزف ایلو کے چہرے پر دہشت زدگی کے تاثرات کچھ اور گہرے ہو گئے۔ شاید اب وہ دل میں اپنی اس حماقت پر پچھتا رہا تھا کہ اس نے الیکٹرانک کی طاقت کا اندازہ لگانے میں غلطی کی تھی۔

آخر وہ کچھ صمت کرتے ہوئے تھوک نگل کر بولا۔ ”تم یہ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے مجھے تم کو مشورے نہیں دینے چاہئیں لیکن تمہیں بھی معلوم ہے کہ ہم لوگ خواہ مخواہ کے دروس مول نہیں لینا چاہتے اس لئے میں تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ تم فوراً شہر چھوڑ کر یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔“ تفتیشی افسر نے اطمینان سے کہا۔

خلاف توقع جوزف فوراً ہی مان گیا لیکن خوف اس معاملے میں بھی اس کے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ”اگر میں نے اپنے طور پر جانے کی کوشش کی تو شاید مجھے شہر سے نکلتا نصیب نہ ہو۔“

”میں تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ جہاں تک تم کہو، وہاں تک تمہیں پولیس کی حفاظت میں پہنچا سکتا ہوں۔“ تفتیشی افسر نے فوراً اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔ شاید وہ اسے ہی قیمت سمجھ رہا تھا کہ شہر میں کم از کم ایک گروہ تو کم ہو جائے گا۔

اس کی پیش کش پر جوزف ایلو کی باچیں کھل گئیں۔ یوں پولیس کی حفاظت میں جوزف ایلو کے ٹھکانے کو رخصت ہونے کا ”معادہ“ طے پا گیا۔ جوزف ایلو کی صفات ہو گئی اور دوسرے روز اس کے وکیل نے عدالت میں اس کی طرف سے درخواست پیش کی کہ اسے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اس لئے وہ عدالت میں پیش ہونے سے قاصر ہے۔

درحقیقت اسے رات کی تاریکی میں پولیس نے اپنی حفاظت میں اس کی بیوی اور بچے سمیت شہر سے نکال دیا اس کے گروہ کے خاص خاص لوگ بھی غائب ہو گئے۔

جب جوزف ایلو کے غائب ہونے کی تصدیق ہو گئی تو الیکٹرانک نے اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ”بھی میں تو ہر ایک سے امن اور صلح کی بات کرنے کے لئے تیار رہتا ہوں لیکن مجھے بہر حال اپنی جان کی حفاظت بھی کرنی ہے، اگر کوئی مجھ پر حملہ کرے گا تو میں جواب ضرور دوں گا۔ میں بہر حال پرانے وقتوں کا وہ سادہ صحت نہیں ہوں کہ کوئی میرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو میں دوسرا گال بھی آگے کر دوں۔“

کچھ عرصے بعد جوزف کا ایک بھائی ڈویک شہر میں دکھائی دیا۔ الیکٹرانک نے فوراً اسے پیغام بھجوایا کہ وہ شہر میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ اپنی اس وارننگ کو زیادہ موثر بنانے کیلئے اس نے اسی رات اس کی خاندانی بیکری پر ایک بار پھر فائرنگ کرائی۔ بیکری کو ان دلوں جوزف کی فحش کی پرانے ملازم چلا رہے تھے۔ پہلی بار فائرنگ ہونے پر بیکری کا کاردار بدکاری متاثر ہوا تھا۔ اب دوبارہ فائرنگ ہوئی تو کاروبار کچھ اور خفشا ہوا گیا۔ ڈویک دوبارہ غائب ہو گیا۔

الیکٹرانک نے اخبار نویسوں کے سامنے ایک ٹائٹل کلب میں کہا۔ ”اس شہر کا پاس میں ہوں اور یہاں وہی ہوگا، جو میں چاہوں گا۔ مجھے یہاں سے کوئی نہیں بھاگ سکتا۔ مجھے بھاگنے کی کوشش کرنے والوں کو خود یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ آپ لوگوں نے دیکھا ہی ہوگا کہ مجھے ختم کرنے اور یہاں سے بھاگنے کی کوششیں ہوئیں لیکن آپ لوگ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں خوش خرم، ہٹا کٹا نہیں موجود ہوں اور مجھے بھاگنے کی



کوششیں کرنے والے کہاں ہیں، یہ شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔“

شاید قدرت کو اس کی یہ لاف زنی پسند نہیں آئی، شاید ان باتوں میں تکبر کا کوئی پہلو تھا۔ سال کے اختتام تک حالات پلٹا کھانے لگے۔

الیکٹرانک پر سختی ان لوگوں کی طرف سے آئی جن کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کبھی اس کے خلاف ہو سکتے ہیں اور انہیں سامنے پر رکھ سکتے ہیں لیکن شاید قدرت کا نظام ہی کچھ ایسا ہے۔ قدرت جب کسی پر گرفت کرنا چاہتی ہے تو ایسے بہانے بن جاتی ہیں، جن کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ باتیں وقوع پزیر ہوتی ہیں، جن کا اسے دور دور تک گمان بھی نہیں ہوتا اور جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔

سال کے اختتام تک سیاست عجیب کر رہی تھی۔ شکار گواک میز تھا سن جو ملی طور پر گویا الیکٹرانک کی جیب میں تھا۔ ملکی سطح پر سیاست میں حصہ لینے کے عزائم دل میں پال رہا تھا۔ اس کی نظر صدارتی انتخابات پر تھی لیکن اسے احساس تھا کہ میز کے طور پر وہ اپنی کچھ اچھی شہرت نہیں بنا سکتا تھا۔ کہنے کو وہ شہر کا میز تھا لیکن عام تاثر تھا کہ شہر کا حکمران تو الیکٹرانک تھا۔

اسے اندیشہ تھا کہ اس کی ری پبلکن پارٹی اسی بناء پر اسے صدارت کیلئے نامزد نہیں کرے گی۔ اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ اگر اسے سیاست کے بلند درجوں تک پہنچنا ہے تو اسے الیکٹرانک سے جان چھڑانی ہوگی۔ شکار گواک الیکٹرانک سے نجات دلانی ہوگی۔ اسے شہر سے کہیں دور دھکیلنا ہوگا اور اپنے بارے میں اس تاثر کو بدلنا ہوگا کہ اس نے شہر کو الیکٹرانک جیسے جرائم پیشہ کے ہاتھوں میں کھلنا بھارت کھانے۔

جوزف ایلو والے واقعے کے بعد یہ تاثر اور بڑھ گیا تھا کیونکہ اس واقعے کے بارے میں اخباروں میں بڑی بڑی سرخیاں لگی تھیں۔ ان خبروں سے کچھ ایسا تاثر بنا تھا جیسے شہر میں تھامس بے چارے کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، جو کچھ بھی تھا بس الیکٹرانک ہی تھا، وہ جو چاہتا تھا، کر گزرتا تھا۔

تھامس نے اب اس تاثر کو یکسر تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سب سے پہلے پولیس چیف کو تبدیل کیا۔ وہ مائیک ہیوز کو نئے پولیس چیف کے طور پر لے آیا۔ جب میز کی نگاہیں بدل گئیں، پولیس چیف بدل گیا تو الیکٹرانک کیلئے گویا دنیا ہی بدل گئی۔

نئے پولیس چیف مائیک ہیوز نے الیکٹرانک کو صاف اور دونوں الفاظ میں پیغام دے دیا کہ اسے شہر چھوڑنا ہوگا۔ الیکٹرانک خوش فہمیوں کی دنیا میں رہنے والا آدمی نہیں تھا، وہ حقیقت پسند تھا۔ اس نے قصاص میں تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس اور انتظامیہ کو بیٹھ خرید کر نہیں رکھا جاسکتا، وہ لوگ جب چاہیں آنکھیں بدل سکتے ہیں اور اصل طاقت پولیس اور انتظامیہ ہی کے پاس ہوتی ہے، بدعاش خواہ کتنے ہی طاقتور ہو جائیں، حکومت سے بھر حال نہیں لے سکتے۔ پولیس، انتظامیہ اور حکومت اپنی سطحوں کی بناء پر جب تک کسی کو ڈھیل دینا چاہے، دے دیتے سکتی ہیں لیکن کسی بھی وجہ سے جب وہ اپنی طاقت دکھانے پر تیار ہوتے تو پھر غیر سرکاری لوگوں کا، خواہ وہ کتنے ہی طاقتور گروہوں کی شکل میں ہوں، اس کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہیں ہوتا۔

الیکٹرانک نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا۔ اس نے اپنی طاقت کو کھنکھاتی طاقت سے مکر کر فنا کرنے کے بجائے پسپائی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ جوزف ایلو کو شہر بدر کرنے کے ٹھیک دو ماہ بعد اس نے خود اپنے بارے میں اعلان کیا۔ ”میں کل ریاست فلوریڈا کے شہر سیٹ پٹری برگ جارہا ہوں، وہاں میری کچھ جائداد ہے۔ مجھے وہ فروخت کرنی ہے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں واپس بھی آؤں گا یا نہیں۔ بہر حال قطعیت تو میں ساری کی ساری وچیں گزاروں گا۔ اس کے بعد واپسی کے بارے میں سوچوں گا۔“

دوسری طرف پولیس چیف مائیک ہیوز نے اپنے لوگوں کے حلقے میں بیچ کر الیکٹرانک کے بارے میں اطمینان سے کہہ دیا۔ ”وہ واپس نہیں آئے گا۔“

الیکٹرانک نے پولیس کے لوگوں کو اپنے میز پر پول والے آفس میں مدعو کیا۔ وہ آٹھ دن کے لئے شکار پر گیا ہوا تھا۔ اسی روز واپس آیا تھا۔ اس کی شبیہ بڑھی ہوئی تھی اور وہ ابھی شکار ہی کے لباس میں تھا۔ وہ اپنے میں آدمیوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔

اس نے بات چیت شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں شکار گوا اور گروہ وناح کے لوگ اپنے لئے جائز اور قانونی شراب حاصل کرنے کا کوئی طریقہ انتظام کر لیں۔ میں تو انہیں تفریح کے سستے ذرائع فراہم کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ اب ان کاموں سے میرا دل بھر گیا ہے۔ ان کاموں کا انسان کو کوئی اچھا صلہ نہیں ملتا۔ آپ، لوگوں کو خوشیاں دیتے ہیں۔ بدلے میں آپ کو دکھ اور پریشانی ملتی ہیں۔“

”آخر آپ نے ایسا کیا کیا ہے جو آپ کو شہر چھوڑنا پڑ رہا ہے؟“ ایک رپورٹر نے پوچھ ہی لیا۔

”میں نے تو کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا۔“ وہ ہلکا ہلکا بولا۔ ”آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے مجھے کسی کی جرم میں سزا نہیں ہوئی۔“

پھر اس کی مخصوص ڈھنسی عود کر آئی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے بولا۔ ”اور نہ ہی میں نے کبھی کسی اور کو کوئی جرم کرنے کا حکم دیا ہے یا کوئی غیر قانونی کام کرنے کی ہدایت کی ہے۔ درحقیقت میرا جرم یہی ہے کہ میں نے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں کوئی فریضہ صفت آدمی ہوں یا میں نے پتھر کے بت کی طرح زندگی گزار دی ہے لیکن یہ بھی بہر حال طے ہے کہ میں نے کبھی کوئی گنہگار نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے ذریعے کرایا ہے۔ میں نے تو کبھی زندگی میں کسی کو تھپوڑ بھی نہیں مارا۔“

تاہم پھر وہ قدرے حقیقت پرانی کی طرف آیا۔ ”میرے ملازموں نے کبھی کسی راہ گرو کو نہیں لوٹا۔ کبھی کسی گھر میں ڈاک نہیں ڈالا۔ ہو سکتا ہے میرے پاس آنے سے پہلے وہ چور، ڈاکور ہے ہوں یا میرے ہاں سے جانے کے بعد بن گئے ہوں لیکن جتنا عرصہ وہ میرے پاس رہے ہوں گے، اتنا عرصہ انہوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہوگی، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو میں نے شاید بہت سے چور، آپکوں اور لیبروں کو باعزت ملازمتیں فراہم کیں اور انہیں معاشرے کا ایک مفید فرد بنایا لیکن اس کا مجھے کیا صلہ ملا؟... بدنامی، ذلت، برے برے القابات!... مجھے قاتل کہا گیا ”اسکرافین“ کا لقب دیا گیا۔ اخباروں میں میرے

بارے میں نہ جانے کیا کیا چھپتا رہا۔“ اس نے اذیت زدہ ہی نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”میں تو یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا ہوں لیکن میری والدہ اور میری بیٹی ان باتوں سے جتنی اذیت اٹھاتی رہی ہے، اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ وہ لوگ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا واقعی میں اتنا ہی برا مجرم ہوں؟ ان کے لئے اب یہ اذیت نہ ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے اور میں خود بھی ان باتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔“

پھر اس نے اخبار نویسوں کے سامنے اعتراف کر لیا کہ بعض سطحوں میں تو اسے وحشی و درندہ اور گوریل جیسے القابات سے یاد کیا جاتا تھا۔

”معلوم نہیں کیوں بعض لوگوں نے یہ تاثر لے رکھا ہے کہ میں ایک بے رحم، شقی القاب اور سفاک آدمی ہوں، پیسوں کے لئے میں نہ جانے کیا کچھ کر سکتا ہوں۔“ اس نے دکھ بھرے لہجے میں سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ میں بھی آپ لوگوں کی طرح ایک نرم دل اور عام سا انسان ہوں۔ مجھ میں بھی عام انسانوں کی طرح چھوٹی چھوٹی خوبیاں اور خامیاں ہیں لیکن میں درندہ بہر حال نہیں ہوں۔“

پھر اس نے رپورٹرز کو ایک واقعہ سنایا۔ ”ایک بار ایک پریشان حال اور قلاش شخص میرے پاس پہنچ گیا۔ کہنے لگا کہ میں اسے تین ہزار ڈالر دے دوں تو اس کی ایک اہمیت اہم ضرورت پوری ہو جائے گی، میرے اس احسان کا بدلہ وہ اس طرح اتارے گا کہ بلند ہزار ڈالر کا اپنا بیڑہ کرائے گا، میرا نام وارث کے طور پر نکھو دے گا اور خود کشی کر لے گا۔“

اس طرح مجھے تین ہزار ڈالر مل جائیں گے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ مجھے ایسا رقم نہیں چاہئے لیکن وہ مجھے یہ عظیم فائدہ پہنچانے پر تلا ہوا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں اسے ویسے ہی تین ہزار ڈالر دینا چاہ رہا تھا لیکن وہ نے نہیں رہا تھا، انشورنس پالیسی لینا اور اس میں مجھے وارث بنانا، ان کی لازمی شرط تھی۔ اپنی یہ شرط منوانے بغیر وہ واپس بھی نہیں جا رہا تھا۔ آخر مجھے اس کا ٹھکانا باہر چھوٹا پڑا۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور تاسف زدہ لہجے میں کہا۔ ”پچھ نہیں لوگوں نے اپنے ذہنوں میں میرا کیا کیا ہو یا تو ترش رکھا ہے۔“

پھر اسے گویا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ اس نے وہ بھی اخبار نویسوں کے سامنے بیان کر دیا۔ اس نے بتایا۔ ”چند دن پہلے مجھے انگلینڈ سے ایک عورت کا خط موصول ہوا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس کا اپنے ایک پڑوسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ اگر میں لندن آ کر اسے قتل کر دوں تو وہ مجھے دس ہزار پاؤنڈ دے گی۔“ یہ کہتے ہوئے گویا دکھ سے اس کی آواز جھپٹنے لگی۔ ”ذرا دیکھیں!... میری شہرت انگلینڈ تک پہنچ گئی ہے لیکن کس انداز میں!...؟ وہاں بیٹھی ہوئی ایک عام اور گھریلو عورت مجھے کرائے کا قاتل سمجھ رہی ہے۔“

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر زارمانی انداز میں بولا۔ ”مجھے کیوں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے؟ کیوں یہ ساری باتیں سننا پڑ رہی ہیں؟ صرف اس لئے کہ میں لوگوں کو سستی تفریحات فراہم کر رہا ہوں جن کی ہر شخص کو ضرورت رہتی ہے اور جو ہر شخص مانگتا ہے۔ میں جو کچھ لوگوں کو دیتا ہوں، اس کی اتنی مانگ ہے کہ میں تو انتہائی کوشش کے بعد بھی طلب پوری نہیں کر پاتا۔ مجھے اپنی مصنوعات کا کوئی اشتہار نہیں دینا پڑتا۔ کسی کو خریداری پر آمادہ کرنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے اختیار نہیں کرنا پڑتے۔“

پھر اس نے اعتراف کیا۔ ”یہ ضرور ہے کہ مجھ سے ٹیکوں کے کچھ قوانین کی خلاف ورزیاں سرزد ہوتی ہیں لیکن یہ کام کون نہیں کرتا؟ اس ملک میں ایسے ایسے معزز، شریف اور پارسا نظر آنے والے لوگ ٹیکس چوری کر رہے ہیں کہ اگر کبھی دیانت داری سے فہرشتیں نہیں تو ان میں شامل نام دیکھ کر لوگ حیرت سے بے ہوش ہو جائیں، اگر میں تھوڑا سا ٹیکس چوری کر کے ایک آدمی کو سستی شراب فراہم کرتا ہوں تو جب وہ اس شراب کو خوبصورت گلاسوں میں انڈیل کر اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اس وقت وہ بھی تو میرے جرم میں شریک ہوتا ہے، اسے کیوں نہیں مطعون کیا جاتا؟“

”کیا آپ واقعی اتنے معصوم اور بے قصور ہیں، جتنا اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں؟“ ایک رپورٹر نے سوال کر ڈالا۔

”آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟“ الیکٹرانک نے نہایت تحمل سے مسکراتے ہوئے التانہی لوگوں سے سوال کر ڈالا۔ ”کیا آپ لوگوں میں سے کسی نے کبھی مجھے اس قسم کی کوئی حرکت کرتے دیکھا ہے جیسے گھناؤنے الزامات مجھ پر لگائے جاتے ہیں؟“

سب خاموش رہے۔ ظاہر ہے اپنی آنکھوں سے الیکٹرانک کو کسی نے کب کچھ کرتے دیکھا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ”میں اپنے آپ کو بالکل معصوم اور بے قصور ہرگز نہیں کہتا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں ایک عام انسان اور بزنس مین ہوں۔ مجھ میں بھی دوسروں کی طرح عام اور بشری کمزوریاں موجود ہیں اور ایک بزنس مین کی حیثیت سے میں بھی دوسرے ہزاروں کاروباری افراد کی طرح اپنی چھوٹی موٹی چالیں چلتا رہتا ہوں لیکن بخدا!... میں کوئی عفریت یا شیطان نہیں ہوں۔ میں تو عوام کا خادم ہوں۔ میں صرف ان کو تھوڑی سی تفریح کا سامان کرتا ہوں تاکہ وہ دن بھر کی الجھنوں اور تھکن کے بعد کچھ تازہ دم ہو جائیں۔ میں نوے فیصد لوگ سبکی چاہتے ہیں اور میں انہیں کسی کام کیلئے مجبور نہیں کرتا۔ میں تو کوشش کرتا ہوں کہ سستی تفریحات کے نام پر کوئی غیر معیاری چیز ان تک نہ پہنچے۔“

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”بہر حال!... اب تو میں یہ سارے سلسلے بھی بند کر رہا ہوں۔ سب چیزوں کو خدا حافظ کہہ رہا ہوں۔ اب شہر میں امن ہی امن، سکون ہی سکون ہو جائے گا۔ یہاں کوئی گنہگار نہیں ہوگا۔ شہر میں اب کوئی شراب نہیں پینے گا۔ ہر شہری ہر برائی سے تاب نہ ہو جائے گا۔ لوگ شارٹنگ تک کھیلنا چھوڑ دیں گے۔ پولیس چیف ہیوز کہہ رہا تھا کہ شہر میں پولیس فورس کم ہے، اسے تین ہزار جوان اور چائیکس، میرا خیال ہے میرے جانے کے بعد اسے مزید تین ہزار جوانوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

اس نے ایک گہری سانس لی اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”بہر حال میں اپنے ان تمام دوستوں اور ہمدردوں کا شکر گزار ہوں جو ان آزمائشوں اور سختیوں کے دور میں میرے شانہ بشانہ رہے اور جنہوں نے کبھی کسی مشکل گھڑی میں میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میں اپنے تمام دشمنوں اور بدخواہوں کو معاف کرتا ہوں اور انہیں کرمس اور نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرے نہ ہونے سے ان لوگوں کا کرمس اچھے انداز میں گزرے!...“

اس کی آواز بھرا گئی اور کچھ لوگوں کو یہ بھی شبہ ہوا کہ شاید اس کی آنکھوں میں نمی جھلکاتی تھی۔ فی الحال یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس کا کرمس کس انداز میں گزرے گا لیکن یہ ضرور تھا کہ شہر میں الیکٹرانک کی موجودگی کی وجہ سے بہت سے غریب لوگ بھی اچھے انداز میں کرمس منا لیتے تھے۔

اس کے علاوہ وہ کم و بیش ایک لاکھ ڈالر کے جوئے ہر کرمس پر لوگوں کو بھجواتا تھا، ان کی فہرست بھی کچھ کم لمبی نہیں تھی۔ ان میں ہر طبقے کے لوگوں کے علاوہ سرکاری ملازموں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ لگتا تھا کہ اس سال کرمس پر وہ سب اپنے تحائف کا انتظار کرتے رہ جائیں گے۔

اخبار نویسوں کے ساتھ غیر رسمی بات چیت میں الیکٹرانک کی ”پرفارمنس“ زبردست تھی۔ اس نے ان اخبار نویسوں کے دل بھی بوجھل کر دیئے تھے جو اس کے خلاف خبریں لگاتے تھے اور اسے زبردست تنقید کا نشانہ بنا تے تھے۔ شہر سے اس کے رخصت ہونے کی خبر نے سب کو حیران بھی کر دیا تھا۔

(جاری ہے)



الکھون نے فلوریڈا جانے کی بات لکھن اپنے بدخواہوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے کئی وحشیہ ورنہ درحقیقت اس کا فلوریڈا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی جعلی کوکمر پر ہی چھوڑا اور دو پاؤں گاڑ رکھ کر ساتھ لے کر ٹرین میں بیٹھ کر ویسٹ کوسٹ کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔

# الکھون



وہاں سے اس نے میکسیکو کے شہر میچواکانا رخ کیا جو تفریحات کے لئے مشہور تھا پھر وہ بارڈر کے شمال کی طرف سان ڈیگو چلا گیا جہاں سے واپسی پر اس نے اپنے ملاقاتیوں کو بتایا۔ ”وہاں کے معززین نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور مجھے اپنی زمینوں پر ضیافتیں دیں۔“

پھر وہ لاس اینجلس چلا گیا۔ وہ وہاں کے سب سے اچھے ہوٹل ”پلٹ موڈ“ میں اپنی تمام تر خوش لباسی کے ساتھ کبھی کسی لاؤنج میں اور کبھی سوسنگ پول کے کنارے بیٹھا نظر آتا۔ اس کی انگلیوں میں حسب معمول ہیرے کی انگوٹھیاں جھللاتی نظر آتیں۔ وہ ذرا بھی پریشان یا مشکور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی آسودہ اور خوش حال سیاح تفریحی دورے پر نکلا ہوا ہے۔

جو لوگ اسے جانتے تھے، ان کے درمیان بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے وہ کہتا۔ ”میرے بارے میں گینگ وار وغیرہ کے قصے کچھ زیادہ ہی گھڑ لئے گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے بارے میں یہ قصے اور فرضی کہانیاں سن کر میں خود بہت تھک گیا تھا۔ میں تو ہر طرح کی گینگ وار وغیرہ کے خلاف ہوں۔ میں ہر شخص کے ساتھ امن آشتی اور صلہ جوئی سے رہتا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی سے لڑنے کا شوق نہیں ہے لیکن یہ شاید میری بد نصیبی ہے کہ جب بھی کہیں کوئی گینگ وار ہوتی ہے، اس سے میرا تعلق ضرور جوڑ دیا جاتا ہے۔“

ایک بار جب وہ اپنے جاننے والوں میں گھرا بیٹھا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ ایک اخباری رپورٹر اس کے دونوں پاؤں گاڑ رکھ کچھ شک زدہ سے انداز میں بار بار کان اکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے ان میں سے ایک کا تعارف اپنے کزن کی حیثیت سے اور دوسرے کا اپنے دوست کی حیثیت سے کرادیا۔

پھر اس نے وضاحت کی۔ ”لوگ کہتے ہیں میں پاؤں گاڑ رکھ کر ساتھ لے کر سفر پر نکلا ہوا ہوں، یہ بھی انہی فضول اور فرضی باتوں میں سے ایک ہے جو میرے بارے میں اکثر کی جاتی ہیں۔ مجھے بھلا پاؤں گاڑ رکھ کر ضرورت ہے؟ میری کیا کسی سے دشمنی ہے؟ مجھے کسی سے جھگڑا نہیں کرنا ہے، میرا یہ کزن اور دوست مجھے اکیلے پن سے بچانے کے لئے میرے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔“

الکھون کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ اپنے تفریحی سفر کے دوران کسی سے الجھتا نہیں چاہتا لیکن ایک شخص خودی اس سے آکر الجھ گیا۔ وہ لاس اینجلس پولیس کا سب سے سخت مزاج اور با اصول سراغ رساں براؤن تھا۔ جب اخبارات میں الکھون کی لاس اینجلس میں موجودگی کی خبریں چھپیں تو براؤن اسے اپنے چیف کا پیغام پہنچانے آیا۔ چیف کا پیغام تھا۔ ”ہمارے شہر میں کسی تکسٹر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، چاہے وہ تفریحی دورے پر آیا ہو یا کسی اور ارادے سے۔“

اس کی توقع کے برعکس الکھون نے اس بات پر کوئی خاص مزاحمت یا احتجاج نہیں کیا۔ وہ فوراً ہی لاس اینجلس سے روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گیا تاہم ریلوے اسٹیشن پر اس نے اخباری رپورٹرز سے یہ ضرور کہا۔ ”معلوم نہیں کیوں آج کل ہر شہر کی انتظامیہ مجھے شہر سے نکالنے پر تلی ہوئی ہے، لوگوں کے روتے سے اب تو میں تھک گیا ہوں۔ معلوم نہیں میں ہی سب کی آنکھوں میں کیوں ٹھکتا ہوں، میرا یہاں کوئی گڑبڑ کرنے کا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ میں تو یہاں ایک سیاح ہی کی حیثیت سے آیا تھا۔ میرے پاس شکاگو سے کمائی ہوئی کافی دولت ہے۔ اس میں سے کچھ دولت میں یہاں خرچ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ لاس اینجلس میں ہر اس شخص کو خوش آمدید کہا جاتا ہے جس کی جیب میں رقم ہو، ایسی کوئی مثال تو آج تک سننے میں نہیں آئی کہ کسی کے پاس دولت ہو، وہ خرچ بھی کرنا چاہتا ہو، اس کے باوجود اسے لاس اینجلس سے نکال دیا جائے۔“

”آپ نے اس پر کیا رد عمل ظاہر کیا؟“ ایک رپورٹر نے جانا چاہا۔ ”مجھے خصر تو بہت آیا لیکن فی الحال میں کسی سے الجھنے اور لڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میں تفریح کے ارادے سے گھر سے نکلا ہوں۔ کوئی بدمزگی نہیں چاہتا۔ اگر مجھے لاس اینجلس میں تفریح کی اجازت نہیں ہے تو کہیں اور کرلوں گا۔“ الکھون نے جواب دیا۔

”جتنے دن آپ کو یہاں رہنے کا موقع ملا۔ کیا آپ نے اس دوران بھی کوئی تفریح نہیں کی؟“ ایک اور رپورٹر نے پوچھا۔

”کوئی خاص تفریح تو نہیں کی لیکن پھر بھی یہاں میرا وقت اچھا گزرا، لوگوں سے ملنے ملائے کا سلسلہ بھی کافی پر لطف رہا۔ میں فلم اسٹوڈیو بھی گیا اور فلمیں بننے دیکھیں۔ اس سے پہلے میں نے بھی فلم بننے نہیں دیکھی تھی۔ یہ کام بھی خاصا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ میں کچھ فلمسٹارز کے گھروں پر بھی مدعو تھا۔“

میری یک فوراً اس زمانے کی مقبول فلمی ہیروئن تھی۔ الکھون اس سے بھی ملنا تھا۔ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس نے بتایا۔

”میرا خیال ہے میری یک فوراً کا پرانا مکان اس سے کہیں اچھا تھا جس میں وہ اب رہ رہی ہے۔“

”کیا آپ دوبارہ لاس اینجلس آنے کی کوشش کریں گے؟“ ایک رپورٹر نے پوچھا۔

”فی الحال تو مجھے گھر واپس جانے کا حکم دیا گیا ہے اور مجھے شکاگو میں ایک کام بھی ہے۔ وہ کام منہانے کے بعد میں اپنے کسی آدمی کو رقم دے کر

یہاں سمجھوں گا کہ وہ میرے لئے ایک اچھا سا بڑا سا گھر تلاش کر کے خریدے پھر میں یہاں آؤں گا اس وقت چونکہ میں یہاں کانگس دہندہ بن چکا ہوں گا اور یہاں میری ذاتی جائیداد موجود ہوگی اس لئے کوئی مجھے یہاں سے نکال نہیں سکے گا۔“

اس کے لئے ٹرین میں ایک خصوصی کپارٹمنٹ ریزرو تھا جس میں اس کا سامان رکھا جا چکا تھا۔ وہ اس میں سوار ہوا تو اسے پتہ چلا کہ اس

گئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں، جس شہر میں اتنا اندھیر چھا ہوا، وہاں کوئی شریف آدمی کیا کر سکتا ہے؟“

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اپنی زبردست رواجی ”برقار منس“ کی وجہ سے اسے پریس والوں کی ہمدردیاں حاصل ہوئیں یا نہیں، بہر حال یہ طے ہے کہ ان باتوں سے پولیس کے روتے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ شکاگو کے کئی اسٹیشن تھے اور ہر اسٹیشن پر الکھون کو اترنے سے روکنے کے لئے پولیس موجود تھی بلکہ ایک اسٹیشن پر تو پہلے کے انچارج کے طور پر تعینات کیا گیا تھا جواب ترقی پا کر سار جٹ بن چکا تھا۔ یہ وہی پولیس آفیسر تھا جس نے ڈرہی نامی بد معاش کو قتل کیا تھا۔ قیمت یہ تھا کہ جس اسٹیشن پر اسے تعینات کیا گیا تھا، اس پر ٹرین رکتی ہی نہیں تھی۔

الکھون کا پروگرام شکاگو کے نواحی علاقے جولیٹ کے اسٹیشن پر اترنے کا تھا اور اس نے اپنے بھائی رالف کو اپنی آمد کی اطلاع دے رکھی تھی۔ اس نے رالف کو ہدایت کی تھی کہ وہ 16 دسمبر کو صبح پونے دس بجے جولیٹ کے ریلوے اسٹیشن پہنچ جائے۔

رالف اس کا سعادت مند بھائی تھا لیکن زیادہ تر بد معاشوں کی طرح مونے دماغ کا آدمی تھا۔ وہ ایک مخمف پہلے ہی اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ چار مسلح آدمی بھی اس کے ساتھ تھے، وہ لوگ دو گاڑیوں میں گئے تھے۔ ہیستون کی موجودگی کی وجہ سے ان کی جینیں پھولی پھولی دکھائی دے رہی تھیں۔ گاڑی میں ایک شاٹ گن بھی موجود تھی۔

جولیٹ کے ایک پولیس آفیسر نے ان کی گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں دیکھ لیں۔ اسے دونوں گاڑیاں مشکوک لگیں پھر اس نے رالف اور اس کے ساتھیوں کو فوجیوں والے انداز میں پلیٹ فارم پر مارچ کرتے بھی دیکھ لیا۔ پولیس نے انہیں حراست میں لے لیا۔

ٹھیک پونے دس بجے الکھون پلیٹ فارم پر اترتا تو اس کے استقبال کیلئے جولیٹ کا پولیس چیف بہ نفس نفیس موجود تھا۔ اس کا نام جان کوران تھا۔

”تمہارا نام الکھون ہے؟“ اس نے دریافت کیا۔ ”بے شک۔“ ”الکھون نے متانت سے جواب دیا پھر کہا۔“ اور تم غائب یہاں کے پولیس چیف ہو۔۔۔۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔“ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

پھر اس نے دیکھا کہ مستعد اور چاق و چوبند دکھائی دینے والے چھ پولیس مین اسے گھیرے میں لئے ہوئے تھے اور ان کی شاٹ گنیں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”یہ سب کیا ہے؟“ الکھون نے حیرت اور بے یقینی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا کوئی مفروضہ قاتل یا دہشت گرد ہوں؟ مجھ پر اتنی ساری بندوبست کیوں تانی جارہی ہیں؟“

پولیس چیف کوران نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ ”اپنا ہتھول میرے حوالے کر دو۔“

الکھون نے بے چوں چرا اپنا چھوٹا سا ہتھول نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا پھر فاضل گولیوں کے دوکپ بھی نکالے اور اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی لے لو۔۔۔۔۔۔ ان کا اب میں کیا کروں گا۔۔۔۔۔۔ میرے لئے یہ بیکار ہیں۔“

اسے لے جا کر مقامی حالات کی ایک کٹھری میں بند کر دیا گیا جس میں دو آوارہ گرد شامل پہلے ہی سے موجود تھے۔ دوری سے ان کے منہ سے شراب کی جھرسوں سے پسینے کی بو آرہی تھی۔ وہ صرف اس لئے حوالات میں بند تھے کہ ان پر 22 رڈر اجرماند ہوا تھا مگر ان کے پاس ادا انگلی کیلئے 2 رڈر بھی نہیں تھے۔

الکھون کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے فوراً ان کا جرمانہ ادا کیا اور انہیں کٹھری سے نکلا کر زرا سکون کی سانس لی۔

آٹھ گھنٹے بعد ان سب کی ڈھائی ڈھائی ہزار کے بانڈ پر ضمانت ہوگئی اور وہ لوگ شکاگو روانہ ہو گئے۔ روانہ ہونے سے پہلے الکھون نے پولیس چیف سے کہا۔ ”میں اپنے اس کیس کی جیوری کے سلسلے میں جب دوبارہ جولیٹ آؤں گا تو یہاں کے فلاحی اداروں کو چندے کے طور پر

بھاری رقموں کا میرا اقدام اس بات کی نشانی ہوگا کہ میں جولیٹ کے کسی آدمی سے خفا نہیں ہوں۔“

شکاگو میں پولیس نے اسے نہیں پکڑا۔ اس کی ٹھنکی وجہ یہ تھی کہ وہ جولیٹ کی پولیس کے ہاتھوں پکڑا جا چکا تھا اور ابھی اس کا معاملہ وہاں کے علاقہ جیمسٹ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ شکاگویش الٹ اس کا مکان پولیس کے گھیرے میں تھا اور اسے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

البتہ جولیٹ کے جیمسٹ کے سامنے جیسی کے لئے اسے گھر سے نکلنے دیا گیا۔ اس کی آمد کے ایک گھنٹے بعد اس کی بیٹی ہوئی۔ اس پر واقعی کسی خاص یا سنگین جرم کا الزام تو عائد نہیں کیا جاسکتا تھا، اس پر اور اس کے آدمیوں پر مجموعی طور پر چار ہزار چند سو ڈالر کے جرمانے عائد ہوئے جو الکھون نے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر موقع پر ہی ادا کر دیے۔

اس کے دوسو ڈالر بھانپا بچ رہے تھے۔ عدالت کے کلرک نے وہ اسے واپس دینا چاہے تو الکھون نے کہا۔ ”تم میری طرف سے رکھ لو اور اگر تم رکھنا پسند نہ کرو تو اس مرکز کے کوئے پر کھڑے ہوئے سانا کا زکو فلاحی مقاصد کے لئے دے دینا اور اسے بتا دینا کہ یہ الکھون کی طرف سے ہیں۔“

کلرک کی بیٹی اسی سال مس امریکا منتخب ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس نے ان دوسو ڈالر کا کیا کیا؟

شکاگو واپس پہنچ کر الکھون کو ایک بار پھر نظر بندی کی سی حالت میں اپنے گھر میں بند رہنا پڑا۔ پولیس چیف ہیوز نے کہہ رکھا تھا کہ اگر اس نے اپنے گھر کی کھڑکی سے سرگرمی باہر نکالا تو ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔ لیکن اپنے بعض قریبی دوستوں اور صحافیوں کے سامنے اس نے اعتراف کیا۔ ”درحقیقت ہم فی الحال اس کا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتے لیکن ہم اس کے لئے زندگی ذرا دشوار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں شاید کچھ آکر وہ خودی شکاگو چھوڑ کر چلا جائے۔ اگر وہ دور جانے والی کسی ٹرین میں بیٹھنے کے ارادے سے نکلے تو شاید ہم خود اسے چھوڑنے اسٹیشن تک جائیں۔“

پولیس کی حکمت عملی کامیاب رہی۔ آخر الکھون نے شکاگو سے کم از کم عارضی طور پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بار اس نے جے جے فلوریڈا کا رخ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ایک عجیب اتفاق یہ تھا کہ ان دنوں اٹلی میں بھی موسیقی نے ٹکنسٹرز کی شہرت رکھنے والے لوگوں کو گھروں میں نظر بند کر رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

الکھون نے ریاست فلوریڈا کے شہر میامی کا رخ کیا تھا۔ میامی اپنی خوشگوار روپوشی و صوب اور صاف ستھرے جینکے ساحلوں کی وجہ سے الکھون کو بہت پسند آیا۔ اسے اس شہر میں اپنے وطن اٹلی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ میامی پہنچ کر اس نے اسے امریکا کے ایک خوبصورت باغیچے سے تشبیہ دی۔ اس کے خیال میں میامی میں زندگی خوب صورت محسوس ہوتی تھی اور اس شہر کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہاں زندگی کی سرگرمی ایک غریب آدمی کی بھی رسائی میں تھیں۔

فطری خوب صورتیوں اور معتدل موسم کے علاوہ بھی کئی چیزیں یہاں الکھون کو اپنے لئے بے حد سازگار دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں بھی ہوٹلوں، کلبوں، شراب خانوں اور دیگر تفریحی مقامات کے علاوہ بڑے بڑے اسٹورز تک میں جوئے کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔

الکھون نے کئی روز تک پورے شہر میں گھوم پھر کر ان تمام مشینوں پر جو اٹھیل کر نہ صرف اپنے شوق کی تسکین کا سامان کیا بلکہ اس طرح اس نے پورے شہر اور اس کے ماحول کا بھی جائزہ لیا۔ اسے فوراً ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس شہر کی پولیس میں بھی کرپشن کا کافی رجحان تھا۔ کئی پولیس والے کچھ رقم لے کر سادہ لباس میں اس کے ساتھ محافظ کے طور پر چلتے گئے تھے۔ وہ خود سعادت مند ملازموں کی طرح جوئے کے اڈوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتے تھے۔

نے سفر کے دوران پینے کے لئے شراب کا جو ایک جگ رکھا تھا، وہ کسی نے چرا لیا ہے۔

اس نے دوبارہ دو دروازے پر آکر رپورٹرز کو یہ بات بتائی اور کہا۔ ”مجھے جیسے لوگ جو دوسرے شہروں سے یہاں رقم خرچ کرنے اور تفریح کرنے آتے ہیں، انہیں تو جرائم پیشہ قرار دے کر نکال دیا جاتا ہے لیکن شہر کی انتظامیہ کو یہاں اپنی ناک تلے موجود وہ چور نظر نہیں آتے جو بے چارے مسافروں کا گلزار کرنے کا سامان بھی چرا کر لے جاتے ہیں۔“

جب یہ خبر شکاگو پہنچی کہ الکھون واپس آ رہا ہے تو وہاں کے پولیس چیف ہیوز نے کہا۔ ”ہم یہاں اس کے لئے ایک احتیاطیہ کینیٹھیل دیں گے جو اسے اسٹیشن سے آگے نہیں آنے دیں گے۔“

الکھون کو راستے میں اس بات کی خبر ہوئی تو وہ ہنس دیا اور بولا۔ ”یہ ہیوز بھی اکثر مذاق کرتا رہتا ہے۔ میں شکاگو کا قاعدہ ٹیکس دہندہ شہری ہوں، وہاں میرا گھر، میری جائیداد اور میری فیملی ہے، وہ مجھے وہاں آنے سے کیسے روک سکتا ہے؟ کیا کسی کو اس کے اپنے گھر جانے سے بھی روکا جاسکتا ہے؟“

یہ باتیں کرتے ہوئے الکھون خامسے خوشگوار موڈ میں تھا لیکن جب وہ اگلے اسٹیشنوں سے گزرا تو اس کی خوش مزاجی رخصت ہوگئی۔ اس نے دیکھا ہر اسٹیشن پر پولیس کی بھاری نفری تعینات تھی۔ گویا اس کے لئے یہ انتظام کیا گیا تھا کہ وہ راستے میں بھی کسی اسٹیشن پر نہ اترے پائے۔

وہ یہ اندازہ کر کے حیران رہ گیا کہ بعض اسٹیشنوں پر تو پولیس والے پھل فروشوں کے روپ میں بھی موجود تھے اور ٹھیلے لئے کھڑے تھے جبکہ ہر اسٹیشن پر الکھون کی آمد سے پہلے ہی اس کے بارے میں نہ جانے کیا افسانے مشہور ہو جاتے تھے کہ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اس کے کپارٹمنٹ کے سامنے جھوم کی صورت میں کھڑے ہوتے تھے۔

ہیوز مذاق پر گز نہیں کر رہا تھا۔ وہ الکھون کی شکاگو واپسی کو روکنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ چیف ڈیٹکو ولیم کوز نے بھی اخبار نویسوں کو یہی بتایا۔ ”الکھون کو فرین سے اترنے نہیں دیا جائے گا بلکہ آگے روانہ کر دیا جائے گا۔ ہم اسے واضح طور پر بتا دیں گے کہ وہ اب اس شہر میں داخل نہیں ہو سکتا۔“

ٹرین جب الی ٹوائے کی حدود میں داخل ہوئی تو الکھون نے وہاں اپنے منتظر رپورٹرز سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت ہی عجیب اور ناقابل یقین بات ہے کہ ایک شہری جس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ موجود نہیں ہے، پولیس اسے اس کے اپنے ہی گھر جانے، اپنی بیوی اور بچوں سے ملنے سے روک دے جبکہ ان پولیس والوں کی نگاہوں میں مجھے جیسے شہریوں کے ادا کئے ہوئے ٹیکسوں ہی سے دی جاتی ہیں۔ وہ لوگ طاقت کے ذریعے مجھے میرے گھر جانے سے روکنے پر تلتے ہوئے ہیں اور اگر میں نے مزاحمت کی تو شاید وہ مجھے جیل میں ڈال دیں۔“

تاہم اس بار وہ آسانی سے ہار ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس نے مضبوط لہجے میں صحافیوں سے کہا۔ ”لیکن میں ہر حال میں اپنے گھر جاؤں گا۔ شکاگو میں میرا گھر ہے، جائیداد ہے، بیوی اور بچے ہے۔ میں ایک ٹیکس دہندہ شہری ہوں جو کسی جرم میں محسوس اور پولیس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ بھلا مجھے کیسے روک سکتے ہیں؟ مجھے گھر جانے سے روکنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ میری کھوپڑی میں گولی مار دیں۔“

”ایک بار آپ پر الزام آیا تھا کہ آپ نے چیف ڈیٹکو کو قتل کرنے یا کرانے کی کوشش کی تھی، ہو سکتا ہے وہ لوگ آپ کے خلاف وہ پرانا کیس نکال لیں؟“ ایک صحافی نے خیال ظاہر کیا۔ ”وہ قصہ بھی میں آپ لوگوں کو سنادوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ واقعہ اصل میں کس طرح پیش آیا تھا اور کس طرح بات کا پتھر بٹا کر اسے میرے خلاف استعمال کیا گیا۔“ الکھون نے فوراً کہا۔ ”میرے دو آدمیوں کو پولیس اٹھا کر لے گئی تھی۔ ان کے پاس یقیناً ہیستون موجود تھے لیکن اپنی حفاظت کے لئے لائسنس کے ساتھ ہیستون رکھنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔ ان کے پاس ہیستون تھے تو ان کے لائسنس بھی تھے۔ چیف ڈیٹکو نے انہیں پوچھ گچھ کے لئے اپنے کمرے میں بلایا اور وہاں ایک پولیس والے نے میرے آدمی کے پیٹ میں گھونسا مارا جس کی وجہ سے اس کی پیٹ میں پھنسا ہوا ہیستون نکل کر پیچھے گرے لگا۔ اس نے فوراً جھک کر اسے پکڑا اور فرش پر گرنے سے بچایا۔ ظاہر ہے یہ ایک اضطرابی سی حرکت تھی، ہماری جب کوئی چیز گرنے لگتی ہے تو فطری طور پر ہم ایسا ہی کرتے ہیں لیکن جب۔۔۔۔۔۔ اس بات پر چیف ڈیٹکو نے شور مچا دیا کہ میرے آدمی نے اس کے اپنے ہی آفس میں قتل کرنے کے لئے ہیستون نکال لیا تھا۔“

الکھون نے فریادی سے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلائے اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے کہتے ہیں چوری اور ہیڈ زوری۔۔۔۔۔۔ آپ ذرا پولیس کی غلط بیانیوں اور الزام تراشیاں دیکھیں۔ میرے آدمیوں پر تشدد کر کے وہ جرم اور ظلم و زیادتی کے مرتکب خود ہو رہے تھے لیکن الزام بھی انہیں انہوں نے میرے ہی آدمی پر لگا دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ کہہ کر اپنی گھڑی ہوئی اس کہانی کو مزید آگے بڑھانے کی کوشش کی کہ میرے آدمی نے چیف ڈیٹکو ولیم کو قتل کرنے کی کوشش میری ہدایت پر کی تھی جبکہ اس وقت تک مجھے پتہ بھی نہیں تھا کہ میرے آدمی پکڑے

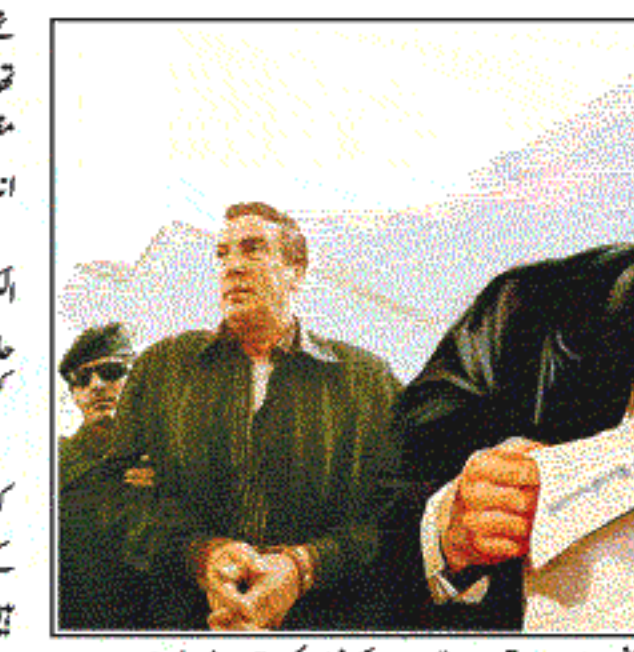


میامی سٹیج کے علاقے میں پولیس کے سرخرا سناٹوں نے جوئے کے ایک

اڈے پر چھاپہ مارا اور کئی میٹھیں وغیرہ اٹھا کر لئے گئے۔ اڈے کا مالک فوراً کاؤنٹی کے شیرف کے پاس جا پہنچا اور بڑے غصے سے بولا۔ ”میں ایک ہزار ڈالر فی ہفتہ پولیس افسروں کو اس بات کا دیتا ہوں کہ میرے کاروبار کو تحفظ دیا جائے گا لیکن مجھے تحفظ دینے کے بجائے میرے

ملاقات کرانی جنہیں اس نے اس موقع کے لئے خاص طور پر شکا گئے بلوایا ہوا تھا۔

ان میں اس کے خاص گمن میں بھی تھے اور اس کے فاشی کے اڈوں کے انچارج بھی..... جن کے ہمراہ کچھ نہایت خوب صورت خواتین بھی تھیں۔ ان سب لوگوں سے مل کر پنڈرین نے زبردست سسٹی محسوس کی۔ وہ تو صرف الیکون سے مل کر ہی خاصا سرزدو سارہا کرتا تھا جسے



بعض اخبارات تو اس وقت دنیا کے خطرناک ترین مجرم کا خطاب دے چکے تھے۔ پنڈرین کو گویا یقین نہیں آتا تھا کہ دنیا کا خطرناک ترین مجرم اس کا قریبی دوست بن چکا ہے، وہ تو گویا الیکون کا بے دام نگاہ بن کر رہ گیا تھا۔

جلدی وہ الیکون کی ہدایت پر اس کے ایک مسلح باڈی گاڑ کے ساتھ روم ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والی کنبی کے دفتر جانے لگا۔ اس کنبی کے توسط سے شکا کو الیکون کے ایک فرضی اور ہم نام پر بڑی رقم کے منی آرڈر آتے تھے۔ پنڈرین یہ منی آرڈر وصول کر کے الیکون کو لاکر دینے لگا۔ منی آرڈر وصول کرنے کے لئے وہ اپنی راننگ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے فرضی نام کے دستخط کرتا۔ اسے اس کام میں لطف آتا تھا۔ وہ گویا کسی خفیہ اور سسٹی خیریم کا ایک حصہ بن رہا تھا۔

یہ احساس اس کے لئے خوشی اور طمانیت کا باعث تھا کہ الیکون کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت تھی اور وہ اس سے کوئی خاص کام لے رہا تھا۔ وہ اہل بات میں فخر محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے الیکون کا قریبی آدمی سمجھا جانے لگا تھا۔ اس نے میامی سٹیج کے میگزین کو فخر سے بتایا۔ ”ایک پارہنی ڈیلر کو ہینک پڑ گئی ہے کہ الیکون یہاں مکان خریدنا چاہتا ہے۔ ڈیلر میرے پیچھے لگ گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے الیکون کو مکان دلاؤں۔“

”الیکون کو مکان صرف میں اور تم مل کر دلاؤ گے۔“ لیس نے فوراً فیصلہ سنایا کیونکہ وہ میامی سٹیج کا میسر ہونے کے ساتھ ساتھ پارہنی ڈیلر بھی تھا۔ اسے یقین تھا کہ الیکون کوئی ہنگلی جائداد ہی خریدے گا، جس میں اچھا خاصا کمیشن بن جائے گا۔

اس نے اور پنڈرین نے مل کر الیکون کو بہت سے مکانات دکھائے۔ آخر کار اسے پام آئی لینڈ میں ایک مکان پسند آگیا۔ پام آئی لینڈ تقریباً پون میل لمبا اور بہت کم چوڑا ایک خوب صورت جزیرہ تھا، جس پر دولت مند طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مکانات تھے۔ ایک کازوے کے ذریعے یہ جزیرہ میامی سے ملا ہوا تھا اور میامی سٹیج کی حدود میں آتا تھا۔

اس میں ایک ہی بڑی سڑک تھی، جس کے دونوں طرف امیر طبقے کے ولاز تھے۔ ان ولاز کی پشت پر کھڑی تھی۔ الیکون کو جو مکان پسند آیا تھا، وہ 1922ء میں کلیئر نامی ایک شخص نے بڑے شوق سے اپنے لئے بنایا تھا مگر اب وہ کسی وجہ سے اسے بیچ رہا تھا۔

مکان چودہ کمرے پر مشتمل تھا اور دو منزلہ تھا۔ اس کا طرز تعمیر ہسپانوی تھا۔ اس کی پشت پر سوئٹ چوڑا اور تین سوئٹ لمبا ساحلی کھڑا بھی مکان کی حدود میں شامل تھا۔ مکان کے گیٹ کے پاس تین کمرے پر مشتمل گیٹ ہاؤس بھی موجود تھا۔

الیکون نے یہ مکان تقریباً ساٹھ ہزار ڈالر میں مارچ 1928ء میں خریدا۔ اس کی کچھ تقسیم بھی باقی تھیں۔ الیکون نے مکان بیوی کے نام پر خریدا اور اس کی تزئین و آرائش اور اس کی ساخت میں ترمیم اور اضافے وغیرہ کرانے پر ایک لاکھ ڈالر خرچ کر ڈالے۔ اس نے مکان کو پہلے سے کہیں زیادہ پرکشش اور شاندار بنالیا۔ اس نے مکان کی پشت پر ایک بڑا سوئٹنگ پول مزید بنایا جس کے ساتھ پانی کو فلٹر کرنے کا پلانٹ بھی نصب کیا گیا تھا۔ یہ پلانٹ عام پانی کو بھی فلٹر کر سکتا تھا اور سمندر کے پانی کو بھی..... الیکون کے مکان کا یہ سوئٹنگ پول پوری فلوریڈا ریاست کا سب سے بڑا سوئٹنگ پول تھا۔

تاہم الیکون اپنے مکان کی ان تہنشات سے لطف اندوز ہونے کے لئے رک نہیں سکا۔ اپریل 1928ء میں شکا کو میں انکیشن کا پرائمری مرحلہ چل رہا تھا اور الیکون نے اس موقع پر وہاں جانا ضروری محسوس کیا۔

شکا کو جا کر اس نے عجیب حال دیکھا۔ گوکہ ابھی صدارتی انتخابات بہت دور تھے لیکن امیدواروں کے حامی ایک دوسرے کے گھروں اور کاروباری جگہوں پر بموں سے حملے کر رہے تھے۔ زیادہ تر میسر تھا سن کے حامی نشانہ بن رہے تھے جو اب صدارتی امیدوار نامزد ہونے جا رہا تھا۔ گوکہ اس کے حامیوں پر حملے ہو رہے تھے مگر اس کی پوزیشن بہتر ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ کم از کم ایک لاکھ پارٹی ورکر اس کے لئے کام کر رہے تھے جبکہ بعض گروہ بھی ابھی تک اس امید پر کسی نہ کسی انداز میں اس کی مدد کر رہے تھے کہ وہ کامیاب ہونے کے بعد ان کے حق میں اچھا ثابت ہوگا کوئی الحال اس نے انکیشن پھیری تھیں۔

امیدواروں کے حامی بھی قتل ہو رہے تھے اور ان کے جنازوں پر بھی ہنگامے اور قتل و غارت ہو رہی تھی۔ تھا سن کے مقابل صدارتی امیدوار ڈین کے گھر تک پر حملے ہو رہے تھے۔ اس کے گھر اور دفتر دونوں جگہوں پر بم پھینکا گیا۔ جوں کے گھروں پر بھی حملے ہو رہے تھے۔

نفیست تھا کہ ان میں جانی نقصان بہت کم ہو رہا تھا۔ ڈین خود بھی بار محض اتفاقاً ہلاک ہوتے ہوئے بچا تھا۔

حملے پہلے خود تھا سن پر ہوتے تھے، پھر اس کے مخالفوں پر..... لیکن بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ اس کی خاص حکمت عملی تھی۔ پہلے وہ خود ہی اپنے اوپر حملے کراتا تھا تا کہ مظلوم ہونے کا دواہل کر سکے۔ اس کا اپنا کوئی آدمی شاؤدو نارہی مرتا تھا۔ زیادہ تر مخالفوں ہی کے آدمی مرتے تھے۔ ان کے بارے میں تھا سن معصوم بن جاتا تھا کہ اسے ہلاک کیا معلوم کون یہ سب کچھ کر رہا ہے، یہ معلوم کرنا تو پولیس اور دوسری ایجنسیوں کا کام ہے۔

عالم یہ تھا کہ انکیشن کے سلسلے میں ابھی پرائمری کا ہی مرحلہ چل رہا تھا۔ اصل انکیشن کا ابھی نام و نشان نہیں تھا اور ڈیزدہ ماہ کے دوران 70 سے زائد افراد قتل ہو چکے تھے اور وہ سب کے سب معمولی اور عام آدمی نہیں تھے۔ ان میں ممتاز سیاسی شخصیات اور اہم سیاسی ورکر بھی شامل تھے۔

پولیس کی پکڑ وکڑ بھی جاری رہتی تھی مگر اس سے حالات میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ پکڑے گئے اکثر لوگ پولیس کی کرپشن اور عدالتی نظام کی خامیوں کی وجہ سے جلد ہی چھوٹ کر باہر آ جاتے تھے اور دوبارہ اپنی سرگرمیوں میں لگ جاتے تھے۔

حالت یہ تھی کہ شکا کو کا کوئی شہری جب کسی دوسرے شہر جا کر ہوئی میں ٹھہرتا تھا تو اشتباہیہ لپک کر سسکراتے ہوئے مگر حلقہ انداز میں کہتا تھا۔ ”بھئی مبارک ہو، آپ شکا کو کے رہنے والے ہیں اور زندہ سلامت گھوم رہے ہیں۔“

انٹرنس کمپنیوں نے ان عمارات کا بیہ کرنا بند کر دیا، جہاں سیاسی اجتماعات منعقد ہوتے تھے، خاص طور پر ڈین اور اس کے آدمی جس عمارت میں اجتماع منعقد کرنے کے لئے جاتے تھے، وہاں سے اکثر انہیں انکار ہی سننا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک چرچ نے انہیں اپنے ہاں مذہبی قسم کا اجتماع منعقد کرنے سے بھی منع کر دیا۔

اڈے پر چھاپہ مارا جا رہا ہے، اگر یہ قریب آئے گی تو پھر مجھ سے رقم لینے والوں کو بھی نیل جانا پڑے گا۔“

تھوڑی ہی دیر بعد اس شخص کی جوئے کی میٹھیں وغیرہ واپس اس کے اڈے پر پہنچا دی گئیں۔ اس طرح کے واقعات الیکون کے بھی علم میں آ رہے تھے، وہ نہایت توجہ سے ان تمام معاملات اور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ میامی اس کے مطلب کا شہر ہے۔

میامی سٹیج کے علاقے کو کنٹرول کرنے والا سرکاری عہدے دار ”سٹی منیجر“ کہلاتا تھا۔ اس کا نام کاڈو چٹا تھا۔ الیکون کی اس سے اور کئی دوسرے بڑے انتظامی عہدے داروں سے ملاقات ہو چکی تھی اور اس نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ یہاں کوئی شاندار مکان خریدنا چاہتا ہے۔

”اگر میں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا تو میں یہاں بھاری سرمایہ کاری کروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”میں یہاں ایک شاندار ہوٹل تعمیر کراؤں گا اور دوسرے کئی کاروبار بھی شروع کروں گا۔ میری وجہ سے شاید میرے دوسرے بہت سے دوست بھی کاروبار اور سرمایہ کاری کے لئے یہاں کارخ کریں۔ میں شاید ورڈی کلک کامیاب بھی بن جاؤں۔“

میامی کے پولیس چیف کو الیکون کو میامی میں قیام سے روکنے کا کوئی قانونی طریقہ نہیں سوچ سکا تھا۔ الیکون کی یہ باتیں جب اس تک پہنچیں تو اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ شرفاء کی طرح یہاں رہنے اور قانونی کاروبار کرنے کے لئے آ رہا ہے تو ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے، اگر اس نے یہاں گروہ بازی یا بد معاشوں والے دھندے شروع کئے تو پھر ہم انکیشن لیں گے۔“

تین گاڑوں کے ساتھ الیکون نے میامی کے مرکزی علاقے میں واقع ہوٹل ڈی لیون میں چھت پر ایک کشادہ سوئٹ لیا جس کے آگے سائبان والا برآمدہ اور طویل و عریض کھلی چھت تھی۔ فی الحال یہ جگہ الیکون کے لئے ہیڈ کوارٹر کا کام دے سکتی تھی۔

اپنی بیوی اور بچے کے لئے اس نے میامی سٹیج کے علاقے میں ایک شاندار اور کشادہ مکان چھ ماہ کا ایڈوائس کر دیا۔ میامی سٹیج کا جیمبر آف کامرس الیکون کو شہر سے لٹکانے کے لئے اپنی ہی کوششیں کر رہا تھا۔ دو منر کلک اور ایک فلاحی ادارے کے عہدے دار بھی جا کر میامی سٹیج کے میگزینس جوئیر سے ملے تھے اور اس پر زور دیا تھا کہ وہ الیکون کو میامی میں قیام سے باز رکھنے کے لئے کچھ کرے۔

میگزین اور پولیس چیف نے الیکون کو ملاقات کے لئے بلایا۔ یہ ملاقات کافی دیر جاری رہی، بعد میں میگزین نے چیدہ چیدہ شہریوں اور اخبار نویسوں سے باتیں کرتے ہوئے قدرے نزوں سے اعزاز میں بتایا۔

”ہم نے الیکون سے ملاقات کی تھی اور اسے بتا دیا تھا کہ علاقے کے معززین نہیں چاہتے کہ وہ یہاں قیام کرے لیکن میری ذاتی رائے میں وہ ایک نہایت نفیس، شائستہ اور سچا شخص تھا۔ آدی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی میامی آمد سے شہر کو فائدہ ہی پہنچے گا، نقصان نہیں.....؟“

ادھر الیکون نے بھی رپورٹرز سے باتیں کرتے ہوئے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”اگر شہر کے معززین نہیں چاہتے کہ میں یہاں قیام کروں تو ٹھیک ہے..... میں چلا جاؤں گا۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے کہ میں کہاں جاؤں گا بہر حال یہ کوئی ایسا سنگین مسئلہ نہیں ہے، قسمت جہاں لے جائے گی، چلا جاؤں گا۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ زبردستی یہاں کے معززین کے سر پر سوار ہو جاؤں۔ میں لوگوں کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔“

حقیقت یہ تھی کہ وہ الیکون کے لئے خاصی در بدری کا زمانہ تھا۔ میامی آنے سے پہلے الیکون نے بیٹن پیٹرز برگ گیا تھا۔ پولیس وہاں بھی اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ بہماز کے کسی جزیرے پر مکان خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن کسی وجہ سے اس پر ڈراما پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ مصدقہ وجہ معلوم نہیں ہو سکی تاہم سننے میں آیا تھا کہ بہماز کے گورنر نے اسے وہاں رہائش اختیار کرنے سے منع کر دیا تھا۔

ادھر اس کے بھائی رالف اور البرٹ نے نیوا آریلیز کارخ کیا تو انہیں بھی وہاں پولیس نے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا کیونکہ ان کے پاس سے تین ہتھیار برآمد ہوئے تھے۔ بہر حال وہ جلد ہی ضمانت پر رہا ہو گئے پھر انہیں اس شرط پر شہر سے جانے کی اجازت دے دی گئی کہ وہ دوبارہ وہاں نظر نہ آئیں۔

ادھر شکا کو میں البتہ الیکون کا گروہ پہلے ہی کی طرح فعال تھا۔ نزلہ صرف الیکون پر ہی گرا تھا۔ گروہ کے لئے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ الیکون نے اسے اتنا منظم بنادیا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں بھی سب کام ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے، جس کے سپرد جوڈے داریاں تھیں، وہ انہیں نہایت ”اچھے“ طریقے سے ادا کر رہا تھا۔

سب دھندے پہلے ہی کی طرح چل رہے تھے۔ لڑاکے اپنی جگہ سرگرم تھے، انہوں نے زیادہ بد معاشی دکھانے والے دو دشمنوں کے شکاکوں کو بموں سے اڑا دیا تھا پھر ان کے گھروں پر بھی فائرنگ کی تھی جس کے بعد وہ سیدھے ہو گئے تھے۔

میامی میں الیکون نے قدرے عاجزی اور نرمی اختیار کی تو ان لوگوں کا جوش و خروش ذرا خفنا پڑ گیا جو اسے نکالنے کے درپے تھے۔ اس دوران الیکون نے بھی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔ اس نے منظر عام پر آنا ہی چھوڑ دیا، وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر گویا اپنی کچھار میں گھس کر بیٹھ گیا۔

رفتہ رفتہ وہ سسٹی اور کشیدگی ختم ہو گئی جو الیکون کی آمد کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس دوران الیکون نے ہوٹل ڈی لیون کے مالک پنڈرین کو ٹھولا اور محسوس کیا کہ وہ اس کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

پنڈرین ایک سابق میگزین کا بیٹا تھا۔ نوجوان ہی تھا، وہ اپنے ہوٹل میں منیجر کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ الیکون نے دیکھا تھا کہ اس نوجوان کے اوپر طے طے ایسے بھلے بھلے تعلقات تھے لیکن وہ بے ضرر سے تعلقات تھے شاید اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ ان تعلقات سے کون سے فائدے اٹھا سکتا ہے اور کس طرح اٹھا سکتا ہے۔

دوسری طرف وہ الیکون کی ”شہرت“ رکھنے والے لوگوں سے ملنے اور ان کے قریب ہونے میں کشش محسوس کرتا تھا۔ اس کے ارد گرد معاشرے کے اچھے طبقات کے لوگ موجود رہتے تھے لیکن وہ شاید اسے کچھ زیادہ اہم نہیں لگتے تھے، وہ کچھ ”اور طرح“ کے لوگوں سے میل ملاقات رکھنا چاہتا تھا۔

الیکون نے اس کی اس کھلی کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے اسے افرین کر دیا کہ اس نے اپنے گھر میں پارٹی پر مدعو کیا۔ افرین کر دیا کہ ایک خوب صورت ساحلی علاقہ تھا جہاں زیادہ تر امراء کے مکانات تھے۔

الیکون نے اپنی پارٹی میں پنڈرین کو نہ صرف اپنی خوب صورت بیوی اور گول منول بیٹے سے ملوایا بلکہ کچھ اور ”کام“ کے لوگوں سے بھی اس کی

چرچ کی انتظامی کنبی نے شرط یہ رکھی کہ اگر چرچ کی عمارت منہدم ہوگی تو ڈین یا اس کی پارٹی اسے دوبارہ تعمیر کرائے گی، اگر اسے جزوی نقصان پہنچا تو مرمت کرا کے دے گی، جو جانی نقصان ہوگا، ان کے انٹرنس کے طور پر رقم ادا کرے گی۔

خاہر ہے ان شرائط کے ساتھ وہاں کون اجتماع، منعقد کر سکتا تھا؟ شکا کو کے شہری ان تمام حالات پر بے حد پریشان اور دلگرفتہ رہتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ شہر میں قانون نام کی کوئی چیز رہی ہی نہیں تھی جبکہ تھا سن کی انتظامی مہم شروع ہونے سے پہلے اس نے اور اس کے مقرر کردہ پولیس چیف ہوز نے اعلان کیا تھا کہ وہ لوگ نوے دن کے اندر اندر تمام مجرموں اور قانون شکنوں کو شہر سے نکال باہر کریں گے۔

ویسے تو یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا کہ وہ شہر کے سب سے بڑے مجرم الیکون کو شہر بدر کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن اس کے بعد تو حالات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا جیسے کچھ بھی کسی کے قابو میں نہیں تھا۔

ڈین نے ایک انتظامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”تھا سن کو اس شہر کا نظام چلانے کے لئے 25 کروڑ ڈالر کا بجٹ ملتا ہے۔ اس کے باوجود شہر کا یہ حال ہے، ہم اس رقم کے بدلے کیا حاصل کر رہے ہیں؟“

”ہم..... بندوبست اور گولیاں.....“ جلسے میں سے کوئی چلا یا۔ دھشت گرد جو ہم اپنے مخالفین کے گھریا دکاں پر پھینکتے تھے، وہ پنڈرین کی طرح انٹاس کی شکل کے ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کا نام ”پائن اپٹل“ ہی پڑ گیا تھا۔ اسی مناسبت سے انکیشن کے اس پرائمری مرحلے کو اخبارات نے ”پائن اپٹل پرائمری“ کا نام دے دیا تھا۔

اس زمانے میں افریقی ملک نکاراگوا میں حالات خراب تھے۔ چنانچہ اس وقت کے امریکی صدر کولج نے نکاراگوا میں موجود امریکی کارپوریٹس اور کمپنیوں کی املاک وغیرہ کی حفاظت کے لئے فوجی دستے بھیجے۔ اس پر ایک امیدوار نے انتظامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر کو مخاطب کر کے کہا۔ ”جناب صدرا نکاراگوا میں امریکی املاک شکا کو سے زیادہ محفوظ ہے، اگر فوجی دستے بھیجے ہیں تو شکا کو بھیجے۔ نکاراگوا بھیجے کی کیا ضرورت ہے؟“

گوکہ تھا سن نے اپنی سیاسی ساکھ بچانے کے لئے الیکون کو شہر بدر کیا تھا لیکن الیکون نے واپس آ کر اس کی حمایت کی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو تھا سن اور اس کے گروپ کے لوگوں کی انتظامی مہم کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کی ہدایت کی۔

تھا سن کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا۔ وہ گویا مخالفین پر چھاپا ہوا تھا۔ اس کی انتظامی مہم نے گویا اس کے حریفوں کو خوف زدہ کر رکھا تھا لیکن عجیب بات یہ رہی کہ ان تمام باتوں کے باوجود تھا سن پرائمری مرحلے میں ہار گیا۔

ان نتائج نے خود تھا سن کو حیران کر دیا اور جب حیرانی کا مرحلہ گزر گیا تو وہ دل شکست اور غمزدہ سا ہو کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ شہر کا نظام اس نے گویا اپنے ماتحتوں پر چھوڑ دیا۔ پولیس چیف ہوز کی جگہ اس نے رسل کو چیف بنادیا جو پہلے ڈپٹی چیف ہوا کرتا تھا۔ وہ اچھا اور دیانتدار پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منہ پھٹ انسان بھی تھا۔ گلی لپٹی رکھے بغیر بات کر دیتا تھا۔

جب وہ ڈپٹی چیف تھا تو ایک بار کسی نے اس سے کہا کہ وہ شہر میں جوئے کے اڈے بند کرانے کے لئے کیوں کچھ نہیں کرتا؟ اس نے جواب دیا۔ ”تھا سن نے اس مشور پر انکیشن جیتا تھا کہ وہ شکا کو ایسا شہر بنائے گا، جہاں لوگ زیادہ سے زیادہ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ کوئی انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خواہ مخواہ تنگ نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے لوگوں نے اس کے مشور کو پسند کیا ہوگا تبھی اسے ووٹ دے کر میسر منتخب کیا ہوگا۔ اب لوگوں کو ذرا آزادی کے مزے لینے دو، جہاں لوگوں کو ہر بات کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے اور قانون کے ہاتھ باندھ دیئے جاتے ہیں، وہاں تو یہی ہوتا ہے۔ اب پریشانی کس بات کی ہے؟“

پرائمری میں تھا سن کی شکست ملک بھر میں بلکہ یورپ تک میں ایک اہم واقعہ سمجھی گئی۔ سیاسی مبصرین نے خیال ظاہر کیا کہ شاید اب شکا کو کی اخلاقی حالت بہتر ہونے کا آغاز ہو گیا ہے۔

تھا سن کی شکست کے بعد الیکون کی طرف سے بھی لوگوں کی توجہ ہٹ گئی۔ جولوگ اس کے بارے میں غم و غصے کی سی کیفیت کا شکار رہتے تھے، وہ بھی گویا سرسوت اسے بھول گئے لیکن الیکون اس فضا سے کوئی فائدہ اٹھانے کے بجائے میامی کی طرف واپس بھاگ گیا۔ اس کے مکان کی مرمت، اس میں ترمیم و اضافے اور نئے سرے سے اس کی تزئین و آرائش ہو رہی تھی۔ الیکون اس کام میں ذاتی طور پر بہت دلچسپی لے رہا تھا اور سب کچھ اپنی نگرانی میں کرنا چاہ رہا تھا۔ میسر کام تو ہو چکے تھے لیکن اب بھی بہت کچھ باقی تھا۔ الیکون کو اکثر کوئی نہ کوئی نیا خیال آتا رہتا تھا اور وہ اس پر عمل کرانے کی کوشش کرتا تھا۔

شبیوں آدمی وہاں کام پر لگے ہوئے تھے۔ الیکون نے اپنی اسپینڈ بوٹ کے لئے عیابوٹ ہاؤس، تین نئے گیمبرج، ماربل کی ٹائلز والی گزرگاہیں، فوارے اور نہ جانے کیا کچھ بنوایا تھا، وہ اپنے کاموں کے لئے باہر ترین کاری گر تلاش کراتا تھا اور ہر چیز بہترین بنوانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس دوران اس کی روایتی فراخ دلی اور اوزاشات کے مظاہرے بھی جاری تھے۔

ایک بار اس کے ہاں کام کرنے والے کچھ کاری گر بونی حصے میں کچھ ٹائلیں لگانے کا کام کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے فنن کیریزر باہر دیوار کے ساتھ فٹ پاتھ پر رکھ دیئے تھے۔ جب انہوں نے دوپہر کے کھانے کے لئے دفتر کرنے کا ارادہ کیا اور فنن کیریزر لینے باہر گئے تو وہ غائب تھے۔ کوئی چور اچکا سب مزدوروں کے فنن اٹھا کر لے گیا تھا۔ مزدوروں کے مندر لگ گئے، وہ اپنے دوپہر کے کھانے سے محروم ہو گئے تھے۔

الیکون اندر ہی موجود تھا۔ اسے اس بات کا پتہ چلا تو اس نے کچھ دیر بعد مزدوروں کو اندر بلایا۔ مزدوروں نے دیکھا کہ لمبی چوڑی شاندار ڈاننگ ٹیبل پر نہایت پر تکلف کھانے وافر مقدار میں سجے ہوئے ہیں، جو غالباً جلجت میں کسی اچھے ہوٹل سے منگوائے گئے تھے۔

الیکون نے مزدوروں کو بتایا کہ آج اس کی طرف سے ان کی دعوت ہے۔ وہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر ہی بھر کے کھائیں۔ پھر یہ دعوت روز ہی ہونے لگی۔ الیکون نے مزدوروں کو منع کر دیا کہ انہیں گھروں سے فنن کیریزر لانے کی ضرورت نہیں۔

بعد میں ایک مزدور نے لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے بتایا۔ ”مسٹر الیکون ہم مزدوروں سے ایسا سلوک کرتے تھے جیسے ہم مزدور نہیں بادشاہ ہوں، وہ ہمیں ایسے ایسے کھانے کھلاتے تھے، جو ہم نے خواب و خیال میں بھی نہیں کھائے تھے اور وہ کھانے بھی مسٹر الیکون ہمیں اپنی شاہانہ قسم کی ڈاننگ ٹیبل پر بٹھا کر کھلاتے تھے حالانکہ اس وقت ہم مزدوری کے کپڑوں میں ہوتے تھے، جو دھول مٹی اور سینٹ سے تنفر سے ہوتے تھے۔ ان کے اس سلوک کا نتیجہ تھا کہ ہم نے ان کے مکان میں اتنے دل سے کام کیا کہ زندگی میں کبھی نہیں کیا۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہم اپنا خون، پسینہ اس مکان کی بنیادوں میں رچا دیں۔ مسٹر الیکون ایک عجیب و غریب اور لا جواب آدمی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں اگر ان جیسے آدمیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو دنیا میں غربت بہت کم ہو جاتی اور غریبوں کو بھی اپنے کچھ پہنے پورے کرنے کا موقع ضرور ملتا۔“

(جاری ہے)



الکھون کے اس حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ وہ مکان میں جو تبدیلیاں اور اضافے کرنا چاہتا تھا، وہ اس کی توقعات سے بڑھ کر اچھے انداز میں ہو گئے۔ مکان تیار ہونے کے بعد جب اس نے لوگوں کو اپنے ہاں مدعو کرنا شروع کیا تو وہ بڑے فخر سے انہیں مکان کی سیر کراتا اور بتاتا۔ ”اس مکان میں سارے کام میں نے خود کرائے ہیں۔ یوں سمجھو کہ جب

**جرائم کے بادشاہ کی انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز سچی کہانی**  
ماہی کا ایک کڑوا جو کسی نہ کسی روپ میں جنم لیتا رہتا ہے

مورس بیکر نے ریش کم رکھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ اچھا منافع کماتا رہا تھا اور اس کے پاس کام بھی زیادہ آتا تھا۔ ایک روز مزدور لیڈر اور پلانٹ آپریٹروں نے اپنی حریف کمپنی کے مالک مورس بیکر سے ملنے پہنچا۔  
”اوہ.....! اچھا تو تم ہو روہن.....؟“ مورس نے خوش خلقی سے کہا۔  
”میں نے تمہارا بڑا تذکرہ سنا ہے۔“



ترجمہ: محمود محمودی

17: کلا

”ابھی تم میرا تذکرہ زیادہ نہیں سن رہے ہو، آئندہ زیادہ سنو گے۔“ روہن نے گہری سچیدگی سے کہا۔ ”میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں، جنہیں بھی اپنی کمپنی کے ڈرائی کلینک کے ریش بڑھانے ہوں گے۔ ماسٹر کلینرز کے برابر لانے ہوں گے۔“  
”ہر کمپنی کے مالک کو اپنی مصنوعات یا خدمات کے ریش مقرر کرنے کا حق حاصل ہے۔ مجھے یہ حق آئین نے دیا ہے اور میں اسے استعمال کر رہا ہوں۔“ مورس نے اب بھی خوش مزاجی سے جواب دیا۔ وہ بنیادی طور پر ایک خوش مزاج آدمی تھا۔  
”آئین کو بھول جاؤ اور مجھے یاد رکھو۔“ روہن نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سچیدگی سے کہا۔ ”بعض چیزیں آئین سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ جنہیں اپنی کمپنی کے ریش بڑھانے ہوں گے۔“  
یہ کہہ کر روہن چلا گیا۔  
تین دن بعد مورس بیکر کے پلانٹ میں بم کا دھماکا ہوا۔ کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا لیکن خاصی قیمتی مشینری تباہ ہوئی، یہ گویا ایک وارنٹک تھی۔

اس کے بعد بھی مورس بیکر نے اپنے دفتر کے ایک عہدے دار سے کہا۔ ”میں جن ریش پر کام کر رہا ہوں، میں اس پر قائم رہوں گا۔“  
اس کے اپنے ہی دفتر کے عہدے دار اور ملازم نے رازدارانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔ ”اگر تم ان ریش پر قائم رہے تو پھر شاید تم دنیا ہی میں نہ رہو۔“

اسی روز اس کی اپنی ہی کمپنی کی لیبر یونین کا جنرل سیکرٹری اس سے پانچ ہزار ڈالر چندہ مانگنے آگیا۔ اس نے چندہ دے دیا۔ اس کے باوجود اس کے دور کرنے کا چاک بڑتال کر دی۔ اس کی ٹیکسٹری خالی ہو گئی۔  
اس نے جب ورکرز کی بڑتال کی وجہ جاننا چاہی تو اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ کرولے سے ملے۔ کرولے، ماسٹر کلینرز کی لیبر یونین کا صدر تھا۔  
مورس بیکر کا رپٹی حریف کمپنی کی لیبر یونین کے صدر سے ملا۔  
کرولے نے اس کے ساتھ بات چیت کرنے سے پہلے پانچ ہزار ڈالر چندہ کا مطالبہ کر دیا۔ مورس پہلے اپنی یونین کے جنرل سیکرٹری کو چندہ دے چکا تھا۔ اس نے معذرت کی کہ وہ فوری طور پر مزید اتنی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔  
”تم کتنی رقم کا بندوبست کر سکتے ہو؟“ کرولے نے ایک عجیب شان سے نیازی سے پوچھا۔  
”میں سمجھتا ہوں کہ اس کے فی الحال تین ہزار ڈالر کا انتظام کر سکتا ہوں۔“  
مورس نے بادل ناخواستہ کہا۔  
”ٹھیک ہے..... باقی رقم قسطوں میں دے دیتا۔“ کرولے نے گویا اس پر احسان عظیم کرتے ہوئے کہا۔

مورس بیکر اس بار رقم دینے کے بجائے ایک شریف اور معزز شہری کی طرح شکایت لے کر اسٹیٹ انٹارنی کے دفتر چلا گیا۔ اسٹیٹ انٹارنی کے دفتر والوں نے اسے اتنے چکر لگوائے کہ وہ رو دیا تاہم وہ اپنے اس موقف پر قائم رہا کہ اس کی شکایت پر قانونی کارروائی ہونی چاہئے۔  
آخر کار اسٹیٹ انٹارنی نے گویا بادل ناخواستہ اسے اس کیس کی سماعت کے لئے بلایا۔ وہ جب اسٹیٹ انٹارنی کے دفتر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں ان لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا جن کے خلاف اس نے درخواست دی تھی۔  
”آپ نے ان لوگوں کو کیوں نہیں بلوایا جن کے بارے میں، میں نے شکایت کی تھی؟“ مورس نے نرمی سے دریافت کیا۔  
”گواہوں یا دوسرے فریق کو بلانا ہمارا کام نہیں ہے۔“ اسٹیٹ انٹارنی نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ”جنہیں جس سے شکایت ہے، اسے خود ہی ساتھ لے کر ہمارے پاس آؤ۔“  
”میں بھلا یہ کام کیسے کر سکتا ہوں؟“ مورس نے حیرت سے پوچھا۔  
”ہمیں کیا معلوم.....؟“ اسٹیٹ انٹارنی کا لہجہ بدستور درشت رہا۔  
پھر اس نے گویا مورس پر رحم کھاتے ہوئے ذرا نرمی سے کہا۔ ”اگر جنہیں ان لوگوں کو یہاں لانے میں مشکل درپیش ہے تو اس کے لئے تمہیں پولیس کی مدد حاصل کرنی چاہئے۔“

اس روز قانونی اور عدالتی نظام سے مورس بیکر کا دل بھر گیا۔ اس نے اسٹیٹ انٹارنی کو خدا حافظ کہا اور وہاں سے نکل آیا۔  
وہ دوسرے روز الکھون کے پاس پہنچا اور اس نے اسے ڈرائی کلینک کے بزنس میں اپنا پانڈر بننے کی دعوت دی۔ اس نے الکھون کو بتایا کہ وہ اپنے بزنس کو پھیلانا چاہتا ہے اور اس کا روبرار میں موجودہ ریش برقرار رکھتے ہوئے بھی اچھی خاصی دولت کمائی جاسکتی ہے، اس کے پاس اس لائن کا بے پناہ تجربہ تھا۔  
الکھون فوراً مان گیا۔ وہ تو پہلے ہی بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اسے جائز اور قانونی کاروبار میں قدم رکھنا چاہئے۔ اس کی مرویٹھے بٹھائے پوری ہو گئی تھی۔ اسے اس کے لئے کچھ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسے بزنس کرنے کے لئے کہیں جانا نہیں پڑا تھا۔ بزنس خود چل کر اس کے پاس آگیا۔  
الکھون کو مورس بیکر اچھا لگا۔ وہ ایک سیدھا، دیانتدار اور اصول پسند بزنس مین تھا۔ اسے الکھون جیسے آدمی کی ذات کی پختہ تہہ نہا سیر آتی تو اسے گویا کوئی گہری نہیں رہی۔

جب ان کی پانڈر شپ کامیابی سے چل پڑی تو وہ مسکراتے ہوئے اور گویا محفوظ ہوتے ہوئے لوگوں کو بتایا کرتا۔ ”بھتہ خور جمعی یونین باز دہشت گرد اور لوگوں کے کارخانوں میں بموں سے دھماکے کرنے والے اور آگ لگانے والے اب بھی موجود ہیں لیکن انہیں چونکہ پہلے دن سے ہی پتہ چل چکا ہے کہ مسٹر الکھون ان میرے پانڈر ہیں اس لئے اب وہ اس طرح مجھ سے دور رہتے ہیں جس طرح میں اور آپ سب کی نگاہی تار سے دور رہتے ہیں۔“  
پھر وہ ہلکا سا ایک قبچہ لگا تا اور معنی خیز لہجے میں کہتا۔ ”مسٹر الکھون کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔“  
ماسٹر کلینرز کی یونین کے عہدیدار جنہوں نے مورس بیکر کو کچھ عرصہ

پہلے چوسہ کی طرح دیوبند لیا تھا۔ اب ایک بار ذرا بہت کر کے الکھون کے دفتر پہنچے۔ انہوں نے بڑی عاجزی اور انکساری سے اس موضوع پر بات شروع کی کہ الکھون اور اس کا پانڈر مورس بیکر بھی اپنے ڈرائی کلینک کے ریش بڑھانے کا ماسٹر کلینرز کا بزنس کم نہ ہو۔  
الکھون نے ان کی بات سننے کے بعد کہا۔ ”میرے پاس بزنس چلانے والے بہت قابل لوگ موجود ہیں اور میں خود بھی بزنس میں کچھ ایسا نااہل نہیں ہوں کہ تم جیسے لوگ مجھے مشورے دینے آجائیں، اگر آئندہ میرے پاس آئے تو میں تمہیں کھڑکی سے باہر پھینکوا دوں گا۔“  
اس کے بعد کسی کو اس سے بزنس کے بارے میں بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، شاید ہی لئے مورس بیکر اپنے شناساؤں میں بیٹھ کر کہا کرتا تھا۔ ”اب مجھے اسٹیٹ انٹارنی کی ضرورت ہے اور نہ ہی پولیس کی..... مجھے اب اپنی یا کمپنی کی لیبر یونین کے لیڈروں کی منت خوشامد کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے تحفظ حاصل کرنے کا بہترین طریقہ اختیار کیا ہے۔“

یہ ایک مثال تو ایسی تھی کہ بزنس خود چل کر الکھون کے پاس آیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اس نے خود کو جائز اور قانونی کاروبار میں جھننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کئی افراد کے کاروبار پر مسلط بھی ہوا تاہم اس کی وجہ سے کسی کاروبار کے مالک کو نقصان نہیں، قانہ ہی ہوا۔  
یونین بازی میں بھی الکھون کی ٹانگ بھنسی ہوئی تھی۔ یونینوں میں اپنے آدمی ہونے کی وجہ سے الکھون کو اپنے کاروباروں میں بھی بہت قانہ ہوتا تھا۔ جن کاروباروں یا صنعتوں میں اس کی شرکت تھی، وہاں کبھی بڑتال نہیں ہوتی تھی اور دوسری جگہوں پر وہ بڑتال رکوانے کی طاقت رکھتا تھا۔

ایک بار ایک بڑی سڑک پر واقع 25 رہائش بلندیوں والا عمارتوں کے لفٹ آپریٹرز کی یونین نے بڑتال کا اعلان کر دیا۔ ان عمارتوں کے مالکان نے الکھون سے رجوع کیا اور ایک لاکھ ڈالر کا نذرانہ اس کی خدمت میں پیش کیا۔ الکھون نے بڑتال رکوا دی۔  
ناجائز دھندوں کے سلسلے میں بہر حال الکھون کی کچھ حدود اور اخلاقیات تھیں مثلاً اس نے منشیات کے دھندے میں بھی ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ شراب کا استعمال تو چونکہ مغربی معاشرے میں عام تھا اس لئے اسے تو وہ منشیات میں شریک نہیں کرتا تھا۔ الکھون تو کیا شراب کو تو عام شہری بھی منشیات میں شریک نہیں کرتے تھے۔

الکھون نے جیب کتروں سے بھی کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔ جیب تراشی کو وہ یک گھٹیا کام سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ کسی کو اخوا کر کے تادان وصول کرنا بھی اس کی نظر میں بہت ہی بری حرکت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جسے اخوا کیا جاتا ہے، اس کی فیملی بڑے عذاب سے گزرتی ہے اور یہ بد ظلم ہے کہ آپ خواہ مخواہ کسی کی فیملی کو سزا دیں۔  
ان دھندوں کو چھوڑ کر وہ کسی بھی منافع بخش دھندے کی طرف سے بے نیازی نہیں برتا تھا۔ تاہم ان میں بھی اس کی اخلاقیات برقرار رہتی تھیں۔ مثلاً وہ اپنے ساتھ ٹھیک طرح چلنے والوں کو کبھی ڈبل کر اس نہیں کرتا تھا۔  
مورس بیکر بہت بعد میں جب الکھون سے الگ بھی ہو گیا اور ماسٹر کلینرز والوں سے اس کی دشمنی بھی پاریہ ہو گئی، تب بھی وہ کہا کرتا تھا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں کاروباری معاملات میں الکھون جیسا دیانتدار آدمی نہیں دیکھا۔“

یہ تو شکا گوئی کا تہ نہیں تھیں۔ فلوریڈا میں بھی لوگ الکھون کی دیانتداری، وعدے کی پابندی، فراخ دلی اور دیگر اعلیٰ انسانی خصوصیات کے قائل رہے۔ مثلاً اس نے اپنا مکان خریدنے اور اس میں منتقل ہونے سے پہلے ایک مکان چھ ماہ کے لئے کرائے پر لیا تھا۔ وہ مکان اس نے ایک پارٹنر کی ذمہ داری کے تحت لیا تھا اور کرائے کے نام سے اس کا نام کچھ اس طرح درج ہوا تھا کہ کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ یہ ”مشہور زمانہ“ شخصیت الکھون ہے۔  
چنانچہ مالک مکان کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا کرایہ دار کون ہے وہ ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ ایک طویل تفریحی سفر پر نکلا ہوا تھا۔ راستے میں ایک بار انہوں نے بحری جہاز کے ریڈیو پر خبر سنی کہ ان کے مکان میں کرائے دار کے طور پر آنے والے کا نام الکھون ہے، وہی الکھون جس کا نام سن کر لوگ خوف زدہ ہو جاتے تھے۔

وہ لوگ جب واپس آئے۔ اس وقت تک کرائے نامے کی مدت ختم ہو چکی تھی لیکن انہیں امید نہیں تھی کہ مکان خالی ہوا ہوگا بلکہ انہوں نے تو اپنے طور پر مکان کی طرف سے صبر کر لیا تھا۔ انہیں ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ اب وہ بھی دوبارہ اس مکان کا قبضہ حاصل کر سکیں گے۔  
واپسی پر وہ یہ سن کر حیران رہ گئے کہ مکان تو کرائے نامے کی مدت سے ایک ہفتے پہلے ہی خالی ہو چکا تھا۔ تب انہوں نے سوچا کہ اس کی حالت یقیناً بگاڑ ہو چکی ہوگی۔ انہوں نے مکان فریڈ حالت میں دیا تھا۔ اس میں نہ صرف فرنیچر، بلکہ ضرورت کی دوسری چیزیں، حتیٰ کہ کراکری تک موجود تھی۔  
انہیں یقین تھا کہ اب وہ سب چیزیں تباہ ہو چکی ہوں گی۔ گھر میں ان کے کتروے بکھرے پڑے ہوں گے۔ ہر طرف گندگی ہوگی اور کاٹھ کباڑ بکھرا پڑا ہوگا۔ دیواروں پر گولیوں کے نشانات ہوں گے۔ ممکن ہے کچھ جگہوں پر خون کے دھبے بھی ہوں۔ کتروں کے تشے ٹوٹ چکے ہوں گے۔ مکان اس میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا ہوگا جہاں سے فوجیں رخصت ہو چکی ہوں۔ وہ لوگ مکان میں چاندی کے کچھ برتن بھی چھوڑ کر گئے تھے، ان کے ملنے کی تو اب انہیں ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔

جب وہ پارٹنر کی ذمہ داری سے جانی لے کر مکان پر پہنچے تو حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ مکان پہلے سے بہتر حالت میں تھا۔ اندر بھی یہی صورتحال تھی۔ کسی چیز پر ایک بیکر ایک خراش تک نہیں تھی، گھر کی حالت اب زیادہ اچھی نظر آ رہی تھی، سامان میں کچھ اضافہ ہو چکا تھا۔ ان کا کرایہ دار جو ان کے خیال میں دنیا کے خطرناک ترین بد معاشوں کا سردار تھا، اپنی بہت سی چیزیں وہاں چھوڑ کر چاچا تھا، جو مالک مکان کی چیزوں سے زیادہ اچھی تھیں، ان میں قیمتی کراکری بھی شامل تھی۔  
الکھون کے ہاں چونکہ ضیافتیں وغیرہ چلتی رہتی تھیں اس لئے اسے زیادہ سامان کی ضرورت پڑتی تھی۔ چنانچہ اس نے بہت سی اضافی چیزیں خریدی تھیں، جو وہ ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ مکان میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ یوں مالک مکان کا سامان تقریباً دوگنا ہو گیا تھا۔ اسے اور اس کی بیوی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

صرف ایک چیز انہیں ذرا شک تھی، جو اس صورت حال میں عجیب لگ رہی تھی۔ وہ یہ کہ ان کا کرائے دار صرف ٹیلیفون کا ایک بل غیر ادا شدہ چھوڑ گیا تھا جو تقریباً چار سو ڈالر کا تھا۔  
انہیں اس سلسلے میں زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں ملا۔ جلد ہی الکھون کی بیوی سے آن پہنچی۔ اس نے معذرت کی کہ وہ فون کا بل ادا کرنا بھول گئی تھی۔ بل کی ادائیگی کے لئے اس نے پانچ سو ڈالر کا نوٹ پیش کیا۔

مالک مکان کی بیوی ادھر ادھر ہاتھ مارنے کے بعد شرمندگی سے بولی۔ ”ہمارے پاس بھتایا دینے کے لئے سو ڈالر نہیں ہیں۔“

یہ دونوں ڈرائی کلینک کی کمپنیاں تھیں اور ان کے پاس یکساں معیار کے بڑے بڑے پلانٹ تھے لیکن ماسٹر کلینرز کے ڈرائی کلینک کے ریش زیادہ تھے کیونکہ ان کے ہاں روہن نامی ایک پلانٹ آپریٹر موجود تھا جو مزدور لیڈر تھا اور درحقیقت بد معاشوں کا نمائندہ تھا۔



”چھوڑیں سو ڈالرو کو.....“ اسے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولی۔ ”ہو سکتا ہے ہم سے کوئی چھوٹی موٹی ٹوٹ پھوٹ ہوگئی ہو، اس میں حساب برابر کر لیجئے گا۔“

☆.....☆.....☆

نیویارک میں موجود فریک ٹیل، الیکپن کا ابتدائی زمانے کا لباس تھا

چلائے گا لیکن ٹیل نے اسے بھی ساتھ نہ لیا اور خود ہی لنگن لے کر تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔

چند لمحوں بعد اس نے محسوس کیا کہ سیاہ رنگ کی ایک کار اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس نے گھر جاتے جاتے اپنا راستہ بدل لیا اور تصدیق کرنے کی کوشش کی کہ کیا واقعی اس کا تعاقب ہو رہا تھا مگر اسی دوران سیاہ کار اس کی گاڑی کے قریب آگئی اور پھر فائرنگ کی خوفناک آوازیں



آنے لگیں۔

بیک وقت پتھول، شاٹ گن اور مشین گن استعمال کی جا رہی تھی۔ ٹیل کی کار بری طرح لہرائی اور پھر اونٹنے فٹ ہاتھ سے جا کرائی۔ اس وقت تک ٹیل کے سر میں بھی گولیاں لگ چکی تھیں۔ اس کے باوجود سیاہ کار سے ایک آدی اتر کر آڑی ترچھی حالت میں کھڑی ہوئی لنگن کے قریب آیا اور اس نے پتھول سے مزید فائر کر کے ٹیل کا بچا بچھا بچھا بھی باہر نکال دیا۔

قاتل چند لمحوں میں وہاں سے فرار ہو گئے۔ وہ اس مقام کے قریب پہنچے جہاں سے اسٹیشن آئی لینڈ کے لئے فیری چلتی تھی، وہاں انہوں نے اپنی گاڑی ایک گلی میں چھوڑ دی۔ قریب ہی ایک دوسری کار ان کی خطرناک تھی۔ وہ اس میں بیٹھے اور نوجوڑی جانے والے ایک پل کی طرف روانہ ہو گئے جو نیا تعمیر ہوا تھا۔

سیاہ کار بعد میں پولیس کو لاوارث حالت میں کھڑی مل گئی۔ اس میں وہ تینوں ہتھیار بھی موجود تھے جو ٹیل کو قتل کرنے کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ پولیس نے ان ہتھیاروں کے ذریعے باریک بینی سے تفتیش کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ الیکپن کی ذات کی طرف کچھ اشارے ملے لیکن محض اشاروں سے کیا ہوتا تھا؟

ٹیل کے دوستوں نے اس کی تکفین اور تدفین کے نہایت شاندار انتظامات کئے۔ جنازے کے جلوس کے آگے جس بڑی سی سیاہ میت گاڑی میں اس کا تابوت جا رہا تھا۔ اس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ ”ہم تمہارا انتقام لیں گے دوست۔“

میامی کے انٹارنی نے پوچھ گچھ کے لئے الیکپن کو بلایا۔ اس نے سادگی سے کہا کہ وہ بھلا ٹیل کے قتل کے سلسلے میں کیا بنا سکتا ہے؟ وہ تو ٹیل کے قتل کے وقت فلورڈا میں تھا۔ اس کے علاوہ وہ اب ڈرامائی کلیجنگ کا بزنس کر رہا تھا اور مورس بیکر جیسا شریف آدی اس کا پانڈر تھا۔ یہ پوچھ گچھ محض ایک رسمی کارروائی کا ردوائی ثابت ہوئی۔

جولائی کے آخر میں الیکپن شیکاگو واپس آیا تو میٹرو پول ہوٹل میں واقع اس کے ہیڈ کوارٹر پر چھاپے پڑ گیا۔ اس کے آدھیوں کے پاس جو اسلحہ تھا، اس کے بارے میں تحقیقات شروع ہو گئی تھی کہ کن کن ہتھیاروں کے لٹائس موجود تھے اور ان میں سے کتنے اصلی تھے۔ اگر اصلی تھے تو کس بنیاد پر حاصل کئے گئے تھے۔

اس ساری تحقیقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، البتہ یہ ضرور ہوا کہ الیکپن کو اپنا ہیڈ کوارٹر تبدیل کرنا پڑ گیا۔ اب اس نے ٹیکسٹن ہوٹل میں پناہ لی۔ یہ بھی ایک نہایت معیاری ہوٹل تھا اور ایک بار امریکی صدر نے بھی اس میں قیام کیا تھا لیکن اب یہ زوال پڑ رہا تھا۔

اس کے منہ پر کچھ بھی نہیں چل سکا کہ اس کے ہوٹل میں الیکپن مستقل کرائے دار کے طور پر آچکا تھا۔ اسے اخبار نویسوں نے اس بات سے آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گیا اور سبے جتنی سے تقریباً چلا اٹھا۔

”الیکپن.....؟ میرے ہوٹل میں.....؟“

وہ اپنی جگہ حیران ہوتا رہا اور اس کے ہوٹل میں الیکپن کے کمروں کی تعداد بدستوری چلی گئی۔ حتیٰ کہ تیسرا اور چوتھا پورا فلور اس کے استعمال میں آنے لگا۔ ان کے علاوہ دوسرے فلورز پر بھی اس کے کمرے تھے۔ مجموعی طور پر یہاں بھی اس کے پاس پچاس کمرے ہو گئے۔ ان میں سے کئی میں الیکپن کی پیندہ بند عورتیں بھی قیام پزیر ہو چکی تھیں۔

انہی میں ایک نوجیز یونانی لڑکی بھی تھی۔ وہ دیو مالائی کہانیوں کی کوئی حسینہ معلوم ہوتی تھی۔ اپنے غیر معمولی حسن کی بدولت وہ الیکپن کی منہور نظر تھی۔

ایک بار اس نے ایک تکلیف کی شکایت کی۔ الیکپن نے اسے اپنے خاص ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ اس نے کئی ٹیسٹ وغیرہ کرانے کے بعد انکشاف کیا کہ لڑکی کو ایک خوفناک بیماری لاحق تھی۔

لڑکی کا پریشان ہونا تو اپنی جگہ تھا لیکن الیکپن کے بھی پیروں تلے زمین لنگھ گئی۔ وہ بھی دوڑ دوڑا اپنے ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ اس نے تصدیق کر دی کہ یہ بیماری الیکپن کو بھی لگ چکی تھی۔

اس کا خاصا علاج ہوا اور ٹیسٹوں وغیرہ سے پتہ چلا کہ وہ صحت یاب ہو گیا تھا۔

اس کے نئے ہیڈ کوارٹر میں ابتداء میں جو خاص خاص لوگ اس سے ملنے آئے، ان میں لوئیش بھی شامل تھا۔ یہ شخص بنیادی طور پر وکیل تھا لیکن سخت محنت کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا اب ایک بڑے سرکاری عہدے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ ”شکاگو کرائم لیکشن“ کا سربراہ تھا۔

وہ سفید بالوں والا ایک مستعد اور دراز قد شخص تھا۔ اس کی عمر 76 سال تھی مگر وہ بہت سے نوجوانوں سے زیادہ فعال تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ ”امریکی لوگ ٹینکس نہیں ہیں۔ اطالویوں اور دوسرے تارکین وطن نے امریکا میں گروہ بازی کو رواج دیا ہے اور یہودیوں نے اپنے سرمائے سے ان کی مدد کی ہے۔“

اس کا یہ بھی کہنا تھا۔ ”یہودی وہ لوگ ہیں جو بد معاشی میں بھی ”سرمایہ کاری“ کرتے ہیں۔“

وہ مسوینی کی اس معاملے میں زبردست حمایت کرتا تھا کہ وہ اپنے ملک اٹلی میں مافیائے ختی سے منٹ رہا تھا۔

لوئیش کو یہ بھی معلوم تھا کہ الیکپن کا پیندہ یہ امیدوار تھا حسن پرائمری مرحلے میں ہار چکا تھا اور اب یہ امکان کم ہی تھا کہ الیکپن کسی بھی امیدوار کی حمایت یا مخالفت کرتا، اس کے باوجود خطرہ بہر حال موجود تھا کہ مافیائے دوسرے بد معاش انتخابات میں قتل اندازی کریں۔ لوئیش انتخابات کو اسی خطرے سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میسر کی حیثیت سے تھا حسن جب اپنے آخری

دن گزار رہا تھا تو اس نے الیکپن کی طرف سے آنکھیں پھیر لی تھیں اور اسے شہر بدر کر دیا تھا، اس کے باوجود الیکپن نے صدارتی انتخابات کے پرائمری مرحلے میں قیام حسن کی مدد کی تھی کیونکہ وہ اس وقت بھی اگر فتوہ بہت خوش گمان رہ سکتا تھا تو تھا حسن ہی کی طرف سے رہ سکتا تھا۔

بہر حال لوئیش مستقبل کے اندیشوں اور خطرات کا سدباب کرنے کے لئے الیکپن کے پاس جا پہنچا۔ وہ اسے ٹھوڑی سی ”اصلاح“ کی دعوت بھی دینا چاہتا تھا۔ اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی دولت، طاقت اور ذہانت کو ملک کی بہتری کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے ایک ”اچھا امریکی“ کیوں نہیں بن جاتا۔

اپنے دل میں یہ ”عظیم مقصد“ لے کر وہ الیکپن سے ملاقات کا وقت طے کر کے اس کے ہیڈ کوارٹر جا پہنچا۔ اس نے بعد میں اس ملاقات کی منظر کشی کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا۔ ”جب میں وہاں پہنچا تو پچیس تیس آدمی ہوٹل کے سامنے اور آس پاس پھر دے رہے تھے، وہ یقیناً خالص امریکی نہیں تھے۔ ان سب کی رنگت میں ایک ہلکا سولائون تھا اور ان کے چہرے پتھر کے ہوئے سے دکھائی دے رہے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ انہیں انگریزی بولی بھی نہیں آتی تھی۔ وہ سب مسلح تھے اور جب میں الیکپن کے کمرے میں پہنچا تو وہاں بھی کم از کم چھ مسلح آدمی موجود تھے اور ان کی انگلیاں بار بار بے جتنی سے اپنے ہتھکڑوں کو چھونے لگتی تھیں۔

میں اپنے آپ کو بے پروا طائر کرنے کے لئے الیکپن کے کمرے میں دیوار پر لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا، وہاں دوسری صدیوں کی تصاویر کے ساتھ میسر تھا حسن کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔“

ادھر ادھر کی باتوں اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد لوئیش نے اصل موضوع پر بات شروع کی اور پوچھا۔ ”محرم بھی تمہارے دشمن ہیں اور قانون بھی..... کیا تمہیں امید ہے کہ دونوں سے محاذ آرائی برقرار رکھتے ہوئے تم زندگی گزار لو گے؟“

”قانون کے بارے میں تو مجھے کچھ زیادہ خطرہ نہیں۔“ الیکپن نے مسکراتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ ”قانون تو شاید میرا بھی کچھ نہ بگاڑ سکے البتہ اگر میں اپنے دشمنوں کی طرف سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہوا تو وہ ضرور مجھے ڈھیر کر دیں گے لیکن میں ان کی طرف سے غافل ہوں گا ہی نہیں۔“

مزید چند منٹ اسی طرح کی باتیں ہلکے جھلکے انداز میں ہوئی رہیں پھر لوئیش بولا۔ ”میں دراصل ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے..... یا یوں سمجھو کہ اس ملک کو اور یہاں کے قانون کو ایک معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے، میں چاہتا ہوں تم صدارتی انتخابات میں اپنے اطالوی غنڈوں کو انتخابات سے دور رکھو۔“

لوئیش کے لیے میں التجا نہیں تھی۔ گو کہ بظاہر وہ حکومت کا ایک مضبوط نمائندہ بن کر حتی الامکان جھکمانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ الیکپن کے لئے اس التجا آمیز ہدایت پر عمل کرنا خلعی مشکل نہیں تھا۔ درحقیقت وہ تو ایسا ہی سوچے بچا تھا۔

وہ مصلحت کے تحت جس امیدوار کی حمایت کر رہا تھا، وہ پرائمری میں ہی ہار چکا تھا۔ اب الیکپن کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کوئی ڈیموکریٹ کا میاب ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن یہ بات اس کے لئے طمانیت کا باعث تھی کہ حکومت کا ایک طاقت ور نمائندہ اس کے پاس اس قسم کی درخواست لے کر آیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ حکومتی سطح پر اس کی طاقت کو محسوس اور تسلیم کر لیا گیا تھا، یہ ایک الگ بحث تھی کہ یہ طاقت حقیقی تھی یا شبہ۔

”ٹھیک ہے۔“ الیکپن نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”میرے آدی ایکشن میں مداخلت نہیں کریں گے۔ میں ان دوسرے گروہوں کو بھی کوئی حرکت کرنے سے روک دوں گا جو میرا کہنا مانتے ہیں لیکن آئرش گروہوں کو روکنے کے لئے تمہیں پولیس کی مدد لینی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“ لوئیش طمانیت سے بولا۔ ”آئرش غنڈے ہمارے لئے مسئلہ نہیں ہیں، انہیں ہم پولیس کے ذریعے قابو میں کر لیں گے۔“

اس نے واپس آکر سیٹھ کینی کو کھلی طور پر اس ملاقات کی رپورٹ دی۔ ایکشن سے پہلے بڑی تعداد میں خصوصی بکتر بند گاڑیاں تیار کی گئیں اور ان آئرش بد معاشوں کی پکڑ پھنک لی گئی جن کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ ایکشن میں گزیر کر رہیں گے۔ یوں بہر حال ایکشن پر امن فضا میں ہو گئے۔ کوئی گزیر پڑا، جھگڑا خونریزی نہیں ہوئی۔

لوئیش نے اطمینان کی گہری سانس لے کر فخر سے اعلان کیا۔ ”تمیں برس میں یہ پہلے صاف ختم ہوئے اور شفاف انتخابات ہیں جن میں کوئی گزیر پڑا، کوئی بے ایمانی نہیں ہوئی۔ کسی امیدوار نے دھاندلی کی شکایت نہیں کی۔“

ان انتخابات سے پہلے بروکلین کے بلیک پنڈ گینگ والوں نے ٹیل کی موت کا انتقام لینے کی اپنی ہی کوشش کی جس کا عہد انہوں نے ٹیل کے جنازے پر کیا تھا۔ اس معاملے میں انہیں جوزف ایلیو کی مدد بھی حاصل تھی جو اپنی طاقت کو نئے سرے سے منظم کر چکا تھا اور جسے الیکپن سے خدا واسطے کا بھرتا تھا۔

الیکپن واپس میامی جا چکا تھا۔ الیکپن خواہ میامی میں ہوتا یا شیکاگو میں..... ان لوگوں کے لئے اس کا کچھ بگاڑنا نہایت مشکل تھا۔ وہ گو یا اب ایک آہنی حصار میں رہتا تھا۔ یہ لوگ اپنی تمام تر طاقت کے باوجود اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ الیکپن نے یہ بھی جی کہا تھا کہ وہ کبھی غافل نہیں ہوتا تھا۔

چنانچہ بروکلین والوں نے فیصلہ کیا کہ نوٹی لمبارڈوی کو نشانہ بنا کر اپنے انتقام کی آگ کچھ ٹھنڈی کی جائے۔ لمبارڈو، الیکپن کے تعاون سے مافیا کا سربراہ تھا لیکن اس اہم ”عہدے“ پر ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ زیادہ حاشیائی انتظامات کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی کسی سے براہ راست اس قسم کی دشمنی نہیں ہے کہ کوئی اسے قتل کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے شاید یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کسی اور کے حصے کے انتقام کا نشانہ بھی بن سکتا ہے۔

وہ نو عمری میں سکسی سے امریکا آیا تھا۔ اس وقت اس کی جیب میں صرف بارہ ڈالر تھے۔ امریکا آنے کے لئے دیے بھی ان دنوں یہ ایک لازمی شرط تھی کہ تارک وطن کی جیب میں کم از کم بارہ ڈالر ضرور ہوں۔ اب لمبارڈو 36 سال کا تھا اور کروڑ پتی تھا۔

اس روز وہ ”یونین“ یعنی مافیا کے ہیڈ کوارٹر میں معمول کے کام نہا کر ساڑھے چار بجے کے قریب باہر آیا۔ وہ 7 ستمبر جمعہ کا دن تھا، اس کے دو باؤں گارڈز فیرڈاوارڈ اور لاڈا اس کے ساتھ تھے۔

وہ تینوں سڑک کے موڑ تک پہنچے اور وہاں سے سڑک عبور کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ان کی توجہ ایک چڑ کی طرف چلی گئی۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی اسی طرف متوجہ تھے اور اشتیاق سے وہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دراصل ایک بڑے اسٹور نے اپنے ہاں سیل شروع کرنے کے لئے گاؤں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے کچھ کچھ چھوٹا سا جہاز اپنے دروازے کے سامنے کھڑا کرنے کے لئے منگوا لیا تھا۔ مزدور اس وقت اسے صبح جگہ پر سٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لمبارڈو اور اس کے دونوں باؤں گارڈز کی توجہ بھی اس طرف مبذول ہو گئی اور وہ چند لمحوں کے لئے اپنے گرد و پیش سے غافل ہو گئے۔ وہ ان دو آدمیوں کو نہ دیکھ سکے جو ذرا مشکوک سے انداز میں ایک مشہور ریسٹورنٹ کے سامنے برآمدے میں ٹھل رہے تھے۔

اچانک ان میں سے ایک کی نظر لمبارڈو پر پڑی اور وہ اپنے ساتھی کو خبردار کرنے کے لئے گویا بے اختیار چلا اٹھا۔ ”وہ آگیا.....!“

پھر ان دونوں نے پتھول نکالے اور تیزی سے لمبارڈو اور اس کے باؤں گارڈز کی طرف لپکے۔

(جاری ہے)

مگر بعد میں دوست سا بھی اور شریک کار بن گیا تھا۔ دونوں بوقیبت ضرورت ایک دوسرے کے کام بھی آتے تھے۔ ٹیل اپنی جگہ ایک گروہ کا سرغنہ اور خطرناک قاتل تھا۔

الیکپن نے جب امریکا میں موجود اطالویوں کی اصل مافیائی فیملی ”یونین“ کا سربراہ لمبارڈو کو بنوایا تب سے ٹیل کے دل میں الیکپن کے بارے میں کچھ میل آگیا تھا کیونکہ وہ لمبارڈو کو پسند نہیں کرتا تھا اور یہ دیکھ دیکھ کر بھی وہ کڑھتا تھا کہ مافیا کا سربراہ ہونے کی وجہ سے لمبارڈو کو کتنے فوائد حاصل تھے اور اس کی دولت میں کتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

اس کے خیال میں الیکپن نے اسے مافیا کا سربراہ ہونے کے سلسلے میں اس کی پشت پناہی کر کے کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔

ٹیل نیویارک میں گویا الیکپن کا نمائندہ تھا۔ الیکپن کی غیر قانونی شراب نیویارک بھی آتی تھی۔ اس کے ٹرک لائٹ آئی لینڈ پہنچتے تھے اس کے بعد یہ ٹیل کی ڈسے داری تھی کہ وہ اپنے گروہ کی مدد سے پورے نیویارک میں ان کی محفوظ نقل و حرکت کو ممکن بنائے۔ نیویارک سے ہونے والی آمدنی میں ٹیل شریک تھا۔

یہ انتظامات کافی عرصے سے بحسن و خوبی چل رہے تھے لیکن پھر دوسرے دوسرے یہ ہونے لگا کہ الیکپن کے ٹرک راستے میں لوٹ لے جاتے۔ کافی دنوں تک الیکپن نے صبر کیا لیکن پھر نقصان نمایاں حد تک بڑھنے لگا، حتیٰ کہ الیکپن کو محسوس ہونے لگا کہ اسے شراب نیویارک بھیجنے اور اتنا دوسرے محمول لینے میں کوئی فائدہ ہی نہیں۔ تشویش کی بات یہ تھی کہ ٹرک بروکلین کے علاقے میں زیادہ انخواہ ہوتے تھے اور لوٹ لے جاتے تھے جہاں خود ٹیل کے اپنے گروہ کی سکرانی تھی جسے بلیک پنڈ گینگ میں شمار کیا جاتا تھا۔

الیکپن کو شبہ ہونے لگا کہ کہیں ٹیل اسے ذیل کر اس تو نہیں کر رہا؟ نیویارک میں اس کا ایک نہایت سمجھ دار اور قابل اعتماد ساتھی ڈی اماٹو موجود تھا۔ اس نے ڈی اماٹو سے اپنے شبہات کا تذکرہ کیا اور اسے اس معاملے کی تحقیقات کی ہدایت کی۔

ڈی اماٹو نے خاموشی اور رازداری سے اس معاملے کی تحقیقات کی اور آخر الیکپن کو رپورٹ دی کہ اس کا شبہ درست تھا۔ ٹیل خود ٹرک ہائی جیک کر رہا تھا۔ ڈی اماٹو یہ رپورٹ ایک پبلک فون کے ذریعے دے رہا تھا جو سڑک کے کنارے لگا ہوا تھا۔ جب وہ فون بند کر چکا تو اسے شبہ ہوا کہ کوئی اس کی باتیں سن رہا تھا..... شاید ٹیل کا کوئی آدی.....!

وہ لوگ اپنی دانست میں احتیاطاً کوئی اہم اور راز کی بات کرتے وقت پبلک فون استعمال کرتے تھے۔ ڈی اماٹو کو نہیں معلوم تھا کہ یہ احتیاط لگائی بھی پڑ سکتی ہے۔ اسے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوا، اس نے فیصلہ کیا کہ اسے گھات لگا کر ٹیل کو قتل کر دینا چاہیے ورنہ ٹیل اسے نہیں چھوڑے گا۔

ایک رات وہ ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ گیا جہاں سے اسے ٹیل کے گزرنے کی امید تھی۔ ٹیل تو وہاں سے گزرا لیکن ڈی اماٹو اسے ہلاک کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے سات فائر کے گرنے میں کی ابھی زندگی باقی تھی۔ ایک بھی گولی اسے نہ لگ سکی۔ ڈی اماٹو خود جہاں بچا کر بھاگتا پڑا۔

اس کے چھ دن بعد ڈی اماٹو ایک رات کسی کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ ایک گاڑی اس کے قریب سے گزری اور تین فائر ہوئے۔ فائر پتھول سے کئے گئے تھے۔ ڈی اماٹو کے دو گولیاں لگیں۔ ایک گردن میں اور دوسری سینے میں پڑست ہو گئی اور وہ وہیں گر کر مر گیا۔

اس کے بعد بھی الیکپن کے شراب کے ٹرک لوٹے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ الیکپن کا قصہ بدتر تریج ہو رہا تھا۔ ایک تو اسے اس بات کا دکھ تھا کہ اس کا لڑکپن کا ساتھی ٹیل اسے دھوکا دے رہا تھا، اس سے غداری کر رہا تھا۔ دوسرے اسے ڈی اماٹو کی موت کا بھی صدمہ تھا، وہ اس کا پرانا آدی تھا اور ضرورت پڑنے پر اس کے لئے جاسوس کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس کے قتل پر الیکپن کو دکھ ہونے کے ساتھ ساتھ شدید غصہ بھی آیا تھا۔

تاہم ان دنوں الیکپن بہت مصروف تھا اور کچھ پریشانیوں میں بھی پھنسا ہوا تھا اس لئے فوری طور پر اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکا تھا لیکن یہ چیز اس کے ذہن میں بہر حال اٹھی ہوئی تھی۔ وہ جب فلورڈا منتقل ہوا تو اس کے پاس خوب وقت تھا، اب اس نے اس معاملے کی طرف توجہ دی۔

جون کے اواخر میں اس نے ایک ایک کر کے اپنے خاص اور قریبی آدمیوں کو صلاح مشورے کے لئے فلورڈا بلایا۔ اسے اس لئے نہیں بلایا کہ اگر کسی کی توجہ ان لوگوں کی طرف ہوتو اسے کسی گزیر کا احساس نہ ہو۔ ان میں اس کا بزنس منیجر گوزک، پیشہ ور قاتل اسکیل اور پٹیل بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ الیکپن کا خاص الخاص قاتل میک گرین بھی آیا۔

دو دن بعد یہ لوگ شیکاگو جانے والی ٹرین میں سوار ہوئے لیکن تینوں قاتل راستے میں ٹاکس دل کے مقام پر اتر گئے۔ وہاں ان میں سے ایک نے فرضی نام سے ایک ایکسٹنڈ چنڈ گاڑی خریدی جس میں وہ تینوں سڑک کے راستے نیویارک کی طرف روانہ ہوئے۔

بروکلین پہنچ کر میک گرین اپنے دونوں ساتھیوں کی رہنمائی کرنے لگا کیونکہ وہ اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا اور پلا بڑھا تھا۔

کیم جولائی کو ٹیل اپنے گھر سے نکلا اور اپنی سواری رنگ کی لنگن میں بیٹھ کر اپنے کاموں کے لئے روانہ ہوا۔ اس کا ڈرائیور جس گاڑی چلا رہا تھا۔ جس کی حیثیت محض ڈرائیور نہیں تھی، وہ کسی حد تک ٹیل کا ساتھی بھی تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پیتا بھی تھا۔

چار بجے وہ دونوں ٹیل کے اپنے کینے ”سن رائز“ میں بیٹھ کر پینے پلانے کا شغل کر رہے تھے کہ اچانک ٹیل کے گھر سے فون آیا۔ اس کی دوسری بیوی لوی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ اپنی پہلی بیوی ماریا اور دو بیٹیوں کو چھوڑ چکا تھا۔

شاید اسے بیوی کے بارے میں کچھ زیادہ ہی تشویش کا خبر ملی تھی کیونکہ وہ بہت ہی تیزی سے روانہ ہو گیا۔ جیسے نہ کہا کہ گاڑی وہ



گارڈز بروقت حملہ آوروں کو نہیں دیکھ سکے۔ وہ دوسری طرف متوجہ تھے۔ قاتل ہونے اور سب سے پہلے گولیاں باڈی گارڈ فیروکی ریزھ کی ہڈی میں لگیں۔ وہ وہیں گرا اور کچھ دیر بعد مر گیا۔

دو گولیاں لہارڈو کے سر کے پچھلے حصے میں لگیں۔ وہ موقع پر ہی مر

بڑے پیمانے پر فیکس چوری پکڑ کے سرکاری تھانے کے لئے ہماری قوم کا حصول تھا۔ دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے کسی طرح الیکٹران کو قابو میں نہیں کر پارہے تھے تو اب یہ سوچا گیا تھا کہ اسے آمدنی کے ناجائز ذرائع اور فیکس چوری کے بھانے کھیرا جائے۔

تاہم اس موضوع پر بھی کم از کم کاؤٹنی کے سرکاری وکیل کی پوچھ گچھ میں تو الیکٹران کچنی پچھلی کی طرح پھسل کر نکل گیا۔ اس کے پاس بہترین



قسط: 18

ترجمہ: محمود احمد مودودی

## جرم کے بادشاہ کی انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز سچی کہانی

### ماضی کا ایک کردار جو کسی نہ کسی روپ میں جنم لیتا رہتا ہے

گیا۔ لارڈو کو کوئی گولی نہیں لگی لیکن اس کے ساتھ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ وہ قانون کو پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے دوڑا تو پولیس نے اسی کو کھٹوک کھٹوک کچھ کر پکڑ لیا اور قاتل اس دوران فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

لہارڈو کی تدفین بھی مافیائی روایات کے مطابق شاندار طریقے سے عمل میں آئی۔ الیکٹران نے بھی اس میں شرکت کی۔ اس کا شیوہ بڑھا ہوا تھا۔ کسی کے جنازے پر فم کے اظہار کا اس کا یہ مخصوص طریقہ تھا۔ اس نے قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی جو کن بھروزی تھی۔ تدفین کے بعد وہ میا میا واپس چلا گیا۔

لہارڈو کے بعد اس کے باڈی گارڈ لارڈو کا بھائی ”یونین“ یعنی مافیا کا سربراہ بنا۔ وہ فکس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسے بھی زیادہ عرصے ”مہمدے“ پر فائز رہنا نصیب نہیں ہوا۔ درحقیقت اسے ”یونین“ کا صدر بننے کے بعد زیادہ عرصے دنیا میں ہی رہنا نصیب نہیں ہوا۔

وہ اور اس کی بیوی ایلینا اس روز بازار سے واپس آئے تو انہیں دو آدمی دروازے پر کھڑے ملے۔ فکس اور ایلینا ایک تین منزل عمارت کے سب سے اوپر والے کٹشادہ اور آراستہ ویرانہ پارشمنٹ میں رہتے تھے، وہ بلڈنگ فکس کی اپنی ملکیت تھی۔

پارشمنٹ کے دروازے پر جو دو افراد منتظر انداز میں کھڑے تھے، انہیں ایلینا اس سے پہلے بھی کئی بار گھر میں آتے جاتے اور اپنے شوہر سے ملاقات کرتے دیکھ چکی تھی لیکن وہ ان کے نام نہیں جانتی تھی۔ وہ فکس کے ساتھ اندر آ گئے اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

ایلینا نے ان کے لئے کھانا لگایا اور خود کچن میں کام میں مصروف ہو گئی۔ آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ مہمان کچھ دیر بعد چلے گئے تھے لیکن اس کے پانچ منٹ بعد ہی دستک ہوئی اور شاید کچھ اور مہمان آ گئے کیونکہ اس نے اپنے شوہر کی جواز میں شیش، ان سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی کو گرجی سے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

ڈرائنگ روم کا ایک دروازہ چونکہ باہر کی طرف بھی تھا، اس لئے جب اس کا شوہر ڈرائنگ روم میں ہوتا تھا تو اس کے شوہر کے ملاقاتی باہر سے باہر آتے جاتے رہتے تھے اور ایلینا ان کی شکل بھی نہیں دیکھ پاتی تھی۔ اس کے شوہر کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ آواز دے کر منگوا لیتا تھا۔

ایلینا کچن میں اپنے کام میں مصروف رہی۔ ملازم اس وقت فرش پر پونچھا لگا رہی تھی۔ ایلینا ایک کھٹے تک ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں سن رہی تھی پھر ایک اسے قانون کے دھماکے سنائی دیے۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف دوڑی اور اندرونی دروازہ کھول کر جب وہ وہاں پہنچی تو اس نے تین آدمیوں کو سامنے کھڑے پایا۔ ان کی پشت اس کی طرف تھی۔ وہ ان کے درمیان سے گزر کر اپنے شوہر تک پہنچی جو آتش دان کے سامنے مڑی تڑی حالت میں پڑا تھا۔

اس کے سر سے بے حاشا خون بہہ رہا تھا۔ ایلینا نے اس کے سر کے نیچے ایک ٹکٹن رکھا۔ اس دوران وہ تینوں قاتل اطمینان سے رخصت ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے اپنا پستول وہیں پھینک دیا۔ دوسرے نے جاتے وقت اپنا پستول نیچے بیڑیوں میں پھینک دیا۔ انہوں نے تھارہ گولیاں چلائی تھیں جن میں سے گیارہ فکس کی گولی تھیں۔

الیکٹران نے قتل کئے والا وہ پندرہواں آدمی تھا جو قتل ہوا تھا۔ جو گروہ الیکٹران کے حامیوں کو قتل کر رہے تھے، جوابا ان کے آدمی بھی قتل ہوئے تھے اور یہ سلسلہ جاری تھا۔ کسی کا بھی قاتل پکڑا نہیں جاتا تھا۔ فکس کے قاتل کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔

انہی دنوں الیکٹران منصوبے میں جیتلا ہو کر بستر پر لیٹا ہوا تھا تاہم بیماری کی حالت میں بھی اس کا ذہن منصوبہ بندی میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی اس منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا کہ اس نے ہکا گو میں اپنے جانی دشمنوں کے سات آدمی اکٹھے مروا دیے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ان سات آدمیوں کو پولیس والوں نے قتل کیا۔

انہوں نے رات کے پچھلے پہر چھاپہ مار کر ایک جگہ سے ان آدمیوں کو نکالا اور تلاشی کے لئے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولیوں سے اڑا دیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اصل پولیس والے نہیں تھے۔ پولیس کی جعلی وردیوں میں وہ الیکٹران کے آدمی تھے۔ اس واقعے نے ہکا گو کو ہلا کر رکھ دیا۔ اخباری رپورٹر جب اس واقعے کی رپورٹنگ کرنے جائے وقوع پر پہنچے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی انہیں بڑی مشکل سے یقین آیا کہ جو جرم ان تک پہنچی تھی، وہ درست تھی۔

پولیس نے حسب معمول اس ہولناک واقعے کی تفتیش کے سلسلے میں بڑی مستعدی دکھائی اور خوب بھاگ دوڑ کی لیکن کوئی قابل ذکر نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کاؤٹنی کے سرکاری وکیل کے دفتر میں الیکٹران کو بھی طلب کیا گیا۔ وہ اپنے مخصوص طم طرائق سے وہاں پہنچا۔

نہایت شاندار ہنسی ہوئی گاڑی، بہترین لباس، مخصوص ساخت کا سفید فیکس ہیٹ وغیرہ الیکٹران کی پہچان تھا۔ وہ تین باڈی گارڈز کے ساتھ سرکاری وکیل کے دفتر پہنچا۔ ایک باڈی گارڈ گاڑی کے قریب کھڑا رہا۔ دوسرا گیٹ پر تعینات رہا۔ تیسرا الیکٹران کے ساتھ دفتر کے دروازے تک گیا۔

سرکاری وکیل نے تیل کے قتل کے قدرے پرانے واقعے کی مزید تفتیش کے بھانے الیکٹران کو بلوایا تھا تاہم اس نے اس سے تازہ ترین واقعے کے بارے میں بھی سوالات کئے۔ حسب معمول الیکٹران کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ وہ کسی بھی پہلو سے گرفت میں نہ آیا تو وکیل نے اس سے اس کی آمدنی اور فیکس کے بارے میں بھی سوالات کئے۔

اس وقت تک الیکٹران کو بھی علم نہیں تھا کہ فیکس کا محکمہ اس کے پیچھے لگ چکا تھا اور اس کے خلاف فیکس چوری اور آمدنی کے ناجائز ذرائع کے سلسلے میں شواہد اکٹھے کر رہا تھا۔ اس سے حکومت کا ایک مقصد تو واقعی بہت

ور ترین آدمی کہنا شروع کر دیا۔ یہ بات بھی الیکٹران کے لئے کچھ ایسی تشویش کا باعث نہیں تھی۔ وہ سنی ان کی کر سکتا تھا لیکن پھر اسے ایک تشویش ناک خبر ملی کہ اسکیل کو جوزف ایلو کے ساتھ سر جوڑ کر سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھا گیا ہے۔ انداز بالکل ایسا تھا جیسے وہ دونوں کسی سازش کا ٹانٹا بنا تیار کرنے میں مصروف ہوں۔

جوزف ایلو ایک سر پھر انسان تھا اور الیکٹران کا جانی دشمن تھا۔ اس کا وہ اعلان ابھی تک برقرار تھا کہ وہ الیکٹران کو قتل کرنے والے کو پچاس ہزار ڈالر انعام دے گا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسکیل نے اس کی یہ پیشکش قبول کر لی تھی اور اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ الیکٹران کو قتل کر دے گا۔

اس وقت تک جوزف لگتا نہ اسکیل کو ”یونین“ کا نائب صدر بنایا تھا۔ اس وجہ سے اسکیل اور بھی زیادہ دھم میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب وہ ہٹل اور گنتا یہ سوچنے لگے تھے کہ اگر الیکٹران راستے سے ہٹ جائے تو وہ تینوں مل کر فکا گو کی جراثیم کی دنیا پر حکمرانی کرنے لگیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ الیکٹران کی بنائی ہوئی ”دیپاٹز“ پر بھی قبضہ کر لیں گے۔

اس سازش کا پتہ درحقیقت الیکٹران کے باڈی گارڈ فریک ریو نے چلایا۔ اس نے جا کر جب یہ بات الیکٹران کو بتائی تو الیکٹران کو اس پر یقین نہ آیا۔ ویسے تو وہ دنیا کو بہت سمجھتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ دنیا میں کچھ بھی ممکن ہے۔ نظر یہ رکھنے کے باوجود بعض اوقات انسان کو کچھ باتوں پر یقین نہیں آتا۔

اسکیل اور ہٹل کو الیکٹران نے نہ صرف ”کام“ کے آدمی بنایا تھا بلکہ ایک طرح سے ان دونوں کی زندگیوں بھی الیکٹران ہی کی دھن منت تھیں۔ ایک موقع ایسا بھی آیا تھا جب وہ ان دونوں کی زندگیوں کا سودا کر کے بہت بڑا فائدہ اٹھا سکتا تھا اور اس وقت تو الیکٹران کے لئے ان دونوں کی زندگی کی کچھ خاص اہمیت بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود الیکٹران نے اس سودے بازی کے لئے ہائی نہیں بھری تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہی اسکیل اور ہٹل اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

جب فریک ریو کی طرح بھی الیکٹران کو اپنی اس اہم ترین اطلاع پر یقین کرنے کے لئے آمادہ نہ کر سکا تو اسے ڈراغہ بھی آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایسی اہم اور سنسنی خیز اطلاع لے کر آیا ہے کہ الیکٹران اچھل پڑے گا اور اس کی اس خدمت کو بہت سراہے گا۔ تاہم وہ الیکٹران کا صحیح معنوں میں وفادار آدمی تھا۔

وہ اپنے غصے کو پی گیا اور اس نے الیکٹران کو اپنی بات کا یقین دلانے کے لئے ایک ڈرامہ رچانے کی تجویز پیش کی۔ یہ تجویز الیکٹران نے قبول کر لی۔

ان دونوں نے اسکیل اور ہٹل کے سامنے کسی مسئلے پر بات بڑھ جانے کا ڈرامہ رچایا۔ ان کے درمیان کسی معاملے پر اختلاف ہوا پھر تلخ کلامی ہوئی۔ بات یہاں تک بڑھی کہ فریک ریو نے اٹھ کر الیکٹران کے منہ پر پتھر سید کر دیا اور اس کمرے سے اٹھ کر چلا گیا۔ الیکٹران کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

یہ سب ڈرامہ تھا لیکن اتنی عمدگی سے پیش کیا گیا تھا کہ اسکیل اور ہٹل کو اس پر یقین آ گیا۔ وہ دوسرے ہی دن جا کر فریک ریو سے ملے اور اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ ان کے ساتھ مل کر اسے کیا کیا فائدہ حاصل ہوں گے اور وہ کتنا طاقت ور آدمی بن جائے گا۔ انہوں نے اسے بتا دیا کہ جوزف ایلو اور جوزف لگتا بھی ان کے ساتھ تھے اور ان کی سرپرستی کر رہے تھے۔

فریک ریو نے جا کر یہ سب کچھ الیکٹران کو بتایا تو اسے یقین کرنا ہی پڑا۔ اس کا دل جتنا مجروح ہوا، اتنا ہی شدید اسے غصہ بھی آیا۔ فیصلہ ہوا کہ جوزف لگتا، اسکیل اور ہٹل تینوں کو قتل کر دو اتنی سزا ملنی چاہئے۔

سزا دینے کا طریقہ الیکٹران کے قریبی ساتھی نئی نے تجویز کیا۔ دوسرے دو قریبی ساتھی مارز اور جو بھی اس وقت وہیں موجود تھے۔ ملے پایا کہ انڈر ورلڈ کے خاص خاص لوگوں کے اعزاز میں ایک ضیافت دی جائے جس میں اسکیل، ہٹل اور لگتا کو مہمانان خصوصی کے طور پر مدعو کیا جائے۔ نئی کے خیال میں دعوت کی خوب صورتی اور رنگارنگی کے

درمیان سزا کی اذیت اور گھٹن و گھٹو فکس کر دینا ایک دلچسپ عمل تھا۔ پروگرام کے مطابق 7 مئی کی شب کے لئے تمام خاص خاص لوگوں کو دعوت دے دی گئی۔ ضیافت ”دی پلائیشن“ میں رکھی گئی تھی۔ یہ پائی وے پر واقع ایک بڑا رستورنٹ اور کیسینو تھا۔ ضیافت اس کے پچھلے حصے میں تھی، جو بالکل الگ تھلگ تھا۔

مہمان وہاں پہنچنے کو حسب روایت سب کی تلاشی لی گئی پھر انہیں اندر جانے دیا گیا۔ اسکیل، ہٹل اور لگتا بھی بڑے خوش خوش وہاں پہنچے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ان تینوں نے نہایت پر تکلف کھانوں کے ساتھ شراب کا تو بے دریغ استعمال کیا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ شاید انہیں تھوڑی مقدار میں کوئی خواب آور دوا بھی دی گئی تھی کیونکہ جب انہیں کچھلی طرف ایک خاص کمرے میں لے جایا گیا تو وہ اپنے حواس میں نہیں تھے۔

جب انہیں مار پڑی شروع ہوئی تب شاید ان کے حواس بیدار ہوئے ہوں لیکن اس وقت کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس وقت ان کے ہاتھ پاؤں باندھے جا چکے تھے۔ الیکٹران نے خود اپنے ہاتھ سے انہیں مارنا شروع کیا۔ اس مقصد کے لئے وہ بیس بال کا بیٹ استعمال کر رہا تھا جس کے کنارے آری کے ذریعے کچھ کنارے دار اور زیادہ تکلیف دہ بنا دیے گئے تھے۔

الیکٹران نے مار مار کر ان کے جسم کی ہر ہڈی توڑ ڈالی۔ اسکیل اور ہٹل کو اس نے زیادہ اور گنتا کو کم مارا۔ مارز برابر والے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے بعد میں کسی کو بتایا۔ ”الیکٹران اس رات اتنے غصے میں تھا کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ میں خود اسے دل کا دورہ نہ پڑ جائے۔“

جب وہ تینوں کچلے ہوئے گوشت اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا ملبوہ بن کر رہ گئے تو ان میں بس سانس ہی باقی رہ گئی تھی جب انہیں کیے بعد دیگرے گولی مار دی گئی۔ ایک ایک نہیں بلکہ کئی کئی گولیاں ان کے جسموں میں اتاری گئیں۔ کئی گولیاں تو غائبانہ ان کے جسموں میں اس وقت پیوست ہوئیں جب ان کی جان نکل چکی تھی۔ ان کا پوسٹ مارٹم کرنے والے لوگوں میں شامل ایک پتھولوجسٹ نے اپنے بیان میں کہا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے ایسے انسانوں کی لاشیں نہیں دیکھی تھیں جنہیں اس بری طرح مارا گیا ہو۔“

دوسرے روز بڑھ بچے کے قریب ان کی لاشیں وہاں سے بہت دور ایک سڑک کے کنارے ان کی کاروں میں کاٹھ کباڑ کی ٹھریوں کی طرح پڑی پائی گئیں۔

الیکٹران اسی رات الاٹلک سٹی کے پریڈیٹ ہوٹل میں ہونے والی ایک میٹنگ میں شرکت کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ یہ میٹنگ بہ ظاہر محرز اور کاروباری لوگوں کا اجتماع معلوم ہو رہی تھی لیکن اس میں شرکت کرنے والے درحقیقت مختلف شہروں کی انڈر ورلڈ کے خاص خاص لوگ اور طاقت ور گروہوں کے سرغنہ تھے۔ نیویارک، بوسٹن، نیوجرسی، نیو آریلینز اور فلوریڈا کے لوگ آئے ہوئے تھے۔

وہ سب رنگ، نسل اور قومیت کا امتیاز رکھے بغیر اکٹھے ہوئے تھے اور ان کا مقصد کچھ مشترکہ مسائل پر غور کرنا تھا۔ وہ سب اپنی جگہ جرائم کی دنیا کے چھوٹے بڑے بادشاہ تھے لیکن انہیں ہکا گو کی صورت حال پر تشویش تھی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ محض ہکا گو میں ہونے والی قتل و غارت اور جرائم کے سیلاب کی وجہ سے حکومت پورے ملک میں ہی جرائم پیشہ اور مافیائی قسم کے گروہوں کے خلاف کوئی خصوصی ہم یا آپریشن کلین اپ وغیرہ نہ شروع کر دے اور یوں ایک شہر کی وجہ سے سارے ہی شہروں کے جرائم پیشہ مارے جائیں، جو زیادہ طوقان برپا کئے بغیر اور زیادہ نمایاں ہوئے بغیر کافی حد تک آرام سکون سے اپنی ”روزی روٹی“ کما رہے تھے۔

مالیائی مشیر اور اکاؤنٹنٹ وغیرہ موجود تھے۔ اس نے ہر چیز کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ ہر سوال، ہر اعتراض کا جواب دے سکتا تھا۔ مالیاتی وکیلوں نے اسے اچھی طرح سمجھایا ہوا تھا کہ کس قانون سے کس طرح فائدہ اٹھاتا ہے۔

کاؤٹنی کا سرکاری وکیل اسے حراست میں لینے کا تو کیا، زیادہ دیر روکنے کا بھی کوئی جواز تلاش نہیں کر سکا حالانکہ اس دوران ایک اخبار ایک گروہ کے سرغنہ کا یہ بیان بھی چھاپ چکا تھا کہ اس خوفناک انداز میں خوریزی صرف الیکٹران کا گروہ ہی کر سکتا ہے۔

پولیس نے اس دوران اپنی سرگرمی اور مستعدی کے اظہار کے لئے تفریحات کے تقریباً تمام اڈے بند کر دیے تھے۔

اس صورت حال پر، تفریحات کے عادی ایک شخص نے شام کے وقت جمائی لیتے ہوئے کہا تھا۔ ”اب اس شہر میں اور قبرستان میں کیا فرق رہ گیا ہے؟“

اخبارات نے خوریزی کے اس واقعے کے بارے میں خاصی سخت سرخیاں لگا گئیں۔ ایک اخبار نے طویل تحقیقات کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہونے پر لکھا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ مافیائی اور انڈر ورلڈ کی ملک کا طاقتور ترین طبقہ ہوگی۔“

دوسرے بڑے اخبار نے لکھا۔ ”آٹار بتا رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ امریکا کے دوسرے بڑے شہر بھی ہکا گو کی طرح ہو جائیں گے۔“

ایک اور بڑے اخبار نے ذرا مختلف الفاظ میں یہی بات دہرائی۔

”اب کسی بھی شہر میں وہی کچھ ہونے کی توقع رکھی جاسکتی ہے جو ہکا گو میں ہوا۔“

اس واقعے کی بازگشت دھیرے دھیرے معدوم ہوتی گئی۔ اس دوران الیکٹران کے دو تین بد معاش پکڑے بھی گئے۔ حتیٰ کہ ان کے بعد وہ مشین گنیں بھی برآمد ہوئیں جو اس واردات میں استعمال کی گئی تھیں اور وہ گاڑی بھی آدھ جلی حالت میں مل گئی جس میں بیٹھ کر قاتل آئے اور گئے تھے لیکن ان سب چیزوں کے ذریعے بھی پولیس کا الیکٹران تک پہنچنا یا اسے اس واقعے کا ذمہ دار ثابت کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔

اس دوران فیکس کا محکمہ بہر حال صرف الیکٹران کے ہی نہیں بلکہ تمام بڑے بڑے گینگسٹرز کے پیچھے لگا رہا جو ناجائز دھندوں سے دولت کما رہے تھے فیکس انہیں کر رہے تھے۔ ایک ناقابل یقین بات یہ تھی کہ الیکٹران فیکس کا کوشاں جمع نہیں کراتا تھا کیونکہ اس کے اپنے نام پر کچھ نہیں تھا۔ اس کی دولت پر اگر حضور بہت فیکس جاتا بھی تھا تو وہ دوسرے ناموں سے جاتا تھا۔

فیکس کے گھمے نے پہلے اس کے بھائی رالف پر ہاتھ ڈالا۔ اس کے وکیل نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کم از کم 60 ہزار ڈالر سالانہ آمدنی کا اقرار کر لے اور اس پر فیکس ادا کر دے۔ گوکہ یہ اس کی اصل آمدنی کا دسواں حصہ بھی نہیں تھا اور اس پر فیکس تقریباً پانچ ہزار ملے کیا گیا جس میں اگلا پچھلا سب حساب شامل تھا لیکن گھمے نے اسے بھی قبول کر لیا اس کے باوجود رالف ادا کی گئی میں لیت و صل سے کام لینے لگا اور خود کو قاتل ظاہر کرنے لگا۔ جب گھمے نے اسے جیل میں ڈالنے کی تیاریاں مکمل کر لیں تب اس نے یہ معمولی رقم ادا کی اور کوئی طور پر اس کی جان بچ گئی۔ اس دوران محکمہ الیکٹران کے بارے میں شواہد جمع کرنے میں لگا رہا۔

ادھر ہکا گو میں فکس کے قتل کے بعد جوزف لگتا ”یونین“ یعنی مافیائی کا صدر بنا تھا۔ وہ صرف 26 سال کا تھا اور ایک خطرناک بد معاش تھا۔ اسے ڈانس کا بہت شوق تھا۔ اس کے علاوہ اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ اسے شہنی بھارنے اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ ان عادات کو اس کی کمزوری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس نے اسکیل اور ہٹل نامی دو بد معاشوں کو اپنے بے حد قریب کر لیا جو درحقیقت الیکٹران کے پروردہ تھے۔ الیکٹران نے ان کی پشت پناہی کی تھی اور ان سے ایسے اہم کام لئے تھے کہ ان کی خود اعتمادی میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ دونوں کافی حد تک گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے تھے۔

اسکیل کو تو ایک بار ایک نائٹ کلب میں بیٹھے دیکھ کر اسے پہچاننے والا ایک ویٹر اس کے قریب چلا گیا تو اس نے اسکیل کو اپنے ایک شناسا کی طرف جھک کر یہ کہتے ہوئے سنا۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہئے اب ہکا گو کا طاقتور ترین آدمی میں ہوں۔“

الیکٹران اب میامی میں زیادہ رہتا تھا اور ہکا گو کے معاملات سے وہ کافی حد تک لائق سادگائی دیتا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کی نفسیات کچھ ایسی قسم کی ہوتی ہے کہ جب گھر یا دفتر کا سربراہ کہیں گیا ہوا ہو تو اس کی غیر موجودگی میں باقی لوگ بے پروا سے ہو جاتے ہیں اور بعض کو اپنے بارے میں کوئی ذرا غمی ہونے لگتا ہے۔

الیکٹران کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں گروہ کا نظام تو ٹھیک چل رہا تھا اور تمام دھندے بھی معمول کے مطابق جاری تھے لیکن اسکیل اور ہٹل جیسے لوگوں کے دلوں میں خوش فہمیاں گھر کرنے لگی تھیں اور کچھ سرکشی کے جذبات بھی سراٹھانے لگے تھے۔ انہیں احساس نہیں تھا کہ یہ ان کی بے وقوفی تھی۔

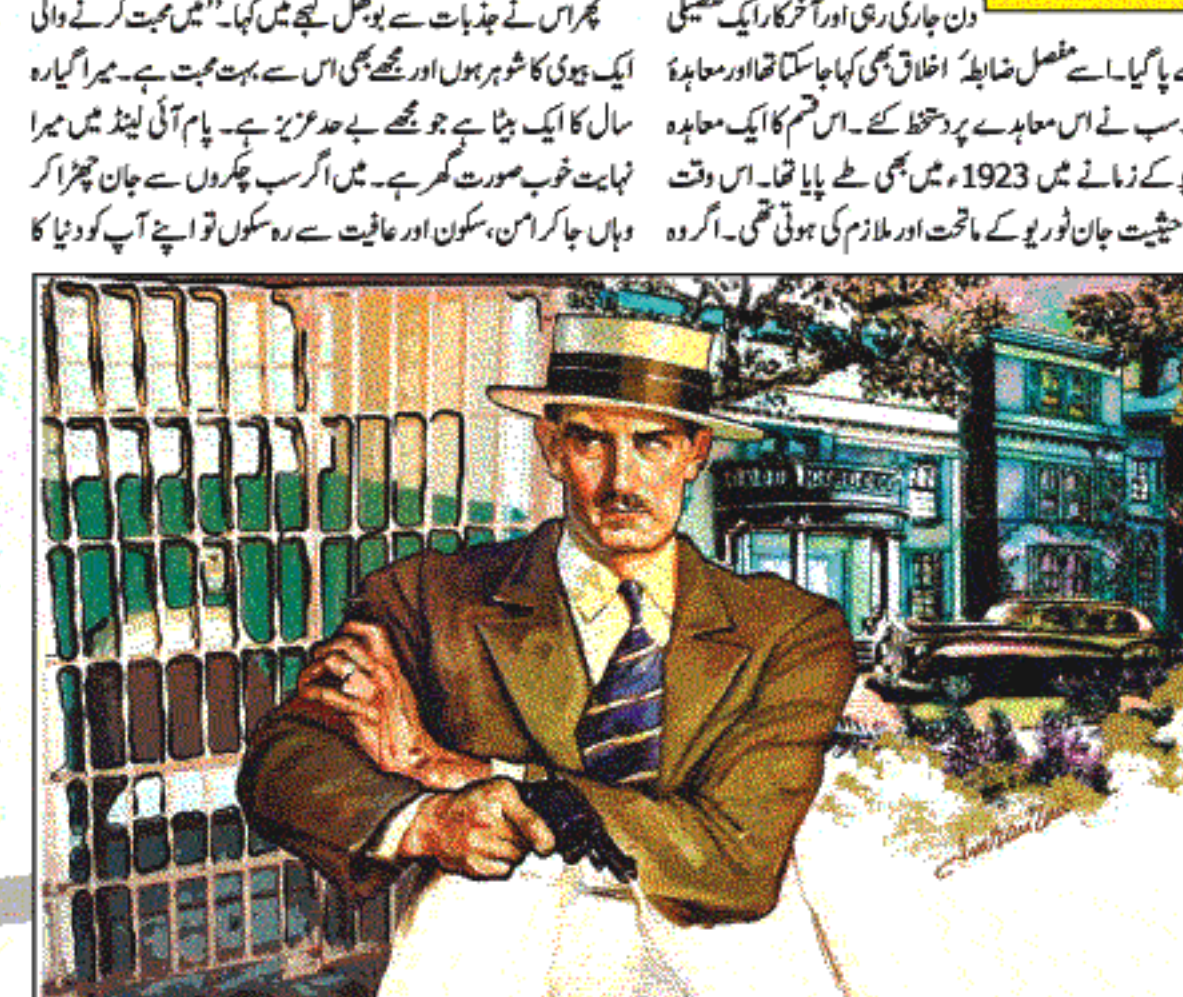
انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ الیکٹران خواہ ہکا گو میں موجود نہیں تھا لیکن شہر پر اس کی گرفت ڈھیلی پنڈلی نہیں تھی۔ جاسوسی کا اس کا اپنا ایک نظام تھا جو بھی تک صحیح کام کر رہا تھا۔ وہ دونوں الیکٹران کے انتہائی قریبی آدمی ہونے کے باوجود اس کے طور طریقوں کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ہکا گو کے ہوٹل اور کلبوں میں کام کرنے والے کتنے ویٹر، کتنے ٹیکسی ڈرائیور اور گلیوں میں پھرنے والے کتنے آوارہ گرد درحقیقت الیکٹران کے جاسوس اور جبر تھے۔

الیکٹران کو فوراً اطلاع مل گئی کہ اسکیل نے اپنے آپ کو ہکا گو کا طاقت



ان لوگوں کی یہ پیشنگ یا کانفرنس تین دن جاری رہی اور آخر کار ایک تفصیلی معاہدہ طے پا گیا۔ اسے مفصل ضابطہ اخلاق بھی کہا جاسکتا تھا اور معاہدہ امن بھی۔ سب نے اس معاہدے پر دستخط کئے۔ اس قسم کا ایک معاہدہ جان نوریو کے زمانے میں 1923ء میں بھی طے پایا تھا۔ اس وقت الیکون کی حیثیت جان نوریو کے ماتحت اور ملازم کی ہوتی تھی۔ اگر وہ

ہیں۔ آپ کہیں بھی چلے جائیں، وہ آپ کی جان نہیں چھوڑتیں۔“ پھر اس نے جذبات سے پوچھ لیا کہ میں کہا۔ ”میں محبت کرنے والی ایک بیوی کا شوہر ہوں اور مجھے بھی اس سے بہت محبت ہے۔ میرا گیارہ سال کا ایک بیٹا ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ پام آئی لینڈ میں میرا نہایت خوب صورت گھر ہے۔ میں اگر سب چکروں سے جان چھڑا کر وہاں جا کر امن، سکون اور عافیت سے رہ سکوں تو اپنے آپ کو دنیا کا



زندہ ہوتا تو شاید یہ دیکھ کر خوش ہوتا کہ اتنے کم عرصے میں اس کے ”ہونہار“ شاگرد نے جتنی ”ترقی“ کی تھی۔

طے پانے والے معاہدے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ لوگ عوام کے دلوں میں اپنے لئے بڑھتی ہوئی نفرت کو کچھ کم کرنے کی کوشش کریں۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اپنی تمام تر برائیوں کے ساتھ بہر حال انہیں اسی معاشرے میں رہنا تھا اور اگر لوگوں میں ان کے خلاف نفرت بڑھتی رہی تو ایک روز اس نفرت کا سیلاب انہیں بہا کر نہ لے جائے۔

الیکون کا ذہن شاید اس سے بھی کچھ آگے کی سوچ رہا تھا۔ اس کانفرنس کے اختتام کے تین دن بعد وہ اعلان کیا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کار میں روانہ ہوا۔ ان کا ارادہ تھا کہ انڈیا آکٹیشن سے ایک ٹرین چلانے کا تھا جو نیویارک سے شکاگو جاتی تھی۔ وہ راستے میں اس میں سوار ہونا چاہتے تھے لیکن فرین وہاں نہیں پہنچ سکی۔ راستے میں اس کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔

انہوں نے سامان انجنین کے لاکر میں رکھا اور وقت گزاری کے لئے قریبی شہر چلے آئے۔ وہ عام سے شہریوں کی طرح پیدل ایک سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ الیکون نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی پہچانے۔ مزید وقت گزاری کے لئے انہوں نے مقامی سنیما ہال میں فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

وہ جب سنیما ہاؤس میں داخل ہو رہے تھے تو دروازے کے قریب سادہ لباس میں پولیس کے دوسرا گھڑے تھے۔ ان میں سے ایک الیکون کو پہچان رہا تھا۔ اس کا نام شوٹی تھا، وہ شکاگو میں تعینات رہ چکا تھا۔ وہ حیرت سے تقریباً چلا اٹھا۔ ”ارے یہ تو الیکون ہے! یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“

پھر اس نے اور اس کے ساتھی نے آگے بڑھ کر الیکون اور فریک ریو کو روک لیا۔ شوٹی نے تصدیق چاہی۔ ”تم الیکون ہونا۔۔۔؟“ ”تم کون ہو؟“ الیکون نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سخت لہجے میں پوچھا۔ پھر اسے یاد آگیا۔ ”ارے!۔۔۔! تم تو شوٹی ہو۔“

اس دوران شوٹی اور اس کے ساتھی نے اپنے بیچ بھی نکال کر ان کے سامنے لہرا دیئے۔ فریک ریو چار حارہ انداز میں آگے آیا مگر الیکون نے اسے روک دیا اور نیچی آواز میں اسے مطلع کیا۔ ”ارے بھئی یہ تیل کی بوتلی ہے۔“

تیل کی اصطلاح وہ لوگ پولیس والوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ الیکون نے ریو کو دماغ خنڈا رکھنے کا اشارہ کیا پھر اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پستول نکال کر کسی مطالبے کے بغیر خودی پولیس آفیسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس یہ ہے۔ ویسے یہ لائنس یافتہ ہے۔“

پھر اس نے ریو کو بھی اشارہ کیا کہ وہ اپنا ریو اور پولیس آفیسر کی خدمت میں پیش کر دے۔ ریو نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ لائنس یافتہ ہتھیار کو چھپا کر ادھر ادھر گھومنا جرم تھا تاہم کوئی ٹھیک جرم نہیں تھا۔ بہر حال الیکون اور ریو کو اس ”جرم“ میں حراست میں لے لیا گیا۔

الیکون کے ساتھ اس وقت دو اور باؤی گاڑ ڈھکی تھے لیکن وہ اس موقع پر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں شامل ہو کر غائب ہو گئے۔

الیکون اور ریو کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا اور باقاعدہ گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی تصویروں اور فنکر پرنس لے لئے گئے۔ رات ہی کو ایک مجسٹریٹ کو بینہ سے اٹھا کر انہیں سٹی ہال میں اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسی دوران حیرت انگیز طور پر شہر کے دو مشہور وکیل الیکون اور ریو کی وکالت کرنے کے لئے بھی وہاں پہنچ گئے۔

ان کے آنے سے پہلے مجسٹریٹ دونوں ملازموں کی 35 ہزار ڈالری ضمانت منظور کر چکا تھا مگر الیکون کی جیب میں اس وقت صرف پچاس ڈالر اور ریو کی جیب میں بارہ ڈالر تھے۔

وکیل ضمانت کی رقم کے بارے میں نہ کہ چارج پا ہو گئے۔ ایک وکیل نے مجسٹریٹ سے کہا۔ ”میں نے آپ کو بغیر لائنس ہتھیار جیبوں میں چھپا کر پھرنے والوں کی ضمانت تین چار سو ڈالر میں لینے دیکھا ہے پھر ہمارے ان موکلوں پر کیوں یہ خصوصی نظر کرم ہوئی ہے کہ ان کی ضمانت 35 ہزار ڈالر میں لی گئی ہے؟“

”اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ان لوگوں کی ضمانت کم از کم ایک لاکھ ڈالر میں لیتا۔“ مجسٹریٹ نے جواب دیا۔

اسی دوران پبلک سیفٹی کے جج کا ڈائریکٹر ریٹائرڈ میجر شوٹیلڈ بھی آکر الیکون سے ملا۔ اس نے کافی دیر تک الیکون سے بات کی اور بعد میں کچھ دوسرے آفیسرز سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو الیکون کا کافی مقبول آدمی معلوم ہوا ہے، وہ اب نہ صرف دوسرے گینگسٹرز کے ساتھ بلکہ قانون کے ساتھ بھی حماز آرائی نہیں چاہتا اور صلح صفائی سے رہنا چاہتا ہے۔“

میجر شوٹیلڈ اس سے کافی متاثر نظر آ رہا تھا۔ ریو نے کچھ کر ماری دیکھانے کی کوشش کی تو الیکون نے اسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اس نے میجر شوٹیلڈ، کچھ دوسرے ذمہ دار افسروں اور چند اخبار نویسوں کے سامنے باتیں کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی کی ضمانت اور قدرے ندامت سے کہا۔ ”میں نے شکاگو میں چار پانچ سال پہلے ناجائز دھندوں میں ہاتھ ڈالا تھا۔“

وہ اپنے ابتدائی زمانے کا ذکر گولی کر گیا۔ اس نے صرف اسی وقت سے بات شروع کی جب اس کا نام سامنے آنے لگا تھا اور وہ کچھ ”ترقی“ کرنے لگا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”گزشتہ دو سالوں سے میں اس دنیا سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا۔ دراصل جرائم اور ناجائز دھندوں کی دنیا ایک دلدل کی طرح ہوتی ہے۔ ایک بار آپ اس میں اتر گئے تو بس پھر زیادہ سے زیادہ گہرائی میں ہی اترتے جاتے ہیں۔ آپ اس دنیا کو چھوڑنا چاہتے ہیں مگر یہ دنیا آپ کو نہیں چھوڑتی۔ آپ کو کچھ جوئیں چٹ جاتی ہیں جو آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ وہ ہمیشہ آپ کا خون چسپاں رہتی ہیں۔ کبھی وہ آپ سے رقیں بنتی ہیں۔ کبھی کچھ کاموں کی فرمائش کرتی ہیں۔ آپ انکار کریں تو وہ آپ کی زندگی اور آپ کے تمام معاملات خراب کرنے کی کوشش کرتی

خوش نصیب ترین آدمی سمجھوں گا۔ میں ”جیو اور جینے دو“ کے اصول کے تحت زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میں انڈر ورلڈ کی قتل و غارت اور خونریزی سے تنگ آچکا ہوں، تنگ چکا ہوں۔ امن، سکون اور بھائی چارے کی خواہش دل میں لے کر ہی میں اعلان کیا گیا تھا۔ وہاں انڈر ورلڈ کے سب خاص خاص لوگ جمع ہوئے تھے اور میں نے ان سب سے وعدہ لیا ہے کہ آئندہ وہ سب قتل و غارت چھوڑ کر امن، سکون سے رہیں گے۔ تین روز تک ہمارے دو زمانہ مذاکرات ہوتے رہے اور آخر کار ہم سب ایک معاہدے پر متفق ہو گئے اور ہم نے اس پر باقاعدہ سائن کئے ہیں۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ ماضی کو بھول کر ایک بہتر مستقبل کی بنیاد رکھیں گے۔“

ڈائریکٹر پبلک سیفٹی ڈپارٹمنٹ، میجر شوٹیلڈ نے اس سے انڈر ورلڈ کی زندگی کے بارے میں سوالات کئے تو وہ بولا۔ ”ویسے تو میں نے جہاں بھی زندگی گزاری ہے اور جیسے بھی گزاری ہے، مجھے اس کے بارے میں کوئی شکایت نہیں۔ وہ میرا اپنا انتخاب تھا اور میں اس سے مطمئن ہوں لیکن سچی بات ہے کہ وہ زندگی کوئی زندگی نہیں۔ میں نے جس طرح وہ زندگی گزاری ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس زندگی میں ہر لمحے موت کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور موت واقعی ہر قدم پر آپ کے تعاقب میں رہتی ہے۔ آپ اپنے سارے پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے۔ آپ کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کون آپ کو دھوکا دے جائے، جس کو آپ سے ذرا سی بھی شکایت پیدا ہو جائے، وہی آپ سے غداری کر سکتا ہے اور بعض لوگ تو کسی شکایت کے بغیر ہی غداری کر جاتے ہیں۔ میں باؤی گاڑ کے بغیر گھر سے نہیں نکل سکتا۔ فریک ریو پچھلے دو سال سے سائے کی طرح میرے ساتھ ہے۔“

”موت کے اس مسلسل خوف کے باوجود تم اسے صحت مند، توانا اور مضبوط کیسے رہے؟ تمہارے اعصاب کیسے سلامت رہے؟“ میجر شوٹیلڈ نے دریافت کیا۔

”یہ شاید قدرت کی طرف سے تحفہ ہے یا پھر شاید بات یہ ہے کہ آپ جس طرح کی بھی زندگی اپناتے ہیں، اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔“ الیکون نے دانشورانہ انداز میں جواب دیا۔ ”ابھی چند دن پہلے ہی میرے تین بہترین دوستوں اسکیل، ہنسل اور گنٹا کو کسی نے نہایت سفاکی سے قتل کر دیا۔ اس قسم کے واقعات مجھے جیسے انسان کو بھی ہلا کر رکھ دیتے ہیں لیکن بہر حال زندگی کا سفر تو چل رہا ہے۔“ اس نے کندھے سے آچکا لے۔

”آج کل تم کیا کر رہے ہو؟“ شوٹیلڈ نے پوچھا۔

”میں اب ریٹائر ہو چکا ہوں۔“ الیکون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میرے پاس جو دولت ہے، اب میں اسی سے زندگی بسر کروں گا لیکن مجھے معلوم ہے جو ٹھیک میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ موت سے زیادہ میں ان جو تکوں سے ڈرتا ہوں۔“

تحقیقین کا کہنا ہے کہ الیکون کی یہ گرفتاری اس کا اپنا تخلیق کردہ ڈرامہ تھا۔ جو کچھ بھی ہوا، یہ سب اس کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ اس نے جو بھی باتیں کیں، وہ سب اس نے پہلے سے سوچ رکھی تھیں۔ پولیس کے سرانجام رساں اور دوسرے سرکاری اہلکاروں کے اس ڈرامے میں شریک تھے۔

اسے احساس تھا کہ عوام میں اس کے خلاف نفرت بڑھ رہی تھی۔ یہ اس نفرت کو کم کرنے اور اپنا انجیل بہتر بنانے کی اس کی ایک زبردست کوشش تھی، وہ بلا کا شاطر اور فطین تھا۔ کسی بھی قسم کی صورت حال کی مناسبت سے کوئی بھی بڑا فیصلہ کر کے فوری طور پر قدم اٹھانے کے معاملے میں اس کا جواب نہیں تھا۔

تاہم کچھ دوسرے تحقیقین کا خیال ہے کہ اس کی گرفتاری حقیقی تھی کیونکہ اس کے ساتھ نرم سلوک ہرگز نہیں کیا گیا۔ اسے ایک سال کی سزا سنائی گئی۔ امکان تھا کہ اسے کم از کم دس ماہ تو جیل میں گزارنے ہی پڑیں گے۔ اسے ہومز برگ جیل میں بھیجا گیا جو انتہائی سخت جیل مشہور تھی۔ اس کی عمارت بہت پرانی اور سیاہ پتھروں کی بنی ہوئی تھی اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔

جیل بھیجے جانے سے پہلے ان کی شناختی پریز بھی کرائی گئی۔ ان کے چہروں پر نہایت تیز روشنی مرکوز کر کے زاویے بدل بدل کر ان کے چہرے کچھ گواہوں کو دکھائے گئے۔ وہ جیل پہنچے تو ان کے ہال کاٹ کر بالکل چھوٹے کر دیئے گئے۔ ٹیس اور جیتی لباس پہننے والے الیکون کو قیدیوں والی گھٹیا اور بے شکم وردی دے دی گئی۔

اس کے ساتھ بالکل عام قیدیوں جیسا سخت اور درشت رویہ رکھا گیا۔ کوئی معمولی سی رعایت بھی نہیں برتی گئی۔ اسی لئے بعض تحقیقین نے یہ رائے دی ہے کہ اس پر قانون نے واقعی اپنی مرضی سے ہاتھ ڈالا اور موقع پا کر اسے سزا دینے کی کوشش کی تھی۔ الیکون نے سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں زبردست قوت برداشت بھی موجود تھی۔

الیکون کی زندگی کے بارے میں حقائق جمع کرنے والے دو صحافیوں اور سوانح نگاروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ الیکون کی گرفتاری اس دور کے صدر ہورری کی ذاتی ناپسندیدگی کا نتیجہ تھی۔

ہورری امریکی تاریخ کے ایک دلچسپ صدر تھے۔ انہیں ہلکی پھلکی ورزش اور صحت بخش دوائیں کھانے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے جو گنگ کے لئے اپنی کابینہ کے ارکان کو بھی علی الصباح ایوان صدر کے لان پر جمع ہونے کا عادی بنا رکھا تھا۔ وہ سب صدر صاحب کی وجہ سے علی الصباح آکر ہاؤس کاؤس کے لان پر پروٹوگنڈے پر مجبور تھے۔

کبھی کبھی کابینہ کے اجلاس کے دوران ملک و قوم کے اہم اور پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے صدر صاحب اچانک کسی سیکرٹری کے چہرے کی طرف دیکھ کر تشویش سے کہتے تھے۔ ”فٹل! تمہارا چہرہ تو روز بروز زرد ہوتا جا رہا ہے۔“ پھر وہ اپنی دروازے سے کوئی شیشی نکال کر پٹی کچی گولیوں سمیت اس کی طرف لٹکا دیتے ہوئے کہتے تھے۔ ”تم یہ گولیاں باقاعدگی سے کھا کر رو۔“

اس کے بعد قوم کا اہم اور زیر بحث مسئلہ سچ میں ہی رہ جاتا تھا اور چہرے کی زردی کے اسباب پر تبادلہ خیال یا مباحثہ شروع ہو جاتا تھا۔ صدر صاحب کی اس عادت کی وجہ سے پریس والے ان کی کابینہ کا ذکر ”میڈیسن کابینہ“ کے نام سے کرتے تھے۔

صدر ہو کر ایک بار اپنی کابینہ کے ایک رکن سے یہ پوچھتے ہوئے گیا۔ ”وہ..... الیکون ابھی تک پکڑا گیا یا نہیں؟“

ایک بار صدر ہو کر کوئی سے یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا۔ ”میں الیکون کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

صدر ہو کر شاید الیکون کو صرف اس لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کے لئے بے تاب نہیں تھے کہ وہ ایک بڑا گینگسٹر تھا اور اس کا وجود معاشرے کی اخلاقیات یا ملکی قوانین کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ اس کی وجہ صدر صاحب کا ذاتی عداوتیان کی جاتی تھی۔

اس کے پس منظر کے طور پر یہ واقعہ بیان کیا جاتا تھا کہ ایک بار صدر صاحب کسی ہوٹل میں قیام کے لئے پہنچے اور انہوں نے اپنے عملے کے ساتھ ہوٹل کی لابی میں قدم رکھا تو ہلکا سا شور ابھرا۔ ”صدر صاحب آرہے ہیں۔“

یہ سن کر لابی اور ملحقہ ڈائننگ روم سے صرف دو چار افراد نے گردنیں گھما کر صدر کی طرف دیکھا اور بے نیازی سے دوبارہ اپنی گفتگو یا کھانے پینے میں منہمک ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک بار پھر شور ابھرا۔ ”الیکون آرہا ہے۔“

الیکون پہلے ہی سے اس ہوٹل میں مقیم تھا اور اس وقت وہ میز چلوں سے اتر کر لابی میں آ رہا تھا۔ صدر صاحب اس وقت حیران رہ گئے جب الیکون کی آمد کے بارے میں آواز بلند ہوتے ہی لابی اور ڈائننگ روم میں موجود تمام افراد کی گردنیں گھوم گئیں اور ان کی توجہ نہایت بڑا اشتیاق انداز میں الیکون کی طرف مبذول ہو گئی۔ کچھ لوگ تو کوئے کھدروں سے نکل کر جلدی سے اس طرح گرتے پڑتے آگے آئے جیسے کوئی عجوبہ لابی میں آیا ہو اور اگر انہیں ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی تو وہ اس کے دیدار سے محروم رہ جائیں گے۔

صدر صاحب کو یہی گمان گزرا کہ شاید وہ کوئی اشار یا سپر اسٹار قسم کی چیز تھا جس سے وہ ناواقف تھے۔ انہوں نے کسی سے پوچھا کہ یہ الیکون کون تھا؟ انہیں غالباً یہی بتایا گیا کہ وہ ایک بدنام زمانہ گینگسٹر تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ الیکون کے کچھ کارنامے بھی صدر صاحب کے گوش گزار کئے گئے ہوں۔

بہر حال صدر صاحب کو بہت غصہ آیا کہ ایک گینگسٹر اور جرائم پیشہ شخص کو دیکھنے کے لئے لوگوں نے اسے اشتیاق کا مظاہرہ کیا اور صدر صاحب کو محض بے نیازی سے دو چار افراد نے دیکھا اور انہوں نے بھی دوسرے ہی لمحے منہ پھیر لیا۔ صدر صاحب کے خیال میں یہ الیکون کی ”مقبولیت“ اور خزانہ کی اپنی عدم مقبولیت کی دلیل تھی۔

سنائے اس دن سے صدر صاحب کے دل میں گرہ پڑ گئی اور انہوں نے اپنے رفقاء کو کسی بھی طرح الیکون کو قانون کی گرفت میں لانے کا حکم دیا تھا اور الیکون کی گرفتاری ہی حکم کا شکار نہ تھی۔

اسی دوران بڑے اخبارات نے بھی الیکون کے بارے میں کچھ اس انداز سے لکھا کہ صدر صاحب کی ناپسندیدگی کو کچھ اور ہوائی۔ ”نیویارک ٹائمز“ نے لکھا۔ ”جتنی شہرت الیکون کو ملی ہے، اتنی شہرت اتنے کم عرصے میں اس سے پہلے کسی امریکی کو نہیں ملی۔“

”شکاگو کے اخبار“ ڈیپلی ٹائمز نے مسٹافانہ اور شکایتی سے انداز میں لکھا۔ ”امریکی کی شہادت اور اس کا ٹریڈ مارک اب الیکون بننا جا رہا ہے، جاوا کے جنگلوں سے لے کر یپ لینڈ کے میدانوں تک لوگ اس کا نام جانتے ہیں۔“

حقیقت یہی تھی کہ لوگ الیکون کو دنیا بھر میں ہنری فورڈ سے زیادہ جانتے تھے شاید ان کشمکشات نے ہو کر خاصہ کچھ اور بڑھایا ہو۔ بات خواہ کچھ بھی رہی ہو، بہر حال الیکون جیل پہنچ گیا اور لگتا یہی تھا کہ اسے سزا پوری کرنی ہی پڑے گی۔

اس نے کسی بھی وکیل کے لئے پچاس ہزار ڈالر فیس کا اعلان کیا جو اسے جیل سے نکالوائے پھر اس نے یہ رقم بڑھا کر ایک لاکھ ڈالر کر دی۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ کسی وکیل نے اس کی یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ کوئی اس کے کس کا جائزہ لینے بھی نہیں آیا۔

الیکون نے رپورٹرز کے سامنے خاصی بے چینی کا اظہار بھی کیا کہ وہ بہر حال میں جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا کچھ بس نہیں چل رہا تاہم اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ اگر کچھ عرصہ جیل میں گزارے گا تو وہ غم و غصہ خنڈا پڑ جائے گا جو بعض طبقوں میں اس کے خلاف پایا جاتا تھا۔

1829ء میں پتھروں سے بنی ہوئی اس قلعہ نما عمارت میں روز و شب گزارنا الیکون جیسے آدمی کے لئے آسان معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن وہ صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کو جیسے میں صرف دو بار اس سے ملاقات کی اجازت تھی تاہم رفتہ رفتہ حالات الیکون کے حق میں بہت بہتر ہو گئے۔

اسے جیل کے ایک ایسے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا جسے دوسرے قیدی جنت سے تشبیہ دیتے تھے۔ اس جنت کو مزید آرام دہ بنانے کے لئے الیکون کو اس میں اپنی مرضی سے اوسط درجے کا سامان رکھنے اور فرش پر قالین بھی بچھانے کی اجازت دے دی گئی۔ حتیٰ کہ دیواروں پر چھوٹی موٹی پینٹنگز بھی آوازیں کر دی گئیں۔ یوں اس خوفناک جیل کا ماحول الیکون کے لئے خوشگوار ہو گیا۔

اس نے دو مرتبہ معافی کے لئے اپیل کی لیکن دونوں مرتبہ اس کی اپیل مسترد ہو گئی۔ اس پر اس کے مزاج میں قدرے سختی آ گئی۔ ایک بار اس نے ایک صحافی سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ اگر بیڑ جیوں سے اترتے ہوئے کسی کے پاؤں میں موج آجائے، کسی کو فٹنڈی وجہ سے فلو ہو جائے، کسی کے گھر میں کتا یا بلی مر جائے۔ ان سب باتوں کا الزام الیکون پر لگایا جاتا ہے۔“

24 اکتوبر 1929ء کو اسٹاک مارکیٹ کریش کر گئی۔ الیکون نے اپنے وکیل کو بلوایا اور طرہ انداز میں کہا۔ ”خدا کے لئے جلدی سے پریس کو میری طرف سے بیان دو کہ میرا اسٹاک مارکیٹ کے کریش ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مارکیٹ میں نے کریش نہیں کرائی ہے۔“

اسی دوران اس کے بھائی رالف کو ٹیکس چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اپنے اکاؤنٹس میں موجود جن بھاری رقم کو خفیہ رکھا تھا اور جن پر کوئی ٹیکس ادا نہیں کیا تھا، ان کے بارے میں اس نے معصومیت سے کہا کہ وہ ورثے تو لوگوں نے شرطیں لگانے کے لئے اسے دی ہوئی تھیں، وہ جواریوں کی امنیت تھیں، اس کی اپنی ملکیت نہیں تھیں۔

بہر حال دوسرے روز 35 ہزار ڈالر میں اس کی ضمانت ہو گئی۔ الیکون نے معافی کے لئے سچے اعلان کیں۔ سب کی سب مسترد ہو گئیں۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا، اسے گویا قمار آ گیا اور اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ اسے کم از کم دس ماہ تو جیل میں گزارنے ہی ہیں۔

پریس سے اب بھی اس کا رابطہ رہتا تھا اور اس کے بارے میں اس قسم کی چھوٹی موٹی سرخیاں لگتی رہتی تھیں۔

”الیکون جیل میں زیادہ سکون محسوس کر رہا ہے۔“

”غش و آرام سے رہنے کے باعث اس کا وزن بڑھ گیا ہے۔“

کرسمس پر اس نے جیل کے غریب قیدیوں کے گھروں پر ہزاروں ڈالر کے تحائف بھجوائے اور قیدیوں کی تیار کی ہوئی چیزیں منجھکے داموں خرید لیں۔

(جاری ہے)







اس فہرست میں کئی اور لوگوں کے نام بھی شامل ہو سکتے تھے لیکن شاید اس لئے شامل نہیں ہوئے تھے کہ کرائم کمیشن ان کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔ جبکہ لنک کو بھی شاید انہی لوگوں میں شمار کیا جاسکتا تھا مگر وہ کسی گروہ کا سرغنہ تو کیا، کارکن بھی نہیں تھا۔

جبکہ لنک 1891ء میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد تیس سال

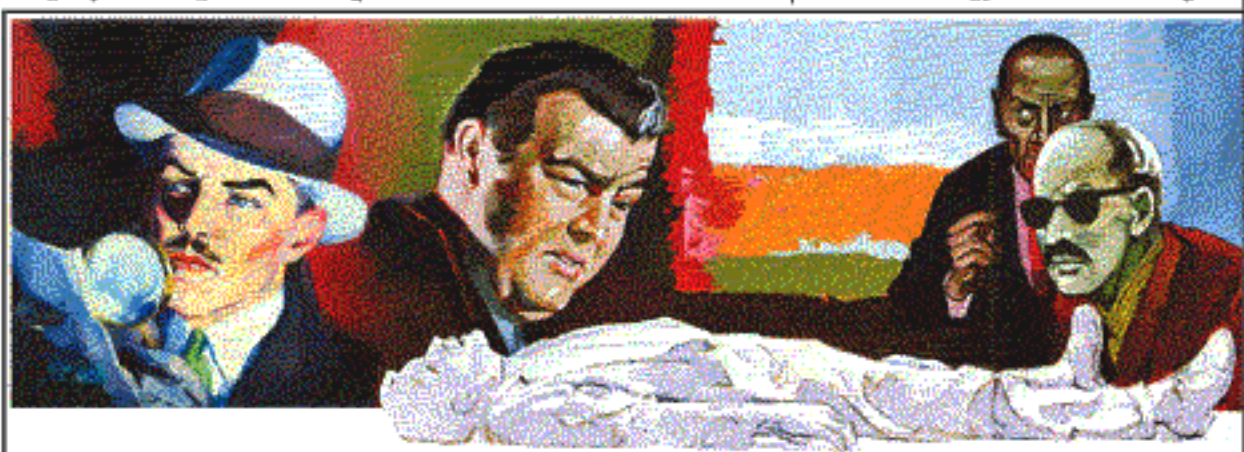
کرے گا؟“ جبکہ لنک اطمینان سے بولا۔

”مجھے اعزازہ ہو رہا ہے کہ وہ مجھے تحریری اجازت نہیں دے گا۔“ سنیزر بولا۔

”تو پھر تمہیں کلب نہیں کھولنا چاہئے۔“ لنک اطمینان سے بولا۔

”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“ سنیزر نے غصے سے کہا اور فون ہٹ دیا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد جبکہ لنک مٹی گن ایونیو کے قریب ریزین



راستے سے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ کسی نے اسے گولی مار دی۔ اس وقت وہ نہایت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے منہ میں سگار دبا ہوا تھا جو اس کے سرنے کے بعد بھی سلگتا رہا۔

قاتل اپنا ہوا اور ایک دستاں اس کی لاش کے قریب ہی پھینک گیا تھا۔ ایک دوراں گیروں کی گواہی سے پتا چلا کہ آخری لمحوں میں ایک آدمی کو جبکہ لنک کے نہایت قریب اور دوسرے کو تھوڑے فاصلے پر جاتے دیکھا گیا تھا۔

بہر حال تحقیقات سے کم از کم یہ قوت ثابت ہو گیا کہ یہ سنیزر لائن کا کام نہیں تھا بلکہ اس کی خواہش کسی اور کے ہاتھوں پوری ہو گئی تھی۔ پولیس کے اعزاز سے کے مطابق یہ انڈر ورلڈ کا کام تھا لیکن نہایت باریک بینی تحقیقات کے باوجود پولیس اس بات کا یقین نہیں کر سکی کہ یہ کس گروہ کا کام تھا۔

تحقیقات کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ جبکہ لنک نے باپ کی وراثت کے جو قصے مشہور کر رکھے تھے، وہ محض قصے ہی تھے۔ اس کے باپ نے درحقیقت اس کے لئے صرف پانچ سو ڈالر چھوڑے تھے۔ ظاہر ہے اس کے بعد اس کے رہن بہن کے بارے میں یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ شاید وہ زیادہ ہی خطرناک کاموں میں ہاتھ ڈالنے لگا تھا۔ کچھ یوٹیلڈ نہیں تھا کہ وہ خطرناک جرائم پیشہ گروہوں کو بھی بلیک میل کرتا ہو یا کسی اور طرح ان کے مالی معاملات میں مداخلت ہو گیا ہو۔

بہر حال اس کے اخبار کی ہمدردیاں پھر بھی اس کے ساتھ تھیں۔ ”ٹریبون“ نے اس کے قاتل کی گرفتاری میں مدد دینے والے کے لیے پچیس ہزار ڈالر انعام کا اعلان کیا۔ کچھ اور اخبارات نے بھی اس میں رقم شامل کر دی۔ اخبارات نے اس طرح گویا جبکہ لنک کے قاتل کو تلاش کرانے کی اپنی ہی کوشش کی۔

جبکہ لنک کے قتل کے معاملے نے بہت طویل کھینچا۔ کئی گروہوں کے سرغنہ قیادت کی زد میں آنے لگی کہ لنک ان پر بھی اس قتل کے سلسلے میں شہ کیا گیا مگر کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکلا۔

اس دوران لنک کی شہرت کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ شکار گوانے والوں کے لئے یہ گویا بڑی شرم کی بات ہوتی تھی کہ وہ اس شہر میں آئیں اور لنک ان کو دیکھے بغیر چلے جائیں۔ اس کی یا اس کی گاڑی کی کم از کم ایک جھلک دیکھنا لازمی سمجھا جاتا تھا۔

بڑے بڑے اداکار اور ہر شعبہ زندگی کے ممتاز افراد اس سے مراسم رکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس سے تعلق کا اظہار کرنے میں لوگوں کو کم از کم یہ فائدہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ انہیں کوئی تنگ نہیں کرتا تھا۔ لنک کی شخصیت کا یہ پہلو بھی دلچسپ تھا کہ بعض اخبارات اسے انتہائی شقی القلب، درندہ صفت اور نہ جانے کیا کیا قرار دے چکے تھے مگر سماجی زندگی میں اس کے رفیق القلب ہونے کا یہ عالم تھا کہ بعض اسٹج ڈراموں میں المیہ مناظر اور کسی کی متاثر کن المیہ اداکاری دیکھ کر زار و تظار روئے لگتا تھا۔

اچھی اداکاری پر اگر وہ کسی اداکار سے متاثر ہو جاتا تھا تو وہ خود بخود اس کے دوستوں میں شمار ہونے لگتا تھا پھر اسے بڑے سے بڑا ہمدشاں بھی تنگ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی اس سے بدتمیز نہیں مانگ سکتا تھا اسے گویا مکمل تحفظ حاصل ہو جاتا تھا۔

اس عرصے میں لنک کی چوری کی تحقیقات کا کام چپکے چپکے جاری تھا۔ دہلیسے اب یہ معاملہ کچھ ایسا راز نہیں رہا تھا۔ لنک کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ انہیں کے مجھے میں اس کی دولت کے بارے میں زبردست پکڑی پکڑی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ حکومت نے اس سلسلے میں دس آفیسرز پر مشتمل ایک خاص گروپ تشکیل دیا تھا۔ ان آفیسرز کے بارے میں مجھے کو یقین تھا کہ انہیں خریدنا جاسکتا تھا اور نہ ہی خوف زدہ کیا جاسکتا تھا، وہ ہر قیمت پر اور ہر صورت میں اپنے فرائض ادا کرنے والے لوگ تھے۔

ان کے ذمے کئی خاص خاص گروہوں کے مالی معاملات کو کھنگالنے کا کام لگایا گیا تھا۔ لنک کی مالی معاملات کے بارے میں خاص طور پر جوائنر سمجھان بین کر رہا تھا، اس کا نام نہیں تھا۔ لنک کو بھی اس کے بارے میں علم ہو چکا تھا اور وہ اس سے سووے بازی کی کوشش بھی کر چکا تھا مگر نا کام رہا تھا۔

لنک انہیں کے مسائل سے بچنے کے لئے اس سے پہلے جن آفیسرز کے ساتھ بنا کر رکھتا تھا، ان کی خدمت میں باقاعدگی سے رقوم بھجواتا تھا، وہ رقوم زیادہ بڑی نہیں ہوتی تھیں۔ رقوم کے ساتھ لنک کی دہشت بھی شامل ہوتی تھی، اس لئے معاملات ہمارا انداز میں چل رہے تھے۔ لنک نے اس سے دس گنا زیادہ رقم کی پیشکش کر کے انہیں کے ساتھ معاملہ کرنے کی کوشش کی مگر اسے مایوسی ہوئی۔ مایوس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ حیران ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکا اس کے لئے تو گویا یہ تصور ہی ناقابل قبول تھا کہ کوئی آدمی ناقابل فروخت بھی ہو سکتا تھا۔

لنک کی بعد دوسری طرف نہیں کے حیران ہونے کی باری تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لنک ان کو اپنی بات کے جواب میں انکار سننے کی عادت نہیں تھی۔ جب کوئی آدمی اس کی فیاضانہ پیشکش کو منکر اور دیتا تھا تو اس کے بعد لنک ان کے پاس اسے سبق سکھانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ جاتا تھا اور وہ اس کی زندگی کا آخری سبق ہوتا تھا اس کے بعد لنک ان سے دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کر دیتا تھا۔

نہیں بھی منتظر رہا کہ شاید دس قاتل اس تک پہنچے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسی دوران لنک کی بہن میفلڈ کی شادی ہو گئی۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ کم از کم لڑکے کی حد تک یہ زبردستی کی شادی تھی۔ وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا کسی وجہ سے اسے میفلڈ اسے شادی کرنا پڑی لیکن میفلڈ کا کہنا تھا کہ وہ دونوں بچپن کے ساتھی تھے اور بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ شادی کے وقت دولہا کی عمر 21 سال اور دلہن کی 19 سال تھی۔

ظاہر ہے یہ کوئی عامی شادی نہیں تھی۔ لنک کی بہن کی شادی تھی۔ چنانچہ خوب دھوم دھام سے ہوئی شادی کا ایک بحری جہاز کی ساخت کا تھا۔ گیارہ فٹ لمبا، چار فٹ اونچا اور تین فٹ چوڑا تھا۔ اس پر ”ہٹالو“ لکھا ہوا تھا یعنی مون کے لئے دولہا دلہن کو ہٹالو لہی جاتا تھا۔ شادی کا ایک ان کے بحری سفر کی علامت تھا۔ لنک کی بھائی رالف کے کلب میں اس شادی کا جشن تمام رات جاری رہا۔ شادی کے تحفے کے طور پر لنک نے دولہا کو پچاس ہزار ڈالر دیے۔

اس دوران انہیں کے مجھے نے لنک کی خلاف کیس چلانے کی تیاریاں مکمل کر لیں اور آخر کار اس کے نام شکار گویا عدالت سے سن جاری ہو گئے۔ لنک نے ذرا بھی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اسے گرفتاری کا خطرہ محسوس ہوا تو اس نے خانت قبل از گرفتاری کر لی۔ پچاس ہزار ڈالر کی خانت پر وہ عدالت کے ہر بلاوے پر حاضر ہونے لگا۔ ہر پیشی پر وہ معمول کے مطابق نہایت خوش لباس دکھائی دیتا۔

مقدمے کے دوران ایک رات وہ چند جرائم پیشہ افراد کے ساتھ ایک ٹائٹ کلب میں ناش کھیل رہا تھا۔ اس کے ساتھ کھیلنے والے اسی قسم کے جرائم پیشہ افراد تھے جو بظاہر معزز دکھائی دیتے تھے، ان میں بھلارنی ایک عمر رسیدہ شخص بھی تھا۔ ہٹلر کو بڑھاپے اور پیاروں نے اب کافی حد تک ناکارہ کر دیا تھا اور اس کی حالت کچھ قابل رحم نظر آتی تھی لیکن کچھ عرصے پہلے تک وہ جرائم کے میدان میں نہایت متحرک رہا تھا۔ زندگی کی رنگینوں میں سے وہ اپنا حصہ مستعدی سے وصول کرتا رہا تھا۔

وہ لنک کی بھی قریبی شاساؤں میں سے تھا کہ اس نے کبھی لنک کی لئے باقاعدہ خدمات انجام نہیں دی تھیں لیکن وہ اس کے بہت سے معاملات سے خاصی آگاہی رکھتا تھا۔ لنک ان کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا رہا تھا جس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ وہ اس وقت بیٹھا اس کے ساتھ ناش کھیل رہا تھا۔

جب محفل برخواست ہوئی تو ہٹلر اپنی پرانی سی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ وہ شہر کے نواح میں چھوٹے سے ایک فارم پر چھوڑے سے کچھ بہتر مکان میں رہتا تھا۔ کلب سے اس کے روانہ ہونے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کی کسی شاسا عورت نے اس سے کوئی ٹیلیفون نمبر معلوم کرنے کے لئے اسے فون کیا تو وہ ہٹلر کے بجائے کسی اور کی غرائی ہوئی بھاری سی آواز سن کر حیران رہ گیا۔

”کیا ہے..... کون بول رہا ہے؟“ ہٹلر نے آواز دے کر دریافت کیا۔

ہٹلر کی شاسا عورت فوری طور پر کچھ بھی نہ بولی تھی۔ اس آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ عورت کی اپنی آواز گنگے میں انگ کر رہ گئی۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد دوسری طرف ریسپونڈ دیا گیا۔

اسی رات کسی دہائیہ گئے فائر بریگیڈ کو اطلاع دی کہ اس نے شہر کے نواح سے گزرتے وقت ایک جگہ شعلے بلند ہوتے دیکھے ہیں۔ فائر بریگیڈ والے اس کے بتائے ہوئے محل وقوع کے مطابق وہاں پہنچے تو انہوں نے اجڑے ہوئے ایک چھوٹے سے فارم پر ایک مکان کو تقریباً خاستر حالت میں پایا۔

اس مکان سے ایک لاش برآمد ہوئی۔ لاش جل کر کوئلہ ہو چکی تھی۔ ایک آدھ نشانی سے بڑی مشکل سے ملے ہوا کہ وہ ہٹلر کی لاش تھی۔ اس کی کارڈر فارم پر کھڑی مل گئی لیکن وہ بھی آگ سے جاہ ہو چکی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر ایک ریلواری بھی پڑا تھا جس کی چھ گولیاں آگ کی وجہ سے چل چکی تھیں، وہ ہٹلر کا اپنا ہتول تھا مگر اس کے کسی کام نہیں آ سکا تھا۔

ہٹلر کی موت کی صحیح وجوہ بھی کبھی سامنے نہیں آ سکی اور نہ ہی اس کا قاتل پکڑا جاسکا۔ پولیس کو یہ یقین تھا کہ اس کے مکان میں آگ لگنا کوئی حادثہ نہیں تھا لیکن وہ اس کے ذمے دار تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

لنک کی بارے میں تحقیقی مواد جمع کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ ”کارنامہ“ بھی لنک ہی کا ہو سکتا تھا کیونکہ ہٹلر نے آستین کے سانپ کا کردار ادا کرتے ہوئے انہیں کے مجھے کوئلہ لکھا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ لوگ مقامات اور کن شہروں سے لنک کی آمدنی کے بارے میں دستاویزی ثبوت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ خط مقدمے کی کارروائی کے دوران لنک کی نظر میں آ گیا تھا۔ اسے یقیناً ہٹلر آستین کا سانپ ہی معلوم ہوا ہوگا اور آستین کے سانپوں کے لئے اس کے ہاں سزاویہ سخت تھی۔

انہیں کا مقدمہ طویل کھینچ رہا تھا۔ مجھے نے مجموعی طور پر لنک کی پابکیں الزامات عائد کئے تھے جو سب کے سب انہیں چوری اور آمدنی چھپانے ہی سے متعلق تھے۔ مجھے نے اس کے خلاف دستاویزی ثبوت جمع کرنے میں بڑی محنت کی تھی اور بہت عرق ریزی سے شہادتیں جمع کی تھیں جن میں ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کی بہت سی ریکارڈنگز بھی شامل تھیں۔ لنک کی نہایت صبر و سکون سے مقدمے کا سامنا کر رہا تھا۔ اس دوران سرکاری افسروں اور گواہوں کو اس کی طرف سے رشوت کی پیشکش اور دھمکانے جانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ظاہر ہے یہ سب باتیں نہایت خفیہ انداز میں ہوتی تھیں اور کچھ ایسے طریقے اختیار کئے جاتے تھے کہ لنک ان پر ان کو شکوں کا الزام نہ آ سکے۔ ایک جگہ کو چندہ لاکھ ڈالر تک کی رشوت کی پیشکش کی گئی۔ اس کے عوض اسے اپنے فیصلے میں کوئی ایسا موصول رکھنا تھا کہ لنک ان اس کی وجہ سے جیل جانے سے بچ جائے۔

چندہ لاکھ ڈالر اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی اور اس پیشکش کو منکرانے کے لئے بڑے خصلے اور مضبوط قوت ارادی کی ضرورت تھی مگر آزمائشوں پر پورا اترنے والے انسان ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ اس دور میں بھی پائے جاتے تھے۔ جج صاحب نے انکار کر دیا۔ مقدمہ چلتا رہا۔

اس دوران لنک کی نے اخبارات کو یہ بیان بھی دیا۔ ”اگر میں جیل چلا گیا تو چھوٹے چھوٹے گروہ اس شہر میں شرفاء کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔“

مقدمے کی سماعت میں وقفہ آتا تھا تو چوری کے ارکان کو عدالت کے قریب ہی سرکاری خرچ پر ایک ہوٹل میں ٹھہرایا جاتا تھا جہاں سے وہ کسی کو فون نہیں کر سکتے تھے، اپنے ساتھ کوئی رسالہ یا اخبار نہیں لے جاسکتے تھے۔ یہ احتیاط اس لئے کیا جاتی تھی کہ لنک ان کا گروہ چوری کے کسی رکن کو کوئی پیغام دینے کے لئے پریس کو استعمال نہ کر رہا ہو۔

انہیں کا کلید اور اسٹینٹ انٹارنی کے دفتر کے لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے لوگوں کو عدالت میں لا رہے تھے جنہیں لنک ان سے کوئی شکایت یا پر خاش رہی تھی اور جن کی گواہی اس کے لئے ذرا بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس دوران لنک ان کے وکیل صفائی کی طرف سے یہ دلچسپ جملہ بھی سننے میں آیا۔ ”انہیں چوری انسان کی فطرت میں شامل ہے۔“

انہیں کا مقدمہ اپنی جگہ درحقیقت بہت سے مقدموں کا مجموعہ تھا۔ ابھی وہ چل ہی رہا تھا کہ اس میں ایک اور الزام کا اضافہ ہو گیا۔ ایک روز عدالت کے ایک اہلکار نے لنک ان کی بیٹھک میں کچھلی طرف پھنسا ہوا اور کوٹ کے نیچے چھپا ہوا ایک ہتول برآمد کر لیا۔ عدالت میں..... اور وہ بھی گریڈ چوری کے سامنے ہتول لے کر آئی تھی ایک سنگین جرم تھا۔ لنک ان کے پاس گو کہ اس ہتول کا لائسنس موجود تھا لیکن بد قسمتی سے اس کی میعاد ختم ہوئے چند روز گزر چکے تھے اور اس کا ملازم اس کی تجدید کرنا موصول کیا تھا۔ اگر لنک ان کا لائسنس کارآمد ہوتا تب بھی کچھ زیادہ فرق نہ پڑتا۔ عدالت میں اور وہ بھی گریڈ چوری کی موجودگی میں انہیں ہتھیار لے کر آنا ایک سنگین جرم تھا۔

لنک ان کے مقدموں میں ایک مقدمہ یہ بھی شامل ہو گیا۔ لنک ان ان دنوں اندری اندر پریشان تھا لیکن وہ اپنی پریشانی ذرا بھی ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ ہر پیشی پر حسب معمول عمدہ لباس میں تروتازہ چہرے کے ساتھ ہنستا مسکراتا عدالت میں آتا اور خوش مزاجی سے ہر سوال کا جواب دیتا۔

نواہ مقدمہ چلتا رہا۔ یہ امر کی تاریخ کا اس وقت تک کا پہلا مقدمہ تھا جس نے اتنا طویل کھینچا۔ آخری پیشی پر چوری فیصلہ کرنے کے لئے بند کرے میں گئی تو اسے سوچ بچار میں آٹھ گھنٹے لگ گئے۔

آخر کار چوری واپس آئی اور تمام ارکان کی آراء کی روشنی میں جج صاحب نے فیصلہ سنایا۔ لنک ان کو مجموعی طور پر گیارہ سال قید اور ایک لاکھ ڈالر جرمانے کی سزا ہوئی۔ ڈھائی لاکھ ڈالر اسے انہیں کی مدد میں ادا کرنے تھے۔ اس کے علاوہ اس طویل مقدمے کے تمام اخراجات بھی اسی کے سر ڈالے گئے۔

(جاری ہے)

کی عمر میں وہ ”ٹریبون“ اخبار میں بارہ ڈالر فی ہفتہ تنخواہ پر پروف ریڈر کے طور پر بھرتی ہو گیا۔ مزید تعلیم اور تجربے کے بعد وہ جلد ہی زیر تربیت پورٹر کے طور پر کام کرنے لگا۔

ایک طویل عرصے تک کام کرنے کے باوجود وہ کبھی باقاعدہ رپورٹر نہیں بن سکا کیونکہ اس میں لکھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ وہ خوب بھاگ دوڑ کر لیتا تھا، تمام حقائق کھود کر نکال لاتا تھا لیکن اس کی خبر یا رپورٹ براہ راست نہیں چھپ سکتی تھی۔ کسی نہ کسی کو اسے ازسر نو لکھنا پڑتا تھا۔

اس کے باوجود اسے کام کا آدمی سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ نہ جانے کس طرح اور کہاں کہاں سے نہایت سنسنی خیز حقائق ڈھونڈ نکال لاتا تھا۔ 1930ء میں اس کی عمر 38 سال سے کچھ اوپر اور تنخواہ 65 ڈالر فی ہفتہ ہو چکی تھی، وہ اب ایک کرائم رپورٹر کا اسٹنٹ تھا۔ زیادہ تر کرائم رپورٹرز بھاگ دوڑ کے لئے ایک اسٹنٹ رکھ لیتے ہیں۔ جبکہ لنک بھی اسی قسم کا اسٹنٹ تھا، اسے خود خبریں بنانا اور لکھنا اب بھی نہیں آیا تھا۔

لیکن وہ عام اور معمولی اسٹنٹ نہیں تھا۔ اس کی خصوصیات الگ ہی تھیں۔ وہ صرف پولیس اسٹیشن کے پکڑ نہیں لگتا تھا جیسا کہ عام طور پر کرائم رپورٹرز یا ان کے اسٹنٹ کیا کرتے تھے بلکہ وہ پورے شہر کی خاک چھانٹتا تھا۔ ہر جگہ سے خاص خبریں ڈھونڈ کر لاتا تھا اور اسٹنٹ ہونے کے باوجود اس کے تعلقات ہر شعبہ زندگی کے چھوٹے بڑے لوگوں سے تھے۔ خبریں حاصل کرنے کے لئے وہ گھریلو ملازموں تک سے دوستی رکھتا تھا اور دوسری طرف اس کی دوستی ان لوگوں کے گورنر تک سے تھی۔

اسٹینٹ انٹارنی اور پولیس چیف بھی اس کے دوستوں میں شامل تھے۔ پولیس چیف تو سب کے سامنے کہا کرتا تھا۔ ”جبکہ لنک میرے لئے بیٹوں کی طرح ہے۔“

نہایت اعلیٰ پیمانے کی تقریبات میں اسے بلایا جاتا تھا۔ اس کا رہن سہن اور اخراجات بھی شاہانہ تھے۔ وہ ریس کا رسیا تھا۔ تنخواہ تو اس کی 65 ڈالر فی ہفتہ تھی لیکن ریس میں وہ ایک ایک دن میں ہزار ہزار ڈالر بھی ہار جاتا تھا۔

وہ کیوڑن میں سخر کرتا تھا جسے ڈرائیور چلاتا تھا اور یہ گاڑی یا ڈرائیور اسے دفتر کی طرف سے نہیں ملتا تھا، یہ بندوبست اس نے اپنی جیب سے کیا ہوا تھا۔ مگر اس کا ذاتی تھا اور خاصا شاندار تھا۔ اس میں اس کی بیوی، دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی لیکن لنک نے ایک شاندار ہوٹل میں ایک سوئٹ بھی لیا ہوا تھا تاہم اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ بیوی سے اس کی ناچاقی تھی یا وہ گھر نہیں جاتا تھا۔

اس کی گھریلو زندگی پر سکون تھی اور بیوی بچوں سے اس کے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے کسی بھی اچھے شوہر اور اچھے باپ کے ہو سکتے ہیں۔ ہوٹل میں سوئٹ اس نے اپنی ”کاروباری“ اور پیشہ ورانہ مصروفیات میں سہولت کے لئے لیا ہوا تھا۔ وہ اپنے اس معیار زندگی کا جواز یہ پیش کرتا تھا کہ وہ خاندانی طور پر ایک کھانا پیتا آدمی تھا اور باپ سے اسے ورثے میں بہت کچھ ملتا تھا۔ وہ اخبار کے لئے کام تنخواہ کے لئے نہیں کرتا تھا بلکہ یہ اس کا شوق تھا۔

جبکہ لنک کا اعلیٰ معیار زندگی 1929ء کے اقتصادی بحران کے دوران بھی برقرار رہا تھا۔ بڑے بڑے مجرم بھی اس کے ذاتی دوستوں کی فہرست میں شامل تھے۔ اس کا اخبار اسے اپنے ”ہوشیار ترین“ رپورٹر میں شمار کرتا تھا۔ لنک ان بھی اسے اندر دبوچنے سے انکار نہیں کرتا تھا۔

تاہم لنک ان کی جیل سے رہائی کے موقع پر بھی اندر جبر سے رہا تھا۔ وہ بھی جیل کے گیٹ پر انتظار کرتا رہ گیا تھا اور اسے پتا نہیں چلتا تھا کہ لنک ان کہاں گیا؟ لیکن وہ واحد رپورٹر تھا جس نے لنک ان کے بھائی رالف کو فون کیا اور اس کے غصے سے پوچھا تھا۔ ”لنک ان کہاں ہے؟ میں اسے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

رالف ان دنوں خانت پر رہا تھا۔ لنک ایسا واحد آدمی تھا جس نے غصے میں رالف سے بات کی تھی اور رالف نے اسے قتل سے جواب دیا۔ ”مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ لنک ان کہاں ہے لگ..... جیل سے نکلنے کے بارے میں اس نے مجھے کوئی اطلاع نہیں دی اور ابھی تک مجھے اس کی کوئی خبر نہیں۔“

”اس نے تو مجھے شرمندہ کر دیا۔“ لنک بولا۔ ”میرا اخبار تو یہی بھٹتا ہے کہ میں ایسے معاملات میں سب سے زیادہ باخبر آدمی ہوں، جیسے ہی اس کا کچھ پتا چلے، مجھے فوراً اطلاع دیتا۔“

”میں ضرور اطلاع دوں گا۔“ رالف نے سعادت مندی سے کہا۔ اس کے فون ان دنوں ٹیپ ہو رہے تھے اور فون ٹیپ کرنے والے یہ ریکارڈنگز سن کر حیران تھے کہ یہ کس قسم کا ”اسٹنٹ رپورٹر“ ہے جو لنک ان کے بارے میں اتنے غصے سے بات کر رہا ہے اور لنک ان کا بھائی اسے اتنی نرمی سے جواب دے رہا ہے۔

بعض لوگ اسے شکار گویا غیر رسمی پولیس چیف بھی کہتے تھے۔ اس کے طاقتور ہونے کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے جو سنیزر لائن کے ساتھ پیش آیا۔ لائن ایک نہایت بارعب سنیزر تھا۔ بعض لوگ اسے سنیزر کے بجائے ”باس“ بھی کہتے تھے۔ وہ جس مجھے میں بھی جلاتا تھا، کوئی اس کے کام سے انکار نہیں کرتا تھا۔

ایک بار اس نے ایک کلب کھولنے کا ارادہ کیا اور اجازت نامہ لینے کے لئے اسٹینٹ انٹارنی کے دفتر بھی چلا گیا۔ باقی تمام ضروری اجازت نامے وہ لے چکا تھا۔ اسٹینٹ انٹارنی اسے کسی وجہ سے اجازت نامہ دینا نہیں چاہتا تھا لیکن سنیزر کے سامنے اسے انکار کرنے کی جرأت بھی نہیں تھی۔ اس نے گول مول ہی بات کی۔

سنیزر نے اسے اجازت ہی سمجھا اور پروگرام کے مطابق مقررہ تاریخ پر کلب کا افتتاح کر دیا لیکن دوسرے ہی روز اس کے کلب پر چھاپے پڑ گیا اور اسے بند کر دیا گیا۔ الزام تھا کہ اس نے اسٹینٹ انٹارنی سے باقاعدہ تحریری اجازت نامہ نہیں لیا تھا۔

اسے پتہ چلا کہ اس سارے پکڑ کے پیچھے جبکہ لنک کا ہاتھ تھا اور آخر کار سنیزر صاحب کو 65 ڈالر فی ہفتہ تنخواہ لینے والے اس اسٹنٹ رپورٹر کو فون کرنا ہی پڑا۔

”میں نے سنا ہے کہ تمہیں میرے کلب پر چھاپے پڑنے کی اصل وجہ معلوم ہے؟“ سنیزر نے غصے سے کہا۔

”اس کی وجہ بہت سیدھی سی ہے۔“ لنک نے اس کے غصے سے ذرا بھی مرعوب ہونے بغیر کہا۔ ”تم نے اسٹینٹ انٹارنی سے اجازت نامہ نہیں لیا تھا۔“

”میں نے اس سے پوچھا تھا۔ اس نے مجھے منع بھی نہیں کیا تھا۔“ سنیزر مزید غصے سے بولا۔

”لیکن تحریری اجازت تو قانونی طور پر ضروری ہے، وہ تو تمہیں لینا ہی پڑے گی، اگر سنیزر ہی قانون کی پابندی نہیں کریں گے تو اور کون



الکھون کو گیارہ سال کی جوسزائے قید ہوئی تھی۔ اس میں سے دس سال اسے وفاقی انتظامات کے تحت قائم کی گئی جیل میں اور ایک سال کاؤنٹی کی جیل میں گزارنا تھا۔ جس روز اسے سزا سنائی گئی، اس روز بھی ایک علاقے میں اس کے مخالف گروہ کے ایک آدمی کو گولی مار دی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ الکھون خواہ جیل میں رہے یا جیل سے باہر..... اس کے تمام

اس کے ساتھ میں ہے اور وہ اندر بیٹھا سارا نظام چلا رہا ہے۔ اسے جیل میں تمام سہولتیں حاصل ہیں۔ وہ ایک ایسے کمرے میں رہ رہا ہے جس میں آٹھ قیدیوں کی گنجائش ہے، اگر اسی کو جیل کہتے ہیں تو پھر امریکا کے تمام شرفاء کو بھی جیل میں ڈال دیتا ہے۔ جب جج صاحب کو اس طرح کے کافی لمبی گرام موصول ہو چکے اور اخباروں میں خبریں بھی چھپنے لگیں تو جج صاحب نے جیل کے وارڈن



وہندے جس طرح چل رہے تھے، اسی طرح چلتے رہیں گے۔ ”چلو آخر کار معاملہ اپنے اختتام کو پہنچ ہی گیا۔“ الکھون نے مقدمے کا فیصلہ سننے کے بعد گہری سانس لے کر کہا۔

”مجھے افسوس ہے.....“ اس کے ایک وکیل نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز گویا گھٹے میں اکھ رہی تھی۔ ”ہم نے اپنی ہی کوشش کی۔“

”مجھے تم لوگوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ الکھون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایک مارشل اور چند بڑی مارشل اسے گھیرے میں لینے کے لئے آگے بڑھے۔ اسی دوران نگین کے جھگے کا ایک اہلکار ایک کاغذ ہاتھ میں لہراتا ہوا تیزی سے الکھون کی طرف لپکا اور بولا۔ ”مسٹر الکھون! آپ کو اس پر دستخط کرنا ہوں گے تاکہ اس رقم کی ادائیگی ہو سکے۔“

الکھون نے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک پاؤں اوپر اٹھایا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ سخت غصہ میں ہے اور اس شخص کو لات رسید کرنے لگا ہے۔ ڈپٹی مارشلز نے جلدی سے اسے قابو میں کیا اور لات چلانے سے باز رکھا۔

وہ نیچے آیا تو اخباری فوٹو گرافر اس کے منتظر تھے۔ الکھون قدرے افسردہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ میری بہت ہی تصویریں بنا لو، اب ایک طویل عرصے تک تم سے ملاقات نہیں ہوگی۔“

پھر وہ پولیس کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے بولا۔ ”مطلعی میری اپنی تھی۔ مجھے شہرت حاصل نہیں کرنی چاہئے تھی۔ انسان زیادہ شہرت حاصل کرتا ہے تو پھر وہ بدنام بھی ہوتا ہے۔ آدمی چاہے کچھ بھی کرتا پھرے لیکن اسے بدنام نہیں ہونا چاہئے۔ بدنامی کی وجہ سے انسان جلد دوسروں کی نظر میں آ جاتا ہے۔ دنیا میں لاکھوں لوگ نہ جانے کیا کچھ کرتے پھر رہے ہیں لیکن وہ چونکہ بدنام نہیں ہیں اس لئے حکومتوں کو یا معاشرے کی اصلاح کرنے والوں کو ان کی کوئی نظر نہیں ہے۔ کوئی ان کی طرف دیکھتا تک نہیں لیکن مجھ جیسا آدمی سب کی نظر میں آ جاتا ہے۔“

وہ جب جیل پہنچا تو وہاں بھی رپورٹرز اس کے منتظر تھے۔ کسی نے پوچھا۔ ”اپنی سزا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”مجھے سزا سنانے کے معاملے میں کئی گنگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔“ اس نے بلاتامل جواب دیا۔ پھر وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ”لیکن، بہر حال..... اگر مجھے سزا کا کئی ہی ہے تو میں خوش دلی اور حوصلے سے کاٹوں گا۔“

جب اسے ابتدائی اور عارضی طور پر ایک کوٹھری میں لے جایا گیا تو رپورٹرز اور فوٹو گرافرز وہاں بھی پہنچ گئے لیکن اس نے ایک کونے میں بیٹھنے سے انہیں سب سے درخواست کی۔ ”تم لوگ یہاں میری کوئی تصویر نہ کھینچنا، میری بیوی، بیٹے اور بہن کو ایسی تصویر دیکھ کر صدمہ ہوگا۔“

اسے اس کی اصل کوٹھری میں لے جایا گیا تو ایک فوٹو گرافر کسی نہ کسی طرح وہاں بھی پہنچ گیا اور تصویر بنانے کی کوشش کرنے لگا جب الکھون ایک بائلی اٹھا کر اس کی طرف لپکا اور دھاڑا۔ ”میں تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گا۔“

جیل کے گاڑنے اسے پکڑا اور بڑی مشکل سے قابو میں کیا۔ الکھون کا غصہ دور دور تک مشہور تھا۔ بعض اوقات تو وہ غصے کا مظاہرہ بھی نہیں کرتا تھا بلکہ کچھ خاص انداز میں کسی کی طرف دیکھتا تھا تو وہ دہشت زدہ ہو جاتا تھا۔

ایک بار ایک خاتون صحافی اس سے تفصیلی انٹرویو لینے اس کے میاں والے مکان پر گئی تھی۔ وہ الکھون کی شخصیت اور کاروبار کے منفی پہلوؤں سے قطع نظر اس سے بہت متاثر ہوئی تھی۔

اس نے اپنے تفصیلی انٹرویو میں ایک جگہ لکھا تھا۔ ”اس کی آنکھوں میں شیر کی سی چمک ہے، اگر وہ کسی کی طرف چند سیکنڈ کے لئے ایک نکل دیکھے اور اس وقت اس کے دل میں غصہ ہو تو سامنے والے کی رگوں میں لہوسر دو جاتا ہے۔“

الکھون جیل ضرور پہنچ گیا تھا لیکن اس کے وکیل ابھی تک اس کے لئے قانونی جنگ لڑ رہے تھے اور انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ الکھون کی مختلف ٹویٹوں کی اپیلیں اعلیٰ عدالتوں میں زیر سماعت تھیں۔

الکھون رفتہ رفتہ جیل میں سیٹ ہو گیا بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ کچھ زیادہ ہی سیٹ ہو گیا۔ اسے جیل کے اسپتال سے ملحق ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہ کمرہ اسپتال کا حصہ تو نہیں تھا لیکن اس میں ایسے قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کا علاج ہو چکا ہوتا تھا لیکن وہ اپنی صحت کی مکمل بحالی کا انتظار کر رہے ہوتے تھے۔

الکھون اس کمرے میں حیرے سے رہ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے گروہ کے خاص خاص لوگ بھی اس سے ملنے کے لئے آئے گئے تھے۔ وہ ان سے اپنے دھندوں کی ساری رپورٹ لیتا اور انہیں ضروری ہدایات دیتا۔ باقاعدہ کاغذی کارروائیاں بھی ہوتیں۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ اسے جیل میں بیکٹری کی سہولت بھی حاصل تھی۔

الکھون جیل میں بیٹھ کر بھی اپنے گروہ کو اسی طرح چلا رہا تھا جس طرح باہر رہ کر چلاتا تھا۔ تمام معاملات پر اس کا کنٹرول تھا۔ جیل میں اس کی ”زیر صدارت“ گروہ کے خاص خاص لوگوں کے اجلاس بھی ہوتے تھے۔ زیادہ سکون سے اپنا اجلاس منعقد کرنے کے لئے یہ لوگ وہ کوٹھری استعمال کرتے تھے جس میں سزائے موت کے قیدیوں کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ الکھون اسی کرسی پر بیٹھ کر اجلاس کی صدارت کرتا تھا۔

کچھ عرصے بعد ایک متعلقہ جج کو اس صورت حال کے بارے میں فرضی ناموں سے لمبی گرام موصول ہونے لگے کہ جیل کے باہر اکثر الکھون کے گروہ کی گاڑیاں کھڑی نظر آتی ہیں۔ گروہ کا کنٹرول بدستور

سے جواب طلب کیا۔ جیل کے وارڈن نے اس سلسلے میں ضابطے کی کارروائی کے مطابق جو تحریری جواب دیا، وہ اپنی جگہ تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں ایک پریس کانفرنس کا بھی انتظام کر لیا۔ اس نے اخباری رپورٹرز کو دعوت دی کہ وہ خود آ کر دیکھ لیں کہ الکھون جیل میں کس حال میں رہ رہا تھا۔

رپورٹرز جب وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ الکھون ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بیٹھا تھا، جہاں اسے صحیح معنوں میں انسانوں کی طرح رہنے کی سہولتیں بھی پوری طرح حاصل نہیں تھیں۔ وہ وہاں سوگوار کی صورت بنائے بیٹھا تھا۔ اس کا شیوہ حابو تھا۔

رپورٹرز سے باتیں کرتے ہوئے اس نے تاسف زدہ سے لہجے میں کہا۔ ”جو لوگ کہتے ہیں کہ میں یہاں عیش سے رہ رہا ہوں، میری دعا ہے کہ انہیں بھی کافی عرصے کے لئے اس کوٹھری میں رہنے کا موقع میسر آئے تاکہ وہ بھی یہاں کی آسائشوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔“

انہی دنوں نیوز جری کے ایک دولت مند اور باسوش آدمی کا شیرخوار بچہ اغوا ہو گیا۔ اعزازہ یہی لگایا جا رہا تھا کہ اسے تاوان کے لئے اغوا کیا گیا ہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا اور نہ ہی تاوان کا کوئی مطالبہ سامنے آیا تھا۔ غزوہ خاندان پر جو گزر رہی تھی، اس کے بارے میں روز اخبارات میں خبریں چھپ رہی تھیں اور ریڈیو سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔

الکھون نے اپنی طرف سے بھی اعلان کر دیا کہ وہ بیچے کی بازیابی کے سلسلے میں کوئی بھی کارآمد اطلاع دینے والے کو دس ہزار ڈالر انعام دے گا۔ اس پیش کش کی وجہ سے ایک باہر اس کا ذرشت انداز میں اخبارات میں آئے لگا اور دے دے لفظوں میں اسے انسانیت کا ہمدرد قرار دیا جانے لگا۔

الکھون نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ جب مزید چند روز تک بیچے کا کچھ پتا نہ چلا تو اس نے اعلان کیا کہ اگر اسے صرف چند دنوں کے لئے کسی قانون کا سہارا لے کر جبرول پر رہا کر دیا جائے تو وہ بیچے کو بازیاب کر سکتا ہے۔

اس کا کہنا تھا۔ ”مجھے جیسے لوگوں کے کچھ خصوصی ذرائع اور وسائل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بعض ایسے مسائل سے نمٹ سکتے ہیں جن سے پولیس بھی نہیں نمٹ پاتی۔ مجھے صرف چند دن کے لئے جبرول پر باہر جانے دیا جائے تو میں بیچے کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں ضمانت کے طور پر اپنے بھائی کو جیل میں چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ ظاہر ہے میں اپنے بھائی کو تو قربانی کا بکرا بنا کر کہیں نہیں بھاگ سکتا۔ میں بھاری رقم بھی ضمانت کے طور پر جمع کرانے کے لئے تیار ہوں۔“

جذبہ ہمدردی اور انسانیت سے لبریز اس کی اس اپیل پر حکام کو غور کرنا پڑا لیکن طویل غور و خوض کے بعد یہی فیصلہ کیا گیا کہ اس پیشکش کو قبول نہ کیا جائے۔ شاید حکام نے یہی سوچا کہ بڑی مشکل سے تو وہ اس شخص کو اندر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اب اسے باہر بھیجے کا خطرہ مول نہ ہی لیا جائے تو بہتر ہے۔

خبریں سننے میں آئیں کہ اس دوران بیچے کے پریشان حال والدین نے پچاس ہزار ڈالر تاوان بھی ادا کر دیا لیکن بچہ بھی نہیں نہ مل سکا۔ حقیقت یہ تھی کہ بیچے کو تاوان کی ادائیگی سے تین دن قبل ہی قتل کیا جا چکا تھا۔

الکھون نے جیل میں رپورٹرز کے سامنے اپنی ”حالت زار“ کا ڈراما رچا کر وقتی طور پر توجہ نہیں مبطن کر دیا تھا لیکن ظاہر ہے یہ ڈرامہ ہمیشہ اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ جیل میں رہنے کا اس کا انداز بہر حال وہی تھا جس کے بارے میں باہر خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔

وہ واقعی اس کمرے میں رہ رہا تھا جس میں آٹھ قیدیوں کی گنجائش تھی۔ اس میں اس کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کے پاس بنیادوں اور انڈرویزز سمیت شیووں جوڑے کپڑوں کے تھے۔ پچاسوں جوڑے جرابوں کے تھے۔ بہت سے نرم عینے اور بستروں کی چادریں تھیں۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔

اس کا بسترا آرام دہ تھا۔ جیل کے گاڑے زکوہ اپنے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے صاف کرنے کا حکم دے دیتا تھا۔ اس کے پاس شیوگ کا سامان، غسل کے بعد پینے کا گاڈون، فینس کے جوتے اور ریکٹ، تصویروں کا ایک البم حتیٰ کہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کی 24 جلدیں بھی موجود تھیں۔

جیل میں کسی قیدی کے پاس یہ چیزیں موجود ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صرف یہی نہیں وہ جیل میں آزادی سے گھومتا پھرتا تھا۔ ٹینس بھی کھیلتا تھا اور اس دوران ایک قیدی گاڑے کے طور پر اس کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کسی بڑے افسر کی طرح شاہانہ انداز میں جیل میں گھومتا تھا۔

بعض قیدی دبی زبان میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ باہر وہ جرائم کی دنیا کا بادشاہ تھا، جیل میں آکر جیل کا بادشاہ بن گیا ہے۔

ظاہر ہے یہ سب کام پیسے کے زور پر ممکن ہوتے تھے اور الکھون نے رقم جیل میں منتقل کرنے کے طریقے ایجاد کر لئے تھے۔ وہ فراغ دل ہمیشہ سے تھا۔ چنانچہ اپنی جیب سے اکثر دہشتزدہ قیدیوں کو بھی چھوٹی موٹی ”عیاشیاں“ کراتا رہتا تھا۔ کبھی کسی قیدی کو مٹی کا ساگر پلا دیا۔ کبھی کسی قیدی کو اچھا کھانا کھلا دیا اور کبھی کسی قیدی کا کوئی مسئلہ حل کرنے کے لئے اسے نقد رقم دے دی۔

یہ سب باتیں ایف بی آئی کے علم میں آ رہی تھیں اور اس کے مختلف شعبوں کے درمیان اس سلسلے میں خط و کتابت ہونے لگی تھی۔ ایف بی آئی دوسرے محکموں سے بھی خط و کتابت کر رہی تھی۔ اس کے نزدیک جیل میں کرسی اسمگل کرنا سب سے سنگین مسئلہ تھا۔

اندرونی اندر یہ کچھڑی پکٹی رہی۔ وقت گزرتا رہا حتیٰ کہ الکھون کی سزا کے پانچ سال بیت گئے۔ اس وقت تک ایف بی آئی نے الکھون والے

کچھ سرکاری محکموں سے تبادلہ خیال کے بعد آخر کار ایک فیصلہ کر ہی لیا گیا۔ حکومت کو امید تھی کہ اس منصوبے پر عملدرآمد کر کے وہ الکھون کو صحیح معنوں میں قابو میں کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دراصل یکم اگست 1933ء کو اس وقت کے صدر روز ویلٹ کے انٹرنی جزل نے صدر کے ایک ایڈی کو کھڑا لکھا۔ ”کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ بعض طاقت ور بدعاش اور خطرناک قسم کے قیدیوں کو قابو میں کرنے کے لئے ایک خصوصی جیل تعمیر کی جائے۔ یہ جیل کسی انتہائی دور افتادہ جزیرے یا پھر الاسکا کے علاقے میں ہونی چاہئے جہاں ان قیدیوں کا بیرونی افراد سے کسی بھی طریقے سے کوئی رابطہ نہ ہو سکے؟“

یہ تجویز حکومت کو پسند آئی اور اس پر مزید چند دن محکمہ جاتی خط و کتابت ہوتی رہی۔ وزارت قانون نے اس تجویز جیل کے لئے جگہ بھی تلاش کر لی۔ جگہ کیا، وہ دراصل ایک قدیم اور کچھ تباہ شدہ ہی جیل ہی تھی جس کی مرمت کر کے اور اس میں مزید کچھ تعمیرات کر کے اسے مطلوبہ جیل کی شکل دی جاسکتی تھی۔

وہ سان فرانسسکو کے شمال میں خشکی کے ایک جزیرہ ٹاٹو سے پر واقع تھی۔ زمین کے اس ایک میل لمبے اور چوتھائی میل چوڑے ٹکڑے کے تین طرف پانی تھا جس میں تیز لہریں آتی تھیں۔ اس دور افتادہ جزیرہ ٹاٹو سے پہنچنے کا صرف ایک ہی تنگ سارا راستہ تھا جس کی گمرانی آسانی سے کی جاسکتی تھی۔

خشکی کے اس ٹکڑے کو 1775ء میں ہسپانوی جہازرانوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور اس کا نام ”بلگون کا جزیرہ“ رکھ دیا تھا کیونکہ وہاں بہت سے بگے نظر آ رہے تھے تاہم کسی نے اسے آباد کرنے کے لئے اس پر قدم نہیں رکھا۔ اب اسے مختصر الکا آئی لینڈ کہا جاتا تھا۔

چھری سلوں سے تعمیر شدہ جو عمارت اس پر موجود تھی، کسی زمانے میں وہ قلعہ اور فوجی قید خانے کے طور پر استعمال ہو چکی تھی۔ کچھ امریکی فوجی اس میں اب بھی موجود تھے لیکن وہ جلد ہی اسے خالی کرنے والے تھے۔ وزارت انصاف نے وہ عمارت فوج سے لے لی اور اس پر دو لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر خرچ کر کے اسے ایک ایسی باقاعدہ جیل کی شکل دے دی جس سے فرار ناممکن تھا۔ ویسے تو اس جزیرے سے ہی فرار بہت مشکل تھا۔

اس جیل میں کوٹھریوں کی موٹی موٹی دیواریں چھری چھری اور دروازے، کھڑکیاں، اسٹیل کی نہایت موٹی اور بھاری چادریوں کی تھیں۔ ان دروازوں میں الیکٹریک لاک تھے جنہیں واقع ناوڑ سے آپریٹ کیا جاتا تھا۔ واقع ناوڑ کی تعداد پانچ تھی۔

اس کا مین گیٹ کھولنے کے لئے دو افسرزمی موجودگی ضروری تھی جن میں سے ایک برقی نظام کو کنٹرول کرنے والے پینل پر بیٹھتا تھا۔ اس گیٹ کے عقب میں وہ آلات بھی لگے ہوئے تھے جو دھات کی اشیاء اور ہتھیار وغیرہ کے بارے میں خبردار کرتے تھے۔

19 جولائی 1934ء کو جیل خانہ جات کے جھمے نے اس جیل کا قبضہ لے لیا اور جیس جونس کو اس کا وارڈن مقرر کیا۔ جونس کی شہرت ایک انتہائی ایماندار جیلر کی تھی، وہ کئی جیلوں میں وارڈن کے طور پر خدمات انجام دے چکا تھا اور اس کا ریکارڈ نہایت عمدہ تھا، جیل کے جھمے میں آنے سے پہلے وہ ایک بینکار تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ بڑی سے بڑی رقم کی رشوت کی پیش کش بھی اسے دیانت داری اور فرض شناسی کے راستے سے ہٹے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

وہ قیدیوں کی اصلاح کا بھی قائل تھا لیکن الکا آئی لینڈ کی جیل میں اسے قیدیوں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ سخت ڈسپلن قائم کرنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔

ادھر جب اس جیل میں بھیجے کے لئے فیڈرل جیل سے 53 قیدیوں کے ساتھ الکھون کو بھی لایا جانے لگا تو وہ بری طرح اڑ گیا۔ وہ زور زور سے چیختے دھاڑنے لگا اور کئی گاڑے سے اُلٹھ پڑا۔ وہ چلا رہا تھا۔ ”میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“

لیکن اسے جانا پڑا۔ اس کی چیخ و پکار بے سوری۔ اس کے کپڑے اتار کر تلاشی لی گئی اور اسے دوسرے کپڑے دیئے گئے۔ حکومت اب ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ قیدیوں کو لے جانے کے لئے ایک ٹرین خاص طور پر جیل کے احاطے میں لائی گئی تھی۔ اس کی کھڑکیوں میں لوہے کی مسلاہیں اور ان کے اوپر خاردار تار لی گئی ہوئی تھیں۔

ٹرین کی لمبگوئی کے اندر گاڑے اپنی بند قیدیوں پر تانے بیٹھے تھے جبکہ قیدیوں کے پاؤں زنجیروں کے ذریعے ان کی سیٹوں کے پاؤں سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ ٹرین راستے میں کہیں نہیں رکی۔ سیدھی کھاڑی تک پہنچی۔ وہاں سے اسے تیرے ہوئے بڑے بڑے تختوں سے بے بہت بڑی پلیٹ فارم نما چڑ پر اتار دیا گیا۔

یوں ٹرین الکا آئی لینڈ کے کنارے سے جا گئی۔ انتہائی سخت حفاظتی انتظامات میں قیدیوں کو اس طرح اتارا گیا کہ ان کے ہاتھوں میں جھٹھریاں اور بیروں میں بیڑیاں تھیں۔ انہیں دو قطاروں میں جیل کی طرف لے جایا گیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی جب انہوں نے ڈوہتے سورج کی لمبھی روشنی میں بلندی پر اس جیل کا ہیولا دیکھا تو ان میں سے بعض قیدی اونچی آواز میں رونے لگے۔ بڑی سی اس پتھری جیل کا ہیولا واقعی بے حد خوفناک دکھائی دے رہا تھا، وہ جنوں، بھوتوں کا مسکن معلوم ہو رہی تھی۔ اوپر سے اس مختصر جزیرے کا ساٹنا بھی خوف زدہ کر دینے والا تھا۔

سب قیدی جیل پہنچے تو ایک بار پھر کپڑے اتار کر ان کی تلاشی لی گئی۔ انہیں نہانے کا موقع دیا گیا اور پھر جیل کی وردی پہنا کر کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا۔ وردی پر ان کے نمبر بھی کڑھے ہوئے تھے، الکھون قیدی نمبر 85 تھا۔

حکومت اور جونس نے مل کر اس بات کو یقینی بنالیا تھا کہ الکھون باہر سے کوئی معمولی سی بھی چیز منگوا سکے گا اور نہ ہی کچھ باہر بھیج سکے گا حتیٰ کہ اسے کوئی خاص خط یا پیغام بھی نہیں ملے گا۔ طے یہ پایا تھا کہ باہر سے آنے والے تمام خطوط منسور ہوں گے اور دوبارہ ٹائپ کر کے قیدیوں کو دیئے جائیں گے۔

اسی طرح قیدیوں کی طرف سے باہر جانے والے خطوط کو بھی منسور کیا جائے گا۔ قیدیوں کو دوطرفہ خبر و عافیت کی اطلاع کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، انہیں کتنی کے چند رسالے اور وہ بھی سات آٹھ ماہ پانے دیئے جائیں گے۔ قیدیوں کا کوئی ملاقاتی وہاں نہیں آ سکتا تھا۔

”میرے تو بہت سے دوست ہیں جو مجھ سے ملنے کے لئے آنا چاہیں گے۔“ الکھون نے وارڈن سے کہا۔

”کوئی تم سے ملنے نہیں آئے گا۔ مینی میں فلیپی کے صرف دو افراد ایک مرتبہ ملنے کے لئے آسکتے ہیں۔“ وارڈن جونس نے ٹھنڈی سانس لے کر اسے مطلع کیا۔

قیدیوں کو وہاں کھانے پینے کے معاملے میں کوئی خاص تکلیف نہیں تھی۔ جونس جیل کے کچھ مخصوص قواعد پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔

الکھون یہاں کا ”بادشاہ“ نہیں بن سکتا تھا۔ دیگر تمام قیدیوں کی طرح وہ بھی چھوٹی سی ایک کوٹھری میں تھا جو پانچ فٹ چوڑی اور نو فٹ لمبی تھی۔



باہر کی دنیا سے الگ ہونے کا رابطہ واقعی ناممکن ہو کر رہ گیا۔ حکومت نے آخر جرائم کی دنیا کے بادشاہ کو قایم کر لی لیا تھا۔ اس جیل کے لئے خاص طور پر بنے قاعدے اور قوانین منظور کئے گئے تھے۔ یہاں اچھے روئے کی بنیاد پر کسی قیدی کے ساتھ کوئی رعایت بھی نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی سزا میں کوئی کمی ہوتی تھی۔ الگ ہونے کو جو رعایتیں ملنا تھیں، وہ مل چکی تھیں۔



البتہ بعض غلطیوں پر یہاں قیدیوں کو کچھ سزائیں ملتی تھیں جن میں قید تنہائی بھی شامل تھی۔

ہر قیدی کے لئے کوئی نہ کوئی پڑشتت کام کرنا بھی لازمی تھا۔ الگ ہونے کے حصے میں لاٹری روم میں کام کرنا آیا۔ ایک بار قیدیوں نے بھوک ہڑتال کرنے اور نافرمانی کی مہم چلانے کی بھی کوشش کی، بعض مصلحتوں کی بنا پر الگ ہونے نے اس مہم میں قیدیوں کا ساتھ نہیں دیا جس پر بعض قیدی اس کے دشمن بھی ہو گئے۔

ایسے ہی ایک قیدی سے ایک بار الگ ہونے کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ ایک سابق فوجی تھا اور اپنے آفیسر کو قتل کرنے کے جرم میں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ وہ سخت مشتعل مزاج آدمی تھا۔ ادھر الگ ہونے کا حصہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ تو نسبتاً رہا کر گارڈز نے جلد ہی بیچ بچاؤ کر دیا اور نہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔

بہر حال ان تمام حالات و واقعات نے الگ ہونے کو یہاں دوسرے تمام قیدیوں کی طرح ایک بالکل عام ساقیدی بنا دیا تھا۔ رعب، وحشت اور سکرانی کا اس کا دور ایک سال میں ہی گویا بھولی برسی سی بات ہو کر رہ گیا تھا۔

انہی دنوں جیل میں ایک بار پھر ہڑتال اور ہنگاموں کی فوج آئے گی تھی۔ اس دوران مزید بہت سے قیدیوں کو وہاں منتقل کیا جا چکا تھا۔ انہی میں سے ایک قیدی کا انتقال ہو گیا۔ جیل کے عملے کے بیان کے مطابق وہ موبے سے مر رہا لیکن قیدیوں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ اس کا السر پھٹ گیا تھا اور ڈاکٹر نے اسے اسپتال منتقل کیا تھا اور نہ ہی صحیح معنوں میں طبی امداد فراہم کی تھی۔

جیل کے عملے اور خاص طور پر ڈاکٹر کے خلاف نعرے لگتے لگے۔ الگ ہونے اس وقت جیل کے دوسرے حصے میں تھا تاہم اس تک بھی اطلاع پہنچائی گئی اور اسے ہنگامے میں شریک ہونے کے لئے بھی کہا گیا۔

وہ خشک لہجے میں بولا۔ ”میں یہاں سے زندہ باہر جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی موت کو دعوت دیتا یا اپنی سزا کو مزید طویل نہیں کرنا چاہتا۔“

اس پر اس کے مخالف قیدی نے ایک بار پھر اس کے خلاف نفرت کا زہر پھیلانا شروع کر دیا تاہم الگ ہونے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموش رہا۔

ایک اور قیدی بھی جیل میں بڑا سخت جان اور بد معاش مشہور ہو چکا تھا۔ وہ ایک بار الگ ہونے کے پاس ایک منصوبہ لے کر آیا کہ اگر وہ کسی طرح چند ہزار ڈالر کا بندوق دست کر دے تو جیل میں مشین گنیں منگوانے کا بندوبست کیا جاسکتا ہے۔ باہر ایک موٹر بوٹ ان کا انتظار کر رہی ہوگی اور وہ مشین گنوں سے فائرنگ کرتے ہوئے اپنا راستہ بنا کر فرار ہو جائیں گے۔

الگ ہونے یہ سارا منصوبہ بن کر یوں دھج سے فٹس کر خاموش ہو گیا جیسے وہ منصوبہ اس کی نظر میں بچکانہ لطیفہ ہی تھا۔ منصوبہ لے کر آنے والے قیدی کا نام لوکس تھا۔ الگ ہونے کے رد عمل اور دکھائی کی وجہ سے لوکس بھی الگ ہونے کا دشمن ہو گیا۔

ایک بار الگ ہونے ایک جگہ فرش کی صفائی کر رہا تھا۔ وہاں سے کچھ دور جیل کے حجام کی دکان تھی۔ لوکس وہاں شیوہ خانے آیا تھا، الگ ہونے کی اس طرف پشت تھی۔ اسے لوکس کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ لوکس نے اسے بے خبر دیکھا تو حجام کی دکان سے فینچی اٹھا کر دبے قدموں آیا اور الگ ہونے کی پشت میں فینچی کھوپٹے کے لئے وار کیا۔

الگ ہونے کی خوش قسمتی تھی کہ حجام نے چیخ کر اسے خبردار کر دیا۔ الگ ہونے بروقت محوم گیا اور اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود کٹری کے دستے والی لمبی جھانڈا اس طرح لوکس کو سرید کی کہ وہ دور جا کر تاہم الگ ہونے کی کمر میں آدھا آنچ چوڑا اور چوٹائی انچ گھراڑم آئی گیا۔

گارڈز نے آکر جلدی سے صورت حال پر قابو پایا اور الگ ہونے کو جیل کے اسپتال لے جایا گیا۔ الگ ہونے خود اپنے جیروں پر چل کر وہاں گیا۔ اس کی کمر پر دو تین ٹانگے لگائے گئے۔

اسی طرح ایک بار ایک قیدی نے نوے کا باٹ الگ ہونے پر کھینچ مارا تھا۔ الگ ہونے جھکا کر دے کر کھینچ گیا تھا ورنہ شاید اس کی کھوپڑی ٹوٹ جاتی۔

ایک مرتبہ ایک اور قیدی نے اس پر حملہ کیا۔ الگ ہونے نے کھونسا مار کر اسے زمین چنادی۔

وقت وقت کی بات تھی۔ جس کی آنکھوں میں برہمی دیکھ کر بڑے بڑے بد معاش کانپ جاتے تھے، اب اس پر عام اور معمولی قسم کے قیدی حملے کر رہے تھے تاہم الگ ہونے بڑے صبر و سکون سے اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا تھا، وہ کسی کے سامنے گھونہ یا فریادیں نہ کرتا تھا۔

جن دنوں الگ ہونے لاٹری روم میں قیدیوں کے کپڑے دھو رہا تھا۔ ایک قیدی نے نہایت غریب سے انداز میں اپنی بیوی کے نام خط لکھا۔ ”تمہیں معلوم ہے آج کل میرے کپڑے کون دھو رہا ہے؟“

الگ ہونے.....

قد کاٹھ یا چسامت کے اعتبار سے وہ اب بھی بارعب تھا۔ اس کا وزن کم نہیں ہوا تھا اس لئے کم ہی قیدی اس سے الجھنے کا خیال دل میں لاتے تھے۔ وارڈن کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ حتی الامکان ایک اچھے قیدی کی طرح سر جھکا کر اپنا وقت پورا کر رہا تھا جو ان جیل کے ماحول میں کوئی آسان کام نہیں تھا۔

وہ اب ہوشیار رہنے لگا تھا۔ اپنے حصے کی مشقت کرتے وقت چونکا رہتا، چلتے پھرتے وقت کن اکھیں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا، وہاں کسی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

بعض قیدیوں کی نفسیاتی کیفیت بھی عجیب ہو چکی تھی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس کا دماغ الٹ جائے۔ ایک بار ایک قیدی بیٹھا ایک چارے سے پرانے نازک کٹ رہا تھا۔ ان نازوں کو کٹ کر نیوی کے کام آنے والے کچھ پیڑ بنائے جاتے تھے۔

پرانے نازک کٹنے کاٹنے چاہا ایک اس قیدی نے چارے سے اپنے ہاتھیں ہاتھ کی چار انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ یہ اس سے غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ دوسرے ہی لمحے اس نے چارے دوسرے قیدی کی طرف بڑھاتے ہوئے درخواست کی کہ اب وہ اس کے دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں بھی اسی طرح کاٹ دے۔ اس کے چہرے سے تکلیف کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

اسے اسپتال لے جایا گیا اور جب اس کے ذہن بھر گئے تو سزا کے طور پر اسے قید تنہائی میں بھی بھیجا گیا تاہم جیل انتظامیہ کے خیال میں وہ ابھی اتنا پاگل نہیں تھا کہ اسے پاگل خانے بھیجا جاتا چنانچہ وہ وہیں رہا۔

بعض قیدی فرار کی جو کوشش کرتے تھے، ان سے بھی ان کی ذہنی حالت ابتر ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ ان کی فرار کی کوششیں اس قدر بچکانہ اور احقانہ ہوتی تھیں کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی ان کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بار ایک قیدی ایک جگہ خاردار تاریں لگاتے لگاتے اچانک وہ تاریں ایک مسلح گارڈ کی آنکھوں میں گھسائے کی کوشش کرنے لگا شاید اس کا خیال تھا کہ وہ گارڈ کو اندھا کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ گارڈ نے اس کی یہ کوشش کا کام بنادی اور اسے خبردار کیا کہ وہ اپنی اس کوشش سے باز رہے مگر وہ باز نہ آیا۔

گارڈ نے اسے روکنے کے لئے اپنی دانست میں ایک موٹر کوشش کی۔ اس نے دو ہوائی فائر کے مگر قیدی پر جیسے دھن سوار کی کہ وہ اس کی آنکھوں میں خاردار تاریں گھونپ کر رہے گا۔ وہ بار بار اس پر پھینکا رہا۔ آخر کار گارڈ نے تیسرا فائر کیا جس نے قیدی کا کام تمام کر دیا۔

اسی طرح بعض قیدی کچھ ایسے احقانہ انداز میں خود کشی کی کوشش کرتے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا دماغ کم از کم وقتی طور پر الٹ گیا ہے۔ جیل کا ماحول اور ان قیدیوں کی یہ حرکتیں دوسرے قیدیوں کا بھی دماغ خراب کرنے کے لئے کافی تھیں۔ شاید اسی لئے گارڈز کا رویہ بھی قیدیوں کے ساتھ بہت سخت تھا۔ قیدی بہر حال خطرناک تھے۔ ذرا سا موقع ملے ہی وہ کوئی بھی خطرناک حرکت کر سکتے تھے شاید اسی لئے گارڈز ان کے ساتھ بے رحمی سے پیش آتے تھے۔

ایک بار تو ایک قیدی نے جو سن پر بھی حملہ کر دیا تھا اور اسے ڈی کر دیا تھا۔ ایک گارڈ نے اس کی کھوپڑی پر شدید غصے میں ڈنڈا سرید کیا جس کے بعد وہ قیدی ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا، اس کی حالت ذہنی طور پر معذور بچوں جیسی ہو گئی، وہ بولنا بھول گیا۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی، وہ بیٹھا بیٹھی پچھلی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا رہتا۔ اس کا منہ کھلا رہتا اور ہونٹوں کے گوشوں سے رال بہتی رہتی۔

ایک قیدی جو اس جیل میں صرف سولہ ماہ گزار کر گیا تھا۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ وہاں کی زندگی کیسی تھی تو وہ جھرجھری لے کر بولا۔ ”وہ جیل کی جہنم سے کم نہیں۔“

محقر اس جیل کو ”راک“ کہا جاتا تھا۔ ایک اور قیدی جو راک سے رہا ہو کر آیا تھا۔ اس سے الگ ہونے کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ وہاں کس طرح شب و روز گزار رہا ہے تو قیدی نے جواب دیا۔ ”وہ بالکل خاموش ہو گیا ہے، کسی سے کوئی بات نہیں کرتا، بس اس سے جو کام کہا جاتا ہے، وہ کر دیتا ہے، رات کو بھی وہ خاموش لینا چھت کو گھورتا رہتا ہے، پکلیں بھی نہیں جھپکاتا، شاید یاد کرتا رہتا ہے کہ باہر کی زندگی کتنی اچھی تھی۔ اسے تو بس لگتا ہوگا کہ وہ جنت سے جہنم میں پہنچ گیا ہے۔“

قیدی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ الگ ہونے کے اندر زبردست شکست و ریخت جاری تھی اور پھر ایک روز اس کے اعصاب جواب دے ہی گئے۔ وہ بھٹ پڑا۔ اس نے جو سن سے کہا کہ وہ اسٹیٹ انٹارنی کے آفس سے کسی کو بلائے۔ وہ اپنے برائے کام کا اعتراف کرنا چاہتا ہے اور عدالت میں اس نے جو بھی غلط بیانی کی ہیں، ان کی سچ کرنا چاہتا ہے۔

اسٹیٹ انٹارنی فوری طور پر اس کی پیشکش بوٹ کے ذریعے جیل پہنچا۔ تنہائی میں دو دن تک اس کی الگ ہونے سے ملاقاتیں جاری رہیں۔ الگ ہونے کے سینے پر جیسے بہت بڑا بوجھ تھا جسے وہ اتار چھیننا چاہتا تھا۔ اسٹیٹ انٹارنی کے اسسٹنٹ نے اس کا جو بیان قلمبند کیا، وہ چھاس صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں الگ ہونے نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے کس کس کو قتل کیا تھا اور گیس چوری کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی تھیں۔

ستم طریقے ہی تھے کہ اس وقت الگ ہونے کی سزا ختم ہونے میں صرف دو سال باقی رہ گئے تھے۔

اسٹٹ انٹارنی جب کاغذات لے کر وہاں پہنچا تو قانون اور انصاف کے کھمبوں میں نئے سرے سے الجھ چکے تھے۔ اس دوران الگ ہونے کی بیوی سے اس سے ماہانہ ملاقات کے لئے پہنچی تو اسے اس سے ملنے نہیں دیا گیا کیونکہ الگ ہونے کی طبیعت بہت خراب تھی۔ وہ انگلیاں کر رہا تھا اور اس پر جنون سا طاری تھا۔ وہ گارڈز کو مارنے کے لئے دوڑ رہا تھا۔

بڑی مشکل سے اسے اسپتال منتقل کیا گیا۔ اس کے بہت سے ٹیسٹ لئے گئے۔ ڈاکٹر کو شبہ تھا کہ اسے سفلس (آفتک) کا مرض لاحق ہے۔ اس کی کچھ علامات تو موجود تھیں لیکن ان میں دوسرے امراض کی علامات بھی گنہ گن تھیں۔

آخر کار الگ ہونے کی اپنی اجازت سے اس کی ریڈ کی ہڈی سے مواد لے کر اس کا تجزیہ کیا گیا تو ڈاکٹر کے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ اسے واقعی سفلس لاحق تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے اعصاب میں بھی زبردست توڑ پھوڑ جاری تھی۔

یہ مرض اسے بہت پہلے اس کی منظور نظر نوجوان یونانی لڑکی سے لگا تھا اور علاج کے بعد بھی محسوس ہوا تھا جیسے وہ صحت یاب ہو گیا ہو لیکن درحقیقت مرض دب گیا تھا۔ اب پہلے سے زیادہ شدت سے ابھر آیا تھا۔

الگ ہونے کا علاج تو شروع ہو گیا لیکن اس کی حالت میں کچھ زیادہ بہتری دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ کچھ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں گویا پاؤں گھینٹے ہوئے چلنے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ بالکل ٹکی اور پھٹی دکھائی دیتا اور کبھی گارڈز وغیرہ سے الجھ پڑتا لیکن کبھی کبھار وہ بالکل ٹھیک دکھائی دیتا۔

ادھر دکھا گویں اس کے اعتراف نامے کی بنیاد پر نئے مقدمے چلنے لگے تھے۔ مین ممکن تھا کہ ان مقدمات کی بنیاد پر اس کی تمام جائداد ضبط ہو جاتی اور اسے موت کی سزا ہو جاتی لیکن اس کے بھائی رالف نے قابل ترین وکیلوں کی مدد سے ان مقدمات کی عمدہ طریقے سے پیروی کی اور الگ ہونے کی جائداد کے علاوہ اسے سزائے موت سے بچانے میں بھی کامیاب رہا تاہم اسے بہت بڑی رقم جرمانوں کے طور پر دینی پڑی۔

دراصل اس کے وکیلوں نے یہ نکتہ پکڑ لیا کہ یہ بیان قلم بند کرتے وقت اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت سے وہ واقعی ماہر نفسیات کے زیر علاج تھا، یہ چیز اس کے کام آگئی۔ ماہرین نفسیات کی گواہی نے اسے بچایا۔

آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب اس کی سزا ختم ہو گئی۔ حکومت کے نمائندوں نے اسے نہایت رازدارانہ انداز میں اس کے مایا والے مکان تک پہنچایا کیونکہ رپورٹ اس کے خطر تھے اور اس سے نہ جانے کیا کیا پوچھنا چاہتے تھے۔ کچھ ایک سال کے دوران وہ اس قسم کی خبریں چھاپتے رہے تھے کہ الگ ہونے جیل میں پاگل ہو گیا ہے، اسے زنجیروں میں باندھ کر رکھا جا رہا ہے اور اس کی حالت خراب ہے۔

الگ ہونے کا علاج گھر پر بھی جاری رہا۔ پھسلین کی ایجاد کی وجہ سے سفلس کے مرض سے شفا یابی کی امید بہت بڑھ گئی تھی۔ الگ ہونے کا علاج بھی پھسلین کے ذریعے کیا جا رہا تھا جس سے اس کی حالت میں بہت بہتری آ گئی تھی پھر وہ وقت بھی آیا جب ڈاکٹر وں نے اسے صحت مند

ایجاد کے بعد سے شاید یہ دوا سب سے زیادہ مقدار میں الگ ہونے پر ہی استعمال ہوئی تھی۔

اس کی صحت بہت اچھی تو نہیں تھی، اسے اب بھی تشنگ کے سے دورے پڑتے تھے لیکن زیادہ تر وہ ٹھیک ہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ اب سمندر کے کنارے چھل قدمی کے لئے بھی جانے لگا تھا جہاں لوگ سر راہ اس سے مخاطب ہوتے تو وہ انہیں خوش خلقی سے جواب دیتا۔ کبھی کبھی اس کی یادداشت جواب دے جاتی۔

ڈاکٹر وں کا کہنا تھا کہ اس پر ایک ساتھ کئی بیماریاں حملہ آور ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک بیماری ایسی تھی جس میں اس کے اعصاب تباہ ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ شخص جسے اپنی اعصاب کا مالک سمجھا جاتا تھا، اب کبھی کبھی اچانک اس ننھے بچے کی طرح تھر تھکا پٹنے لگتا جس نے کوئی خوفناک چیز دیکھی ہو۔

وہ بہترین ڈاکٹر وں کے زیر علاج رہتا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹا بیماری کے دوران اس کے پاس ہی تھے۔ اس کی بیوی سے کا بھائی اور اس کی بیوی بھی اس کے مایا والے مکان میں کئی رو رہے تھے۔ اس کے کاروبار کا ایک بڑا حصہ اس کے برادر بھتی نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔

اس دوران اس کا بیٹا سنی کان میں اپنے آپ کو الگ ہونے کا بیٹا کہلانے پر شرماتے لگا۔ الگ ہونے کے لیے چوڑے خاندان میں شاید وہی اگلیا شخص تھا جسے خالص شریف اور باعزت انسان کہلانے کی تمنا تھی۔

یہ ترمال میں لئے وہ فرانس چلا گیا اور اس نے نوٹرے ڈیم کی ایک درسگاہ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں اس نے اپنی شناخت ذرا سی بدلنے اور چھپانے کی تدبیر کر لی تھی لیکن اس کی یہ تدبیر زیادہ کارگر نہ رہی۔ نوٹرے ڈیم میں بھی لوگ کچھ عرصے بعد جان گئے کہ وہ درحقیقت کون ہے اور کس کا بیٹا ہے تب وہ واپس آ گیا۔

اطالویوں کی روایات کے مطابق اس نے بھی جلدی شادی کر لی۔ اس وقت اس کی عمر بائیس سال تھی۔ شادی کے بعد وہ الگ گھر میں رہنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تین بچیوں کا باپ بن گیا۔ الگ ہونے کو کہ لاغر ہو چکا تھا لیکن وہ ٹھیک ہوا بیٹے کے گھر آ جاتا اور ورنہ اپنی پوتیوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اپنی پوتیوں کے ساتھ کھیل کر وہ بہت خوش ہوتا۔

اس کی جسمانی حالت میں اتار چڑھاؤ آثار نہ تھا۔ کبھی وہ چلتا پھرتا دکھائی دیتا۔ کبھی بستر پر گر جاتا۔ کبھی صحت کچھ بہتر دکھائی دینے لگتی۔ کبھی بالکل لاغر ہو جاتا۔

اختیاری رپورٹ اب بھی اس کے پاس آتے رہتے تھے لیکن وہ ان سے کوئی خاص بات نہ کرتا۔ اگر کوئی رپورٹر کہتا۔ ”آپ نے ایک ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے، اس کے بارے میں کچھ تو بتائیے۔“ تو وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔

کوئی اس سوال پر زیادہ اصرار کرتا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتا۔ ”ہنگامہ خیز زندگی.....؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تم کیا جانتا چاہتے ہو؟“

”آپ کا بچپاس صفحات پر مشتمل ایک بیان منظر عام پر آیا تھا، اس میں تو آپ نے بہت کچھ کہا تھا؟“ رپورٹر کہتا۔

”بیان.....؟ کیسا بیان؟ میں نے تو کوئی بیان نہیں دیا۔“ وہ معصومیت سے کہتا۔

رپورٹر سر کھپاتا رہ جاتا اور الگ ہونے کے تاثرات سے کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ دل ہی دل میں اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

اس کی صحت اور شکل صورت چونکہ اب اچھی نہیں رہی تھی شاید اس لئے اب وہ اپنی تصویر کھینچانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی رپورٹر یا فوٹو گرافر اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا تو اس کا پرانا غصہ عود کرتا۔

”اگر کسی نے میری تصویر کھینچنے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔“ وہ غیظ و غضب سے دھاڑتے ہوئے کہتا۔ اس وقت اس کی شخصیت میں اسی الگ ہونے کی ٹھٹھک دکھائی دینے لگتی جس سے کبھی نہ جانے کتنے لوگ ڈرتے تھے۔

کسی زمانے میں اسے اپنے لباس اور چلنے کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اسے نہایت خوش لباس لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا لیکن اب اسے لباس کی کوئی خاص فکر نہیں رہی تھی۔ اکثر وہ جنن آلوو سلپنگ سوٹ اور چپلوں میں گھر سے نکل جاتا اور سمندر کے کنارے چھل قدمی کے لئے بھی اسی چلے میں چلا جاتا۔ اس کے کئی بڑے بچے بھی اسے کہیں نہ کہیں اس چلے میں دیکھ چکے تھے۔

ایک بار پھر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ پھسلین بھی اس کے لئے صحیح طور پر شفا بخش ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ جب بھی بستر پر گرتا، اس کے بارے میں افواہیں اڑنے لگتیں کہ وہ قریب المرگ ہے لیکن وہ پھر اٹھ کھڑا ہوتا اور زندگی کے راستے پر گھسٹے لگتا۔ اس کی ذہنی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔

ایک بار اس کے ڈاکٹر نے پیشگوئی کی۔ ”مجھے اندیشہ ہے اس کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ لوگ اسے دیکھ کر اس پر ترس کھایا کریں گے۔“

اب بھی دکھا گویں کسی گروہ کا کوئی خاص آدمی قتل ہوتا تو بہت سے لوگ کہتے۔ ”اسے الگ ہونے نے مروایا ہے۔“

الگ ہونے کا ڈاکٹر یہ سن کر متاسفانہ انداز میں سر ہلاتا اور کہتا۔ ”وہ کسی کو کیا مروائے گا، اس کی توانائی زندگی اس وقت قابل رحم ہے، اس کی ذہنی حالت بارہ سال کے بچے جیسی ہے، اسے تو اب صحیح طور پر معلوم بھی نہیں ہے کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔“

اس وقت الگ ہونے کی عمر 48 سال سے صرف چار دن ہی اوپر ہوئی تھی جب صحیح چار بجے اسے عجیب سا دورہ پڑا کچھ عرصہ کوما میں چلا گیا۔ اسپتال کے بہترین ڈاکٹر اسے طبی امداد دینے کے لئے دوڑ پڑے۔ پہلے اسے گھر پر ہی طبی امداد دی گئی پھر اسپتال لایا گیا۔

وہ آٹھ گھنٹے کوما میں رہا لیکن پھر اسے ہوش آ گیا اور رفتہ رفتہ اس کی حالت بہتر ہونے لگی لیکن ڈاکٹر وں کا کہنا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اس پر جو دورہ پڑا تھا، ابھی ڈاکٹر اس کی نوعیت ہی جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس میں نمونے کی علامات نمودار ہونے لگیں۔ جلد جانت ہو گیا کہ وہ نمونے میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس دوران اس کی بیوی سے اور اس کا بیٹا اس کی بیڈ کے پاس سے نہیں بچے تھے۔

رات تک ایسا دکھائی دینے لگا جیسے اس کا نمونہ بگڑ گیا تھا پھر رات کے ساڑھے سات بجے اس کی نبض ساکت ہو گئی۔ اس روز جنوری کی 25 تاریخ تھی اور سن 1947ء تھا۔ ڈاکٹر وں کا خیال تھا کہ نمونے کے باعث اس کی موت واقع ہوئی ہے لیکن مزید چیک اپ وغیرہ کے بعد پتہ چلا کہ وہ حرکت قلب بند ہونے سے مرا تھا۔ اسے اتنی بہت سی بیماریاں لاحق ہوئیں لیکن وہ دل کا مریض کبھی نہیں رہا تھا اس کے باوجود حرکت قلب بند ہونا اس کی موت کا سبب بنا۔

ان گنت لافانی انسانوں کی طرح اسے بھی ایک قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس قبرستان کو ”ماؤنٹ کارل“ کہا جاتا تھا۔ اس کی قبر کے سر ہالے آٹھ فٹ اونچا ماربل کا کتبہ نصب کیا گیا جس پر اس کے آباء اجداد کے ناموں کے بعد آخر میں اس کا نام درج تھا۔ اس کی پیدائش کا سن 1899ء اور وفات کا 1947ء تھا۔

چند ماہ بعد آوارہ گردوں نے اس کی قبر کا یہ اونچا کتبہ گرا دیا۔ اس کی بیوی اور بیٹے نے اسے دوبارہ نصب کر لیا۔ یہ عمل کئی بار دہرایا گیا پھر جب آنے والے برسوں میں اس کا بھائی، بیوی اور بہن مر گئی تو اس کی قبر بے نشان ہونے لگی۔ یکے بعد دیگرے اس کے گروہ کے خاص لوگ بھی قتل ہو گئے یا جیل چلے گئے۔ آخر کار گروہ کا اثر بالکل ہی کھم گیا۔

یہ سب باتیں اب قصہ پارینہ ہو چکی ہیں۔ الگ ہونے کی داستان پرانی ہو چکی ہے مگر امر کی تاریخ سے الگ ہونے کا نام کبھی مٹ نہیں سکے گا۔ یہ بات دوسری ہے کہ اسے تاریخ کے کون سے صفحات پر جگہ ملی ہے۔

لیکن اس کا نام اور اس کی داستان حیات، بہر حال امر کی تاریخ کا حصہ ہے۔ اس پر کتابیں لکھی گئیں۔ فلمیں بنیں۔ ٹی وی سیریلز چلیں۔ لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے وہ خود اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔

(ختم شد)